خوف

ایم اے راحت

پہلی قسط

چوہدری سردار علی تین ماہ اسپتال میں رہ کر آئے تھے بہت لاغر ہوگئے تھے، حالانکہ اسپتال کو بھی ان کی جاگیر بنا دیا گیا تھا، بڑے سے بڑے ڈاکٹروں نے ان کا علاج کیا تھا۔ پورے اسٹاف نے ان کی تیمارداری کی تھی، گھر کے لوگ الگ باقاعدہ ڈیوٹیاں دیا کرتے تھے۔ چوہدری صاحب کے شاندار کمرے کے علاوہ ان کے کمرے کے دونوں طرف دو کمرے اور حاصل کئے گئے تھے جو گھر کے تیمارداروں کے لئے تھے۔ تین مہینے اس شان سے بیمار رہے تھے، اسپتال سے ڈسچارج ہوئے تو اسپتال کا عملہ افسردہ ہوگیا۔ ایسے دریا دل مریض بار بار کہاں آتے ہیں۔

گھر آئے تو بڑا جشن منایا گیا۔ دونوں بیٹوں کے سسرال والے، بیٹی کے ہونے والے سسرالی اور دوسرے ملنے والے غسل صحت میں شریک ہوئے تھے۔ ایسے "فائیو اسٹار" غسل صحت کہاں منائے جاتے ہیں۔ خاص طور سے اس دور میں جہاں غسل صحت تو خیر ممکن ہی نہیں، غسل میت بھی مشکل ہوجاتے ہیں۔ بہرحال چوہدری صاحب کے لئے دنیا کا ہر کام آسان تھا، کوئی پندرہ بیس دن تک بہوئیں، بیٹے، بیٹی اور بیوی سب خدمت کرتے رہے اور چوہدری صاحب کے بدن کا گوشت واپس آنا شروع ہوگیا۔ خاصی بہتر حالت ہوئی تو انہوں نے بڑے بیٹے حیدر علی سے کہا۔ "اوئے حیدر خان، یار مجھے گڑھی حیدر بیگ نہیں لے جائے گا، تم لوگوں سے تو مل لیا، تمہیں معلوم ہے کہ میری زمینیں کس طرح میرا راستہ تک رہی ہوں گی اور بچپن سے جب آنکھ کھولی ان زمینوں سے میرا گہرا رشتہ رہا ہے، رشتے داروں کا انتظار تو ہوتا ہی ہے، چلو یار گڑھی حیدر بیگ چلتے ہیں۔"

"جی ابا جی جیسا آپ کا حکم۔" حیدر علی نے کہا اور اس کے بعد تیاریاں شروع ہوگئیں۔

دو جیپیں بھرلی گئی تھیں، آگے کی بڑی جیپ میں سردار علی کے لئے بندوبست کیا گیا تھا، پیچھے نوکر چاکر اور دوسرے لوگ تھے، چھوٹا بیٹا کسی کام سے شہر چلا گیا تھا۔ شاد پور کی حویلی سے دونوں جیپیں باہر نکلیں اور گڑھی حیدر بیگ کی جانب چل پڑیں جو تقریباً 80 کلومیٹر کے فاصلے پر تھی، ساری زمینیں گڑھی حیدر بیگ میں ہی تھیں۔ شاد پور میں باپ دادا کی بنائی ہوئی حویلی تھی جو دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھتی تھی۔ آدھی حویلی قدیم طرز تعمیر کا نمونہ اور آدھی جدید کا۔ دونوں بیٹے حیدر علی اور صفدر علی شہر میں کاروبار کرتے تھے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے اور بھی لوگ موجود تھے، بہت سے حاشیہ بردار جن کا گھر ہی چوہدری سردار علی کے بل پر چلتا تھا، بہرطور جیپوں نے 80 کلومیٹر کا یہ فاصلہ طے کیا اور اس کے بعد چوہدری سردار علی اپنی زمینوں پر پہنچ گئے، لیکن زمینیں دیکھ کر ان کی آنکھوں کے روشن ستارے مدھم پڑ گئے تھے۔

"اوئے حیدر علی! کیا ہوگیا ہے ہماری ان زمینوں کو، تم دیکھ رہے ہو یہ رنگ ہے فصلوں کا، جان ہی نہیں ہے، کیا خیال ہے ہاریوں کو بدل دیں؟"

"چار مرتبہ بدل چکے ہیں ابا جی، ہاری بدلنے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہ زمینیں بوڑھی ہوگئی ہیں۔"

"اوئے بوڑھی ہوگئی ہیں تو کیا خیال ہے، انہیں بنجر کر دیا جائے، چھوڑ دیا جائے انہیں۔ یار زمینیں بنائی پڑتی ہیں، ہمیں کوئی زمینیں بنانے والا نہیں ملا۔"

"جی ابا جی، آپ حکم کریں جیسا آپ کہیں ویسا کیا جائے۔"

"او یار، میرا خیال ہے اب کے ادھر باغ لگوا دیا جائے۔" چوہدری سردار علی نے کہا۔

"ابا جی، باغ تیار ہونے میں تو بڑا وقت لگتا ہے، پہلے بھی کئی بار اس بارے میں سوچا گیا لیکن پھر آپ ہی نے ارادہ ملتوی کر دیا۔"

"اوئے چلو، جیپ آگے بڑھاؤ۔" چوہدری سردار علی نے افسردگی سے کہا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔ ایک سرا طے ہوا۔ دوسرے سرے پر پہنچے تو الٹے ہاتھ پر کھیت لہلہاتے نظر آئے، فصل اتنی خوبصورت، اتنی جاندار اتنی عالیشان کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔

"روک اوئے روک۔" چوہدری صاحب نے کہا اور اس فصل کو دیکھنے لگے۔ پھر بولے۔ "یہ نظام دین کی زمین ہے نا۔"

"ہاں ابا جی۔" حیدر علی نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

"اوئے یہ کیا جادو کرتا ہے، اپنی زمینوں پر۔ ہماری زمینوں کو تو جیسے پالا مار گیا ہے، منہ چڑا رہی ہیں ہمارا۔ ہماری زمینیں، ان زمینوں سے زیادہ عمر کی نہیں ہیں لیکن جب بھی ادھر سے گزرو دل خون ہوجاتا ہے۔ کہاں یہ فصل جسے دیکھ کر آنکھوں میں تراوٹ اترے اور کہاں ہماری سوکھی مرجھائی ہوئی فصل۔ ویسے ایک بات کہوں، یہ زمینیں ہماری ہونی چاہئے ہیں۔"

"کیسے ابا جی؟"

"اوئے یہ میں بتاؤں گا کیسے، کیا سمجھا تو؟"

"ٹھیک ہے ابا جی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو نظام دین کا بیٹا احمد دین اور اس کی بیٹی جمیلہ بیگم زرعی یونیورسٹی لاہور میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ نئی نئی باتیں لے کر آتے ہیں اور زمینوں پر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ ابا جی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے جبکہ ہمیں آپ نے کاروبار میں لگا دیا ہے۔"

"اوئے زیادہ باتیں مت بنایا کرو میرے سامنے، ہر بندہ زرعی یونیورسٹی میں تعلیم تو نہیں حاصل کرتا، اوئے دوسرے بہت سے معاملات بھی ہوا کرتے ہیں، چلو، دل جل کر کباب ہوگیا ہے، ڈیرے پر چلو۔"

ڈیرہ چوہدری سردار علی کی ایک اور رہائش گاہ تھی جو یہیں گڑھی حیدر بیگ میں بنائی گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے چھوٹا سا فارم ہاؤس بھی تھا۔ چوہدری صاحب کبھی کبھی یہاں آجایا کرتے تھے، اب تو خیر سال ڈیڑھ سال ہوچکا تھا مگر ڈیرے کی دیکھ بھال کے لئے چند ملازمین مسلسل رہا کرتے تھے۔

دونوں جیپیں ڈیرے میں داخل ہوگئیں تو چوہدری صاحب نے کہا۔

"چلو بھئی کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ یہ جمال دین کدھر ہے، ہماری آمد کی خبر سن کر بھی نہیں آیا، جاؤ ذرا معلوم کرو اور اسے اس کے گھر سے پکڑ کر لاؤ۔"

جمال دین تھوڑی سی زمین کا مالک تھا جس پر وہ ترکاریاں اگا کر شہر لے جا کر بیچتا تھا، چوہدری صاحب کے وفاداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا، دو آدمی جمال دین کی تلاش میں نکل گئے اور کچھ دیر کے بعد جمال دین آگیا۔

"سلام چوہدری صاحب۔"

"او کدھر مر گیا تھا، تجھے بتایا نہیں گیا تھا کہ ہم آرہے ہیں؟"

"کس نے بتایا چوہدری جی جمال دین کو پتہ چلتا کہ آپ آرہے ہیں اور جمال دین آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے موجود نہ ہوتا، ایسا بھی ہوسکتا ہے چوہدری صاحب مجھے پتہ ہی نہیں چلا اور پھر میں تو منڈی گیا تھا گوبھی لے کر۔"

"اور کیسی چل رہی ہے تیری گاڑی؟"

"چوہدری صاحب کی محبت، چھ دفعہ اسپتال گیا، خیر خیریت معلوم کرتا رہا تھا، بس ایک دفعہ آپ سے ملنے کا موقع ملا۔"

"ہاں بھئی وہاں ڈاکٹر وغیرہ کسی آدمی کو مجھ سے ملنے نہیں دیتے تھے، کہتے تھے مریض پریشانی کا شکار ہوگا۔"

"کیسی طبیعت ہے اب چوہدری صاحب؟"

"ٹھیک ہوں، تجھ سے ایک کام ہے ذرا علیحدگی میں۔"

جمال دین چوہدری سردار علی کے پاس چارپائی پر آ بیٹھا اور ان کے پاؤں دبانے لگا۔

"او میری بات سن۔ جب بھی یہاں آتا ہوں نظام دین کی فصل دیکھ کر کلیجہ خون ہوجاتا ہے، یار دونوں زمینیں ساتھ ساتھ ہی ہیں لیکن ہماری زمینوں کو دیکھ اور اس کی زمینوں کو دیکھ۔"

"جی، دل تو میرا بھی بڑا خراب ہوتا ہے چوہدری صاحب لیکن کیا کیا جائے۔"

"ایک بات بتا، کوئی جادو ٹونہ تو نہیں کرایا گیا ہے ہماری زمینوں پر، تجھے پتہ ہے ایسے کام ہوتے رہتے ہیں؟"

"چوہدری صاحب اگر ایسا ہے تو کسی سیانے کو پکڑ لائیں گے۔ دکھا لیتے ہیں زمینیں، اول تو ایسا کوئی کر نہیں سکتا لیکن اگر کسی نے ایسا کیا ہے چوہدری صاحب تو پھر ہر جادو کا توڑ تو ہوتا ہے نا۔" جمال دین شیطنت سے مسکرایا۔

"اوئے تجھ سے بڑا سیانا اور کون ہوسکتا ہے جمال دین، کسی سیانے کو تو بعد میں لے کر آنا پہلے ایک کام کر۔"

"جی چوہدری صاحب حکم کریں۔"

"یہ زمینیں ہمارے پاس ہونی چاہئیں۔"

"کونسی چوہدری صاحب؟"

"او گدھے، نظام دین کی زمینوں کی بات کر رہا ہوں۔"

جمال دین گہری نگاہوں سے چوہدری سردار علی کا جائزہ لینے لگا۔ پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "بات میری سمجھ میں نہیں آئی چوہدری صاحب۔"

"رقم لگا دے ان زمینوں کی، نظام دین کو پٹی پڑھا کہ زمینیں بیچ دے۔ ہرے باغ دکھا اسے۔"

"مشکل ہوگی چوہدری صاحب۔"

"کیوں اوئے؟"

"بس چوہدری صاحب عجیب لگے گا۔"

"اچھا پھر تو اسے ڈیرے پر لے آ میں خود بات کروں گا۔"

"یہ میں کرلوں گا چوہدری صاحب۔" جمال دین نے کہا۔

☆......☆......☆

نظام دین خوشی خوشی چوہدری سردار علی کے ڈیرے پر پہنچا تھا۔

"پتہ ہی نہیں تھا چوہدری صاحب کہ آپ آرہے ہیں گڑھی حیدر بیگ کے سرے پر کھڑے ہوکر آپ کا استقبال کرتا۔"

"محبت ہے تیری نظام دین، نئی زندگی مل گئی ہے، ورنہ کبھی کبھی تو اسپتال میں پڑے پڑے سوچتے تھے کہ یار پتہ نہیں دوبارہ گھر واپس جانا نصیب ہوگا یا نہیں۔"

"اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے چوہدری صاحب، آپ کا دم بڑا غنیمت ہے جی، اب طبیعت ٹھیک ہے۔"

"ہاں یار، اصل میں ایک خرابی ہمارے اندر بچپن ہی سے ہے، ہر چیز کو دیکھ کر حسد کرتے ہیں، اماں کہتی تھیں کہ بیٹا حاسد کی بخشش نہیں ہوتی، پر بری عادتیں تو بری عادتیں ہی ہوتی ہیں، ہم بدل نہیں سکے...... سچی بات بتائیں جب بھی گڑھی حیدر بخش اپنی زمینوں کو دیکھنے آتے ہیں کلیجہ خون ہوجاتا ہے۔"

"کیوں چوہدری صاحب؟" نظام دین نے سادگی سے پوچھا۔

"اپنی زمینیں دیکھتے ہیں اور اس کے بعد تیری زمینیں، تو نے خود دیکھا ہوگا، ہماری زمینوں پر فصل ہی نہیں ہوتی۔"

نظام دین نے گردن جھکالی، کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "چوہدری صاحب سچی بات کہوں، میں ان زمینوں کو اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہوں، میرے بچے نئی نئی باتیں سن کر آتے ہیں، یہاں محنت کرتے ہیں اور جو کچھ سیکھ کر آتے ہیں وہ ان پر صرف کرتے ہیں، چوہدری صاحب میں ایک کھلے دل والا بندہ ہوں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ دل ڈرتا ہے، ورنہ آپ کی زمینوں کو بھی میں اپنی ہی زمینیں سمجھتا ہوں۔"

"اوئے، نظام دین نہیں، ایسی بات مت کر یار، میری زمینیں میری ہی رہنے دے، البتہ تجھ سے ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جو تیرے فائدے کی ہے۔"

"حکم کریں چوہدری صاحب۔" نظام دین کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔

"یار اپنی زمینیں مجھے دے دے، میری زمینوں میں تھوڑا سا اضافہ ہوجائے گا، اچھا لگے گا اور اچھی زمینیں تو ویسے بھی پیاری لگتی ہیں، میں شوقین ہوں تو جانتا ہے۔"

"چوہدری صاحب، گھر بلا کر ایسے گالیاں دی جاتی ہیں کسی کو، میں تو بڑی خوشی خوشی آپ کو صحت کی مبارکباد دینے آیا تھا، آپ نے مجھے اپنے گھر کے دروازے پر بٹھا کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔"

"گالیاں۔" چوہدری صاحب حیرانی سے بولے۔

"جی چوہدری سردار علی صاحب۔ ابھی میں نے آپ سے ایک جملہ کہا کہ آپ کی زمینیں بھی میری اپنی ہیں تو آپ نے فوراً ہی مجھے روک دیا اور کہا کہ اپنی چیز اپنی ہی ہوتی ہے، میں نے آپ سے کہا کہ میں اپنی زمینوں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہوں تو آپ نے ان کے سودے کی بات شروع کر دی۔"

"او یار، تو بھی بیوقوف، میں بھی بیوقوف، جذباتی باتوں میں کچھ نہیں رکھا، پیسے دوں گا تجھے ان زمینوں کے۔"

"بس چوہدری صاحب، دوستی ختم، آگے کچھ نہیں ہوگا لیکن اس شکل میں کہ آپ آگے کچھ نہ کہیں۔"

"کیا مطلب، دھمکی دے رہا ہے تو ہمیں، او میاں میری بات سن، ان تھوڑی سی زمینوں سے کیا کمائے گا تو یار...... ٹھیک ہے فصل بہت اچھی ہوتی ہے تیری، ہمیشہ ہی اچھی ہوتی ہے۔ پر تو ہمیں دیکھ، ہم زمینوں پر ہی بھروسہ نہیں کرتے، ہمارے بیٹوں نے شہر میں کاروبار بھی کر رکھے ہیں، آج کل کے چھوٹے زمیندار زمینیں بیچ بیچ کر مل اور فیکٹریاں لگا رہے ہیں، ایسے کئی بندے ہمارے علم میں ہیں جنہوں نے اپنی زمینیں بیچ دیں، تجھے نانا بابا یاد نہیں ہے۔ اس کی زمینیں تیری زمینوں سے زیادہ تھیں، بیچ باچ کر شہر چلا گیا۔ جوتوں کی فیکٹری لگائی ہے اس نے اور آج تو دیکھ کیا کھا کما رہا ہے۔"

"چوہدری صاحب اجازت چاہتا ہوں۔"

"ایسے نہیں...... میری بات سن...... یار دیکھ زمینیں تو ہمیں دے ہی دے، ورنہ مسئلہ بن جائے گا اور تو جانتا ہے کہ جس چیز پر ہمارا دل آجائے وہ ہماری ہو ہی جاتی ہے کسی نہ کسی طرح۔ بیکار مشکلوں میں کیوں پڑتا ہے تو۔ ہم جب بھی ادھر سے گزرتے ہیں تیری زمینوں کو دیکھ کر بیمار پڑ جاتے ہیں تو نہیں جانتا کہ ہمارے دل کو کیا ہوجاتا ہے۔"

"اللہ حافظ بھی نہیں کہوں گا اب آپ کو کیونکہ آپ نے ڈیرے پر بلا کر مجھ سے اچھی باتیں نہیں کیں، چوہدری صاحب۔" نظام دین نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا ڈیرے سے باہر نکل گیا۔

چوہدری سردار علی خاں کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ بہت بری بات ہے، اچھا جمال خاں تو کہاں مر گیا رے، ادھر بیٹھ، رجب شاہ آج کل کہاں ہے؟"

"لو چوہدری صاحب چار دن ہی تو ہوئے ہیں جیل سے چھوٹ کر آیا ہے اور گاؤں والے اس کے آنے سے پریشان ہوگئے ہیں۔"

"رات کو ہمارے پاس لے آنا۔" چوہدری سردار علی نے کہا اور پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا، اس کے چہرے پر جرم کے سائے لرز رہے تھے۔

☆......☆......☆

"کیا بات ہے چوہدری صاحب نیند نہیں آرہی؟" شریفاں نے نظام دین کو پلنگ پر بیٹھے دیکھ کر کہا۔ وہ سو گئی تھی، رات کا دوسرا پہر تھا کہ آنکھ کھلی تو شوہر کو پلنگ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ نظام دین مست نیند سونے کا عادی تھا لیکن آج وہ بے چینی سے بیٹھا ہوا تھا، شریفاں اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔

"نیند نہیں آرہی پانی پلاؤں؟"

"ہاں پلا دو۔" نظام دین نے کہا اور شریفاں گلاس میں پانی لے آئی۔ نظام دین نے پانی پینے کے بعد گلاس واپس کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ پریشانی ہوگئی ہے تھوڑی سی، اصل میں بات یہ ہے شریفاں کہ شریف آدمی تو اپنی عزت سے ڈرتا ہے اور رذیل سمجھتا ہے کہ وہ اس سے ڈر گیا۔"

"ہوا کیا؟"

"سردار علی اپنے ڈیرے پر آیا ہوا ہے، ویسے بھی تجھے پتہ ہے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کس کس کو نقصان پہنچا چکا ہے، بس اللہ میاں رسی دراز کرتا ہے تو کرتا چلا جاتا ہے۔ تجھے پتہ ہے سردار علی اور اس کے بیٹے اچھے لوگ نہیں ہیں حالانکہ وہ ہماری بستی میں نہیں رہتے لیکن دو تین بندوں کو انہوں نے جس طرح نقصان پہنچایا ہے سب کے علم میں ہے، کوئی بھی انہیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا سوائے برے لوگوں کے جن سے اس کی دوستی ہے۔"

"کوئی بات ہوگئی؟"

"ہاں، کمینہ کہہ رہا تھا کہ ہم اپنی زمین اس کے ہاتھ بیچ دیں۔"

"بیچ دیں، کیوں، کوئی زبردستی ہے ہم کسی چیز کو نہ بیچنا چاہیں دوسرا کہے کہ بیچ دیں۔"

"زبردستی ہی تو ہے شریفاں، کوئی شریف بندہ ہو تو بندے کو فکر نہ ہو لیکن یہ آدمی بہت برا ہے، مجھ سے کہہ رہا تھا زمینیں بیچ دیں انداز دھمکی دینے والا ہی تھا۔ کہنے لگا شہر میں فیکٹری لگا لو، بھئی میری مرضی ہے، میں جو چاہے کروں، کوئی اس سے مانگنے تو نہیں جاتا۔"

"تو ڈانٹ کر منع کر دیا ہوتا۔"

"بس میں صبح کو احمد دین کو بلائے لیتا ہوں۔ اس سے مشورہ کروں گا کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کوئی دقت نہ ہو، ادھر اس کا بچہ بھی آج کل اسے بہت یاد کر رہا ہے اور بیچاری بہو بھی پریشان ہے، حالانکہ میں نے کہا ہے کہ احمد دین بس پڑھائی لکھائی ختم کر بیٹا، واپس آجا زمینیں دیکھ، تیری بیوی اور بچہ تیرے لئے اداس رہتے ہیں۔ نور دین کی شکل دیکھو، کبھی کبھی مجھے اداس نظر آتا ہے۔ ڈھائی سال عمر ہوگئی ہے اس کی۔"

"ڈھائی سال کہاں چوہدری صاحب تین سال کا۔" دادی نے بڑے پیار سے پوتے کے بارے میں کہا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں، تین سال کا بچہ باپ کی غیر موجودگی سے خوش تو نہیں ہوتا ہوگا، باپ کی گود میں کتنا خوش ہوتا ہے؟"

"وہ تو ہے۔"

"پھر کیا کریں؟"

"تم ان دونوں کو ہی واپس بلالو، جمیلہ بھی کیا کرے گی آگے پڑھ کر، اس کے لئے بھی رشتے دیکھتے ہیں بلکہ رشتے والوں سے کہتے ہیں کہ اس کا رشتہ لگائیں۔"

دوسری صبح نظام دین نے گاؤں سے باہر جا کر ایک دوسرے گاؤں کے قریب جہاں موبائل بوسٹر لگے ہوئے تھے۔ احمد دین کو فون کیا تو احمد دین نے فون اٹھایا اور بولا۔ "خیر تو ہے بابا جی، ابھی ہفتے بھر پہلے ہی تو گاؤں سے آیا ہوں، کوئی بات ہے تو بتایئے، اللہ نے سب خیر رکھی ہے نا؟"

"او سب خیر رکھی ہے احمد دین، یہاں تیری ضرورت پڑ گئی ہے آجا تھوڑے وقت کے لئے۔"

"بات بتا دیں بابا جی، مجھے پریشانی ہوگئی ہے۔"

"ارے نہیں بیٹا پریشانی کی کوئی بات نہیں، اللہ کا فضل ہے سب خیر ہے، بس ایک بہت ضروری مشورہ کرنا ہے تجھ سے، ٹالنے والی بات نہیں ہے، جلدی آجا۔"

"ٹھیک ہے بابا جی مگر ایک آدھ دن تو لگ ہی جائے گا، کل بات کرلیتا ہوں اصل میں......"

"اصل نقل کچھ نہیں، ٹھیک ہے کل بات کرلے پرسوں تک آجا، میں تیرا انتظار کر رہا ہوں اللہ حافظ، ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ایک ایک بندہ خیریت سے ہے، تیرا نور دین بھی صحیح ہے اور میری بہو حسینہ بیگم بھی صحیح ہے، تیری ماں شریفاں بھی ٹھیک ہے اور میں بھی ٹھیک ہوں، کیا سمجھا؟"

"میں آرہا ہوں بابا جی آپ فکرمند نہ ہوں۔"

لیکن فکر کی بات تو تھی، جمال دین دوبارہ نظام دین کے پاس آیا تھا۔

"معافی چاہتا ہوں نظام دین بھائی بس یہ سمجھ لو چوہدری صاحب کا بھیجا ہوا ہوں۔"

"وہی زمینوں کی خریداری کے لئے، یار جمال دین، چوہدری صاحب برا نہیں کر رہے؟ زمینیں میں نہیں بیچوں گا اس سے کہو دشمنی کی بنیاد نہ ڈالیں۔ دماغ ٹھیک کرلیں اپنا، اپنی زمینیں ٹھیک کریں۔ ان کی مدد کردوں گا تھوڑی سی جو معلومات مجھے حاصل ہیں۔ پر اب ہم ایسے چوہے بھی نہیں ہیں کہ ہاتھ پیچھے کرکے بیٹھ جائیں ان سے کہو کہ اب زمینوں کی بات نہ کریں، دو دفعہ ہوگئی، تیسری دفعہ اگر انہوں نے زمینوں کا نام لیا تو پھر ہماری طرف سے بھی کارروائی شروع ہوجائے گی۔"

"سوچ لو بھائی نظام دین، گڑھی حیدر بیگ میں کوئی ایسا غلط کام نہیں ہونا چاہئے جس سے بستی والوں کو بھی تکلیف ہو اور تمہیں بھی۔"

"جا بیٹا جا، دھمکیاں نہیں دیتے...... ہم سے جھگڑا مول مت لو، تم نے ہمارا جواب سن لیا، جاؤ چلے جاؤ۔"

جمال دین چلا گیا لیکن اسی رات تقریباً ڈھائی یا تین بجے کا وقت ہوگا کہ بہت دور سے شور شرابے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ نظام دین آج بھی گہری نیند نہیں سویا تھا، ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔

"یہ شور کیسا ہے ذرا دیکھوں باہر جا کر۔"

باہر نکلا بہت دور ایک جگہ سے آسمان سرخ ہو رہا تھا اور یہ سرخی آگ کی سرخی ہی تھی۔ سمت کا اندازہ لگایا تو پتہ چلا کہ یہ اس کی اپنی زمینوں کی سمت ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا زمینوں پر پہنچ گیا۔ اس کی اولاد جل رہی تھی۔ کھڑی فصل میں آگ لگی ہوئی تھی، شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ آس پاس کے لوگ دوڑ دوڑ کر آرہے تھے۔ پھر بہت سے لوگوں نے کنارے کی فصل بھگونا شروع کر دی۔ جس کے ہاتھ جو کچھ لگا وہ لے کر آرہا تھا اور پانی ڈال رہا تھا۔ مگر آگ فصل کے بیچوں بیچ لگائی گئی تھی اور کسی تجربے کار آدمی نے لگائی تھی۔ کنارے کی آگ تو بجھ بھی جاتی ہے لیکن بیچ میں لگائی ہوئی آگ کو بجھانا آسان نہیں ہوتا، لوگ اپنی مقدور بھر آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور نظام دین خاموشی سے اپنی فصل کو جلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اس کا کلیجہ خون ہو رہا تھا، سوچنے سمجھنے کی قوتیں سو گئی تھیں۔ بس وہ فصل کو بھڑکتے ہوئے دیکھ رہا تھا، آگ چاروں طرف پھیل گئی تھی اور اب لوگ بھی رک گئے تھے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ اب کوئی کوشش بیکار ہے۔ البتہ سردار علی کے آدمی اپنی فصل پر پہنچ گئے تھے اور اس کے کنارے کنارے پانی ڈال رہے تھے کہ کہیں آگ ادھر کا رخ نہ کرلے اور یہ فصل بھی لپیٹ میں آجائے حالانکہ فاصلہ اچھا خاصا تھا اور ہوا بھی اتنی نہیں چل رہی تھی اس لئے خطرہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری فصل جل کر راکھ ہوگئی۔ لوگ خاموشی سے نظام دین کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔ کیا کہتے اور کیا کرتے۔ آگ لگی تھی وجہ پر غور کیا جا رہا تھا لیکن کوئی وجہ ہوتی تو سمجھ میں آتی۔ کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔

نظام دین ایک گہری سانس لے کر واپسی کے لئے پلٹ پڑا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، کچھ لوگوں نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تو اس نے ان سے ہاتھ چھڑا لئے۔

"چلا جاؤں گا، مجھے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا اور گھر پہنچ گیا۔ گھر پر بھی یہ اطلاع پہنچ گئی تھی کہ نظام دین کی فصل جل گئی ہے، احمد دین کی بیوی حسینہ بیگم اور خود نظام دین کی بیوی شریفاں دروازے پر سینہ پکڑے ہوئے کھڑی تھیں۔ نظام دین گھر پہنچ کر بولا۔

"چلو اندر چلو تم لوگ کیوں دروازے پر آکر کھڑی ہوگئیں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں لوگ نظام دین، ہماری فصل جل گئی؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں بیچارے، جو دیکھا وہ بتا رہے ہیں۔"

"آگ بجھی؟"

"کہاں شریفاں، اب تو آگ لگی ہے، بجھ جائے گی کسی نہ کسی دن، چلو اندر چلو۔"

"بات تو سنو نظام دین......"

"سنا نہیں تو نے، اندر چلو دروازہ بند کرو۔" نظام دین نے جھڑک کر کہا اور بہو حسینہ بچہ سنبھالے پہلے اندر چلی گئی۔ سسر کا کہا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

دوسرے دن دوپہر کو کوئی دو بجے کے قریب احمد دین ہانپتا کانپتا گھر پہنچ گیا۔

"کھیتوں کی طرف سے آیا ہوں، یہ کیا ہوگیا بابا جی، یہ کیا ہوگیا، ساری فصل راکھ ہوگئی، ہماری فصل تو اس بار پہلے سے بھی زیادہ اچھی ہوئی تھی۔"

"آ بیٹھ بیٹا تو تو کہہ رہا تھا کہ آج نہیں آئے گا؟"

"کوشش کی میں نے بابا جی، چھٹی مل گئی بس فوراً ہی چل پڑا، میرا دل بھی گھبرا رہا تھا، مگر لوگ کہہ رہے ہیں کہ فصل رات کو ہی جلی ہے، آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا؟"

"او بیٹا پانی وغیرہ پی، حادثے تو زندگی کا حصہ ہوتے ہیں، ہوگیا حادثہ، بیٹھ، بات کروں گا بتاؤں گا تجھے، ارے حسینہ بیٹا، پانی وغیرہ دو اسے، اوئے نور دینے، بابا آیا ہے تیرا اوئے، چل بابا کی گود میں جا۔"

تین سالہ بچہ ہمک کر باپ کی گود میں جا پہنچا تھا، مگر احمد دین کے چہرے پر غم کے سائے رقصاں تھے۔

"آخر یہ ہوا کیسے، اس بری طرح جلی فصل کہ کچھ باقی نہ بچا۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔"

بعد میں نظام دین نے احمد دین کو بتایا۔ ''وہ چوہدری سردار علی آیا ہوا ہے شاہ پور سے، ہماری زمینیں دیکھ کر ہمیشہ ہی اس کے منہ میں پانی آجاتا تھا۔ اس بار اس نے زیادہ بدتمیزی کر ڈالی، کہنے لگا کہ میں زمینیں اس کے ہاتھ بیچ دوں اور شہر جا کر کاروبار شروع کر دوں، میں نے اسے سخت الفاظ میں منع کر دیا، بعد میں جمال دین میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ چوہدری کا دل ان زمینوں پر آگیا ہے، بیچ دو تو اچھا ہے، میں نے اسے بھی ڈانٹ کر بھگا دیا۔ بس سیدھی سیدھی سی بات ہے، سردار علی ویسے بھی اچھا آدمی کبھی نہیں رہا۔ جلوا دی اس نے ہماری فصل۔''

''ارے واہ، ایسے ہی جلوا دی، اس کی فصلیں بھی تو ہیں گڑھی حیدر بیگ میں۔''

''کیا مطلب ہے تیرا، ایک بات کہوں، یہ جو پودے زمین سے اگتے ہیں نا ان میں بھی زندگی ہوتی ہے اور زمینیں اس لئے نہیں ہوتیں بیٹا کہ انہیں آگ کی نذر کر دیا جائے تو خود سوچ جو فصلیں زمین سے اگتی ہیں وہ کہلاتی تو ہماری ملکیت ہیں لیکن جن لوگوں کے پیٹ اس اناج سے بھرتے ہیں اصل میں وہ ان کا حق ہوتی ہیں اور مولا انہیں زمین سے ہمارے لئے نہیں اگاتا، ہم تو بس ایک ذریعہ بن جاتے ہیں، وہ جن کے پیٹوں میں پہنچتی ہیں نا اصل ملکیت ان کی ہوتی ہیں، اور ہم مولا کریم کی اتاری ہوئی سوغات کو آگ کی نذر کیسے کر سکتے ہیں بیٹا، مولا کریم ناراض نہیں ہو جائے گا، جو لوگ گناہ کرتے ہیں مولا کریم خود انہیں دیکھتا ہے۔''

''اس نے ہماری زمینیں جلا دیں بابا جی اور آپ مجھے سبق دے رہے ہیں۔''

''میرا کام ہے بیٹے کہ اللہ کے احکامات تم تک پہنچاؤں، باپ ہوں تمہارا۔''

''میں بات کرتا ہوں سردار علی سے، کیا وہ ڈیرے پر موجود ہے؟''

''پتہ نہیں، ہو گا، مگر تو کیا بات کرے گا اس سے؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے بابا جی، اس نے ہماری فصل جلا دی اور ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں۔''

''خاموش ہو کر تو نہیں بیٹھیں گے، پر ذرا سوچنا پڑے گا، البتہ فصل جلانے کے جواب میں فصل جلانا کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے میں تجھے خاص طور سے منع کرتا ہوں خیال رکھنا۔''

نظام دین کا لہجہ آخر میں سخت ہو گیا لیکن بہرحال وہ احمد دین کو ڈیرے پر جانے سے نہیں روک سکا تھا، احمد دین ڈیرے پر پہنچ گیا، اس وقت سردار علی سامنے والے حصے میں پلنگ پر بیٹھا حقے کے کش لے رہا تھا۔ اس کے آس پاس اس کے حواری بیٹھے ہوئے تھے۔ احمد دین کے آنے کی خبر سردار علی تک بھی پہنچ گئی تھی۔

سردار علی نے احمد دین کو دیکھ کر حقے کی نے منہ سے نکالی اور خوشی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ ''ارے واہ، آؤ احمد دین آؤ۔ لاہور میں جا کر تو بندے کی شکل ہی بدل جاتی ہے۔ پر ایک بات کہیں تم سے، گاؤں کا نور گاؤں کا ہی ہوتا ہے۔ بہرحال تم اچھے لگ رہے ہو...... تمہاری فصل جل گئی رات کو بڑا دکھ ہوا بڑا افسوس ہوا، آؤ بیٹھو، ہماری نظر لگ گئی اصل میں تمہاری فصل کو، بڑی خراب نظر ہے ہماری، بڑا افسوس ہوا۔ کل ہی ہم نے انہیں دیکھا تھا، تین مہینے بیمار رہے ہیں، خیر تم سے تو یہ تک نہ ہوا کہ تایا جی کی تیمارداری کو ہی آ جاتے۔ ہم خود تم سب سے ملنے آ گئے مگر یہ افسوسناک واقعہ ہو گیا۔''

''چوہدری صاحب، آپ نے میرے باپ سے یہ زمینیں خریدنے کی بات کی تھی؟''

''ہاں یار بس کیا بتائیں، قبر میں پاؤں لٹکے ہوئے ہیں ہمارے، پر لالچ ابھی نہیں گیا، اصل میں زمینداروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، نسل در نسل زمیندار ہیں، اب وقت بدل گیا یہ اور بچوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق کاروبار شروع کر دیا ہے۔ کئی بار انہوں نے ہم سے کہا کہ ابا جی اب زمینوں سے چھٹکارا پاؤ تھپڑ لگا دیا ہم نے ان کے منہ پر اور کہا کہ بیٹا زمینوں کو ان کی جگہ رہنے دو، کوئی بھوکے مر رہے ہو تم، پر اب بتاؤ کیا کریں، تم نے فصل ہی ایسی اگا دی تھی کہ رال ٹپک پڑی ہماری، ہماری نظر بڑی خراب ہے، لگ گئی۔''

احمد دین خاموشی سے سردار علی کی بکواس سنتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''چوہدری صاحب، میرے باپ نے آپ کو زمین بیچنے سے منع کر دیا تھا، ہماری زمین کو آگ کیسے لگ گئی؟''

''ارے بھیا، لگ گئی بس، کوئی کیا کہہ سکتا ہے، ہونے والا کام تو ہو ہی جاتا ہے، اب تم ایک کام کرو آ گئے ہو شہر سے تو زمینوں کی صفائی کرا دو، ہم اب بھی گاہک ہیں، پہلے فصل کی قیمت بھی دے رہے تھے، اب خالی زمینوں کی قیمت دیں گے وہ بھی کم نہیں ہو گی۔''

''آگ آپ نے لگوائی ہے؟...... زمینیں تو پھر بھی ٹھیک ہو جائیں گی، ایک فصل کا ہی نقصان ہوا ہے لیکن جو آگ آپ نے لگائی ہے وہ آسانی سے نہیں بجھے گی، جو بنیاد آپ نے ڈال دی ہے وہ کب تک چلے گی یہ آپ نہیں جانتے۔''

''ارے لو، یہ چار دن کا لڑکا کیا بک رہا ہے، ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے، ہم پر الزام لگا رہا ہے، ارے دیکھا بھائی تو نے کیا اپنی چھوٹی آنکھوں سے کسی نے دیکھا کہ آگ ہم نے لگوائی ہے۔ ڈیرے پر آیا ہے ہمارے احمد دین، جا گھر جا، جوانی کا جوش زندگی کا انتقام بن جاتا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ ہمارا خون ٹھنڈا ہو گیا ہے، جو بات تو کر رہا ہے نا وہ اچھی نہیں کر رہا۔ اپنے تایا جی سے ایسی بات کر رہا ہے، جا گھر جا اپنے، حفاظت سے چلا جا، اسے عزت سے باہر چھوڑ آؤ۔'' سردار علی نے دو آدمیوں سے کہا۔

احمد دین نے ہونٹ بھینچ کر گردن ہلائی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے چوہدری سردار علی ٹھیک ہے، جا رہا ہوں میں، پتہ لگ جائے گا کہ آگ کس نے لگائی ہے اور اس کے بعد جو پتہ آپ کو لگے گا وہ دنیا دیکھے گی۔''

''جا بھائی جا، ارے لے جاؤ اسے ہمارا خون کھولنے لگا ہے، لے جاؤ اسے۔''

احمد دین ڈیرے سے واپس نکل آیا تھا۔

☆......☆......☆

نظام دین کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار پھیل گئے۔ پھر اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی فائدہ نہیں ہے احمد دین۔'' تو جانتا ہے یہ دور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا ہے، اس کے بیٹے شہر میں کاروبار کرتے ہیں۔ بڑے تعلقات بنا رکھے ہیں انہوں نے۔ ہم جو بھی کارروائی کریں گے ہم پر الٹی ہو جائے گی۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے۔''

''تو پھر کیا کریں بابا جی، زمینیں بیچ دیں، دے دیں وہ زمینیں چوہدری سردار علی کو...... بستی حیدر بیگ چھوڑ کر نکل چلیں کہیں۔ بابا جی! اسے عزت کی زندگی کہا جا سکتا ہے۔''

''اسے صرف زندگی کہا جا سکتا ہے احمد دین، دو چیزیں ہیں، زندہ رہنا ہے تو خاموشی اختیار کر لو بیٹا، پھر سے محنت کریں گے زمینوں پر، اللہ مالک ہے۔''

''اور چوہدری سردار علی پھر زمین جلا دے گا، ایسا ہی کرتے رہیں گے۔''

''تو پھر کیا کرے گا، مجھے بھی تو بتا۔'' نظام دین کو غصہ آ گیا وہ پھر بولا۔ ''بدلے میں زمینیں تو نہیں جلانے دوں گا یہ معصوم زمینیں، یہ لہلہاتے کھیت، انہیں جلانے سے کیا فائدہ پھر مجھے پتہ ہے، مقدمے بازی ہو گی، جو کچھ پاس ہے وہ بھی لگ جائے گا۔ وہ شیطان تو نوٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے، ہمارے پاس کیا رکھا ہے، خاموشی اختیار کر لے بیٹا، تیری مہربانی ہو گی، میں کسی جھگڑے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ جوڑوں گا اس کے سامنے، اس سے کہوں گا کہ چوہدری سردار علی تمہارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ہم ان زمینوں کے سہارے ہی جی رہے ہیں اور انہی کے سہارے جیتے رہنا چاہتے ہیں، تم اگر چاہو تو ہم تمہاری زمینوں کے لئے بھی کام کر سکتے ہیں، میرے دونوں بچے زرعی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، نت نئے طریقے سیکھ رہے ہیں، ہم بغیر کسی معاوضے کے تمہاری زمینوں کے لئے بھی کام کریں گے، تمہیں بتائیں گے ان زمینوں کو کیسے بناؤ گے تاکہ وہ اچھی فصل دینے لگیں۔''

''بابا جی، میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر پاؤں گا، معافی چاہتا ہوں۔''

''ٹھنڈا ہو بیٹا ٹھنڈا ہو، چل دیکھتے ہیں سوچتے ہیں کیا کریں اور کیا نہ کریں۔''

نظام دین بیٹے کو اس سے زیادہ دباؤ میں نہیں لا سکتا تھا۔ دوسرے ہی دن جمیلہ بھی لاہور سے آ گئی، وہ پریشان تھی۔

''مجھے تو کچھ بتایا ہی نہیں جاتا، ایسا لگتا ہے جیسے اس گھر میں میری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، بھائی بغیر کچھ بتائے چلے آئے، میں نے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ گاؤں گئے ہوئے ہیں، یہ سب کچھ تو ٹھیک نہیں ہے بابا جی۔''

''ارے بیٹا، کچھ ایسی ہی الجھن پیش آ گئی تھی۔''

پھر جمیلہ کو بھی ساری تفصیل بتانی پڑی۔ پڑھی لکھی لڑکی تھی، بھائی ہی کی ہم آواز بنی۔

''مقدمہ قائم کر دینا چاہئے، لڑیں گے مقدمہ، جو ہو گا دیکھا جائے گا، اللہ مالک ہے۔''

''بیٹا میری بات سن، کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے ہمارے پاس کہ زمینوں کو آگ چوہدری سردار علی نے ہی لگائی ہے۔''

☆......☆......☆

پھر یہ ثبوت قدرتی طور پر انہیں مل گیا، حمیدو گوالا جوان کے ہاں بھی دودھ دیتا تھا، تیسرے دن آیا تھا، شریفاں نے دودھ لیتے ہوئے کہا۔

''حمیدو بھائی، دو دن سے نہیں آئے آپ بیمار پڑ گئے تھے کیا، دودھ کی بڑی تکلیف ہوئی، کسی کے ہاتھ ہی بھیج دیتے۔''

''بس چوہدران بیماری پڑ گیا تھا سمجھ لو۔''

''سمجھ لو سے کیا مراد؟''

''چوہدری صاحب گھر میں ہیں؟''

''ہاں، احمد دین بھی آیا ہوا ہے اور جمیلہ بیٹی بھی۔''

''بات کرا دیں ذرا میری۔'' حمیدو نے کہا اور پھر وہ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

''چوہدری صاحب دل نہیں مان رہا، بہت سمجھا رہے ہیں دل کو کہ حمیدو برداشت کر لو، نہ تمہیں فائدہ ہو گا نہ کسی اور کو۔''

''کیا ہو گیا حمیدو، خیر تو ہے، تم دو دن سے آئے بھی نہیں؟''

''کہا نا برداشت کر رہے تھے، سینے پر پتھر رکھے ہوئے تھے۔''

''اب کہانیاں ہی سناتے رہو گے یا بتاؤ گے بھی کہ بات کیا ہے؟''

''بتا رہے ہیں، بتانے آئے ہیں، اللہ مالک ہے جو ہو گا دیکھا جائے گا، چوہدری نظام دین، احمد دین بھائی، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے سب کچھ، سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے، کیسے برداشت کریں؟''

''کیا دیکھا ہے بتاؤ تو سہی؟''

''آپ کی فصلیں جل گئی ہیں نا، یہ رجب شاہ نے جلائی ہیں...... ہم نے خود تیل کا پیپا لے کر اسے آپ کے کھیتوں میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر مٹی کے تیل کی بدبو پھیلی، پھر شعلے اٹھے، پھر رجب شاہ بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ تیل کا پیپا اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پورے کا پورا پیپا خالی کر آیا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہم نے، ادھر سے جا رہے تھے، رجب شاہ جیل کاٹ کر آیا ہے۔ بڑی شرافت سے بیٹھا ہوا تھا لیکن یہ بات آپ سب لوگ جانتے ہو کہ چوہدری سردار علی اس کا خرچہ اٹھاتے ہیں۔ جیل میں بھی وہ چوہدری سردار علی ہی کے کسی معاملے میں گیا تھا اور چوہدری سردار علی اس کی بیوی کو باقاعدہ خرچہ بھیجتے رہتے تھے۔ ارے ہم ان کے ہاں بھی دودھ دیتے ہیں، ہمیں کس گھر کی کہانی نہیں معلوم۔''

احمد دین کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔ نظام دین بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے کبھی حمیدو اور کبھی احمد دین کو دیکھ رہا تھا۔ پھر نظام دین نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''حمیدو بھیا، تیری مہربانی، بے فکر رہ، تیرا نام بھی زبان پر نہیں آئے گا۔ تو خود بھی خاموشی اختیار کر لے۔ دیکھنے والا آسمان پر بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہے، ہم چوہدری سردار علی کے مقابلے میں کمزور ہیں۔ ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے اس کا۔ اللہ ہی بگاڑے گا۔''

حمیدو نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گردن جھکا کر واپس چلا گیا۔ نظام دین اب بھی بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے احمد دین کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''اس کی دماغی حالت ٹھیک کہاں ہے، پچھلے دنوں تو باقاعدہ پاگل ہو گیا تھا، وہ تو اللہ نے رحم کر دیا، ورنہ لوگ کہہ رہے تھے کہ اسے پاگل خانے بھجوا دیا جائے، کون جانے اس وقت بھی ٹھیک کہہ رہا ہے یا غلط۔''

احمد دین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

☆......☆......☆

احمد دین بڑی احتیاط کے ساتھ رجب شاہ کا پیچھا کر رہا تھا۔ رجب شاہ کے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ چلا تھا کہ کماد کے کھیتوں میں جو سرسراہٹ ہو رہی ہے وہ کسی انسان کے قدموں کی سرسراہٹ ہے۔ تھابے کی پلی کے پاس جہاں کماد کے کھیت ختم ہوتے تھے اور آگے درختوں کا سلسلہ پھیل جاتا تھا، اچانک ہی رجب شاہ نے کسی کو کماد کے کھیتوں سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا اور چونک کر پیچھے دیکھنے لگا۔

وہ احمد دین تھا۔ رجب شاہ کو نہ جانے کیوں ایک دم جھرجھری سی آ گئی۔ وہ اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''او ہو احمد دین، تم کماد کے کھیتوں میں کیا کر رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی بچپن میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے نا رجب شاہ، یاد نہیں ہے انہی کھیتوں میں چھپ چھپا کر تو ہم نے زندگی گزاری ہے۔''

''بچپن بھی کیا چیز ہوتا ہے؟''

''تو جیل سے کب آیا؟''

''ہو گئے اٹھارہ بیس دن۔''

''کیا کر رہا ہے آج کل؟''

''بس یار، کرنا کرانا کیا، اپنی تو زندگی ہی بگڑ گئی۔''

''کتنے پیسے ملے تجھے، ہمارے کھیت جلانے کے؟'' احمد دین نے براہ راست سوال کر ڈالا اور رجب شاہ چونک پڑا۔

''کیا کہہ رہے ہو احمد دین؟''

''رجب شاہ میں پوچھ رہا ہوں چوہدری سردار علی نے تجھے ہمارے کھیت جلانے کے کتنے پیسے دیئے؟''

''پاگل ہو گئے ہو تم۔ زمینیں جلی ہیں تمہاری، ہمیں بھی پتہ ہے پر ہم سے یہ فضول کلامی کیوں کر رہے ہو؟''

احمد دین اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ رجب شاہ اچھا خاصا لمبے چوڑے بدن کا مالک تھا لیکن احمد دین کی صحت بھی بہت شاندار تھی نہ جانے کیوں اس وقت رجب شاہ کو احمد دین اپنے آپ سے زیادہ طاقتور محسوس ہوا۔

''رجب شاہ، میرے کھیت جلائے ہیں تو نے۔''

''اے کس نے کہا تجھ سے کہ میں نے جلائے ہیں تیرے کھیت؟''

رجب شاہ نے کہا۔ تب ہی احمد دین کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ رجب شاہ درحقیقت لڑکھڑا گیا تھا لیکن دوسرے لمحے اس نے سنبھل کر احمد دین پر حملہ کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ احمد دین باقاعدہ باکسر تھا، اس نے شہر ہی میں کسی سے باکسنگ سیکھی تھی۔ تین چار تابڑ توڑ گھونسے رجب شاہ کے منہ پر پڑے تو رجب شاہ کے ہوش و حواس ٹھکانے آ گئے۔

''مجھے مارے جا رہا ہے، مجھے مارے جا رہا ہے، میں کہتا ہوں میری دشمنی نہ لے، برا حال کر دوں گا تیرا۔'' جواب میں احمد دین کا ایک گھونسا پھر اس کے جبڑے پر پڑا۔

''اے کس نے کہہ دیا تجھ سے یار مجھے بتا تو سہی، میری بات سن۔''

''رجب شاہ، تجھے سب سے پہلے پنچایت کے سامنے بیان دینا ہو گا کہ تو نے سردار علی کے کہنے سے ہمارے کھیت جلائے ہیں۔''

''اور سردار علی میرا کیا حشر کرے گا یہ معلوم ہے تجھے؟''

''وہ تو جان اور تیرا کام...... میری بات سن لے، تو اگر یہاں سے بھاگ بھی گیا تو تیری بیوی موجود ہے، میں تجھے پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا رجب شاہ۔ کل صبح میں سرپنچ کے پاس جا رہا ہوں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ سرپنچ بھی چوہدری سردار علی ہی کی بات کرے گا لیکن بستی میں اور بھی لوگ ہیں، تجھے پنچوں کے سامنے ساری صورت حال بتانا ہو گی۔''

''بتا دوں گا، بتا دوں گا۔'' رجب شاہ نے کہا۔

احمد دین اسے گھورتا ہوا واپس پلٹ پڑا تھا، لیکن رجب شاہ وہیں اپنی جگہ بیٹھ کر اپنی باچھوں سے بہنے والے خون کو صاف کرنے لگا تھا۔

زندگی میں ایسی مار رجب شاہ نے کبھی نہیں کھائی تھی، اچھے خاصے کارنامے سرانجام دیئے تھے لیکن یہ حشر پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا تو ابھی مشکل تھا کہ اس بے عزتی کا بدلہ کس طرح لیا جائے۔ ہاں یہ ضرور سوچا تھا اس نے کہ اس واقعے کی اطلاع چوہدری سردار علی کو دی جائے یا پھر خاموشی اختیار کر لی جائے لیکن چند ہی لمحوں کے بعد آہٹ سنائی دی اور وہ یہ سوچ کر اچھل پڑا کہ کہیں احمد دین واپس نہ آ گیا ہو، پلٹ کر دیکھا تو فقیر محمد تھا۔ ہاتھ میں پانی کا برتن لئے ہوئے اس کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں پانی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کلی کر لو رجب شاہ، بڑا خون نکل رہا ہے۔''

رجب شاہ نے خونی نگاہوں سے فقیر محمد کو دیکھا، یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ فقیر محمد اس پر طنز کر رہا ہے یا اس کے انداز میں معصومیت ہے، فقیر محمد جلدی سے بولا۔ ''بڑی دور سے تمہارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا احمد دین، ہم کماد کے کھیتوں میں ہی ہوتے ہیں، ہم یہ سمجھے کہ کوئی جناور گھس آیا ہے پھر ہم نے اسے دیکھ لیا اور اس کا پیچھا کیا جو کچھ اس نے کیا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، لو خون بہہ رہا ہے، منہ پر چھپاکے مار لو۔''

رجب شاہ نے فقیر محمد کی سادگی کو محسوس کر لیا، پانی لے کر منہ صاف کیا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''آؤ فقیر محمد! ذرا چوہدری سردار علی کے ڈیرے پر چلتے ہیں۔''

''چلو ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں، ہم نے سب کچھ دیکھا ہے۔''

اور رجب شاہ فقیر محمد کے ساتھ چوہدری سردار علی کے ڈیرے پر پہنچ گیا، سردار علی کو خبر کرائی گئی کہ فقیر محمد آیا ہے تو سردار علی نے اسے برآمدے میں بٹھانے کا حکم دیا۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد باہر آیا لیکن رجب شاہ کی شکل دیکھ کر چونک پڑا۔ فقیر محمد نے ادب سے سلام کیا تھا۔

''رجب شاہ! کیا ہو گیا تجھے، کسی سے لڑائی ہو گئی ہے کیا؟''

''چوہدری صاحب اگر آپ کا نام بیچ میں نہ آتا تو ہم لڑنے والے سے خود ہی نمٹ لیتے، پر کوئی حکم نہیں تھا ہمارے پاس اس لئے ہاتھ نیچے رکھے۔''

''کیا مطلب، کیا ہوا؟'' چوہدری سردار علی نے پوچھا۔

''احمد دین نے کھیتوں میں پکڑ لیا، وہ باقاعدہ قتل کرنے کا پروگرام بنا کر آیا تھا۔ آتے ہی بولا کہ کتنے پیسے ملے تجھے ہمارے کھیت جلانے کے۔ بہت غصہ آیا پہلا حملہ اسی نے کیا تھا فقیر محمد سے پوچھ لیں، بڑا منصوبہ بنا کر آیا تھا وہ کماد کے کھیتوں میں چھپے چھپے ہمارا پیچھا کر رہا تھا اور ایسی جگہ ہمارے سامنے آیا جہاں اور کوئی موجود نہیں تھا، وہ تو فقیر محمد اتفاق سے اس طرف سے گزر رہا تھا کیونکہ یہ بھی کماد کے کھیتوں میں ہی کام کرتا ہے، آپ اس سے پوچھ لیں جی کہ ہم غلط تو نہیں کہہ رہے۔''

رجب شاہ اور کیا کہہ رہا تھا، پتہ نہیں چوہدری سردار علی نے یہ بات سنی یا نہیں ان کی آنکھیں رجب شاہ پر گڑی ہوئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رجب شاہ کی روح کی گہرائیوں میں اتر رہے ہوں، پھر وہ چونکے اور چونک کر فقیر محمد سے بولے۔ ''فقیر محمد! تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کماد کے کھیتوں میں چھپ کر رجب شاہ کا پیچھا کر رہا تھا؟''

''اولاد کی قسم چوہدری صاحب ایسی ہی بات تھی اور پھر اس نے ایک جگہ رجب بھائی پر حملہ کر دیا اور خوب زور کا جھگڑا ہوا۔''

''کیا وہ بھی زخمی ہوا ہے؟'' سردار علی نے پوچھا۔

''چوٹیں تو لگی ہوں گی اس کے بھی، پر اندرونی چوٹیں لگی ہوں گی، سامنے کی کوئی چوٹ تو نظر نہیں آئی ہمیں۔''

''ہوں ٹھیک ہے رجب شاہ بات ایسے ختم نہیں ہو گی، کیا سمجھے تو بالکل فکر مت کر، دیکھتے ہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اس سلسلے میں۔''

''حکم دیں چوہدری صاحب، میں نے تو صرف آپ کا حکم نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ نیچے رکھے، ورنہ مجال ہے کسی کی جو رجب شاہ کا مقابلہ کر سکے۔''

''ابھی نہیں رجب شاہ، ابھی نہیں تھوڑا انتظار کر لے، ہم کرتے ہیں کام۔ کر دیں گے ان باپ بیٹوں کا علاج، اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں، ہو جائے گا علاج ہو جائے گا، تو بالکل فکر مت کر۔'' چوہدری سردار علی نے کہا اور پھر فقیر محمد سے بولا۔ ''تم جاؤ، باہر جاؤ اور سنو، ہو سکتا ہے پولیس کے سامنے ہمیں تمہاری گواہی کی ضرورت پیش آئے۔''

''آپ کا نمک کھاتے ہیں مائی باپ، آپ جیسا حکم کریں گے ویسا ہی کریں گے ہم۔'' فقیر محمد ہاتھ جوڑ کر بولا اور پھر وہاں سے چلا گیا، تب چوہدری سردار علی نے رجب شاہ سے کہا۔ ''رجب شاہ بالکل فکر مت کرو، یہ کچھ رقم اپنی بیوی کو دے دو، تم نے ہمارے لئے یہ مار کھائی ہے نا، ہم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں گے تم دیکھنا، علاج ہو جائے گا اس احمد دین کا بھی، بڑا تیس مار خاں سمجھتا ہے اپنے آپ کو، دیکھنا تماشا۔''

''بس سرکار! آپ ہمارا خیال رکھیں، ایسے چھوٹے موٹے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' رجب شاہ اس رقم کو جیب میں رکھتا ہوا بولا جو چوہدری نے اسے دی تھی اور پھر وہ چوہدری کو سلام کر کے واپس چلا گیا۔

چوہدری سردار علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی، اس نے پاس کھڑے ہوئے ملازم سے کہا۔ ''ذرا حیدر علی کو بلاؤ۔''

تھوڑی دیر کے بعد حیدر علی، چوہدری سردار علی کے پاس پہنچا تو سردار علی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ ایک سنسان سی جگہ پہنچ کر سردار علی آہستہ سے بولا۔ ''ایک کام کرنا ہے حیدر علی ایک کام کرنا ہے، بس ایسے کھیل کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔'' پھر وہ حیدر علی کے کان میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

شمشادو کے پاس چھوٹی سی زمین تھی، اس زمین پر وہ بھی سبزی اگایا کرتا تھا، گڑھی حیدر بیگ میں اس طرح کے بہت سے چھوٹے چھوٹے زمیندار تھے جو ایسے کام کیا کرتے تھے، شمشادو اپنی سبزیاں خود سبزی منڈی بیچ کر آتا تھا۔ یہ منڈی گڑھی حیدر بیگ سے کوئی دس کلومیٹر کے فاصلے پر لگتی تھی۔ آڑھتی کسانوں سے مال خرید کرتے تھے اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے منافع سے آگے بیچ دیا کرتے تھے۔ اس دن بھی شمشادو اپنی سبزیاں لے کر گیا تھا، ایسا کام صبح منہ اندھیرے ہوتا ہے اور جب سورج پوری طرح نکلتا ہے تو ان لوگوں کی واپسی بھی ہو جاتی ہے۔ پھر تھوڑا بہت کھانے پینے کے بعد یہ دوبارہ اپنی مشقت پر لگ جایا کرتے ہیں، اس وقت بھی سورج تو خیر پوری طرح نکل آیا تھا لیکن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے جن کی وجہ سے مدھم مدھم اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے شمشادو نے اس انسانی جسم کو دیکھ لیا جو ایک کھیت کی مینڈھ کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ وہ کون ہے جو یہاں اس طرح بے پروائی سے سو رہا ہے۔ شمشادو نے سوچا اور اپنی بیل گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سونے والے کے قریب پہنچا اور اسے ایک نگاہ میں پہچان لیا۔ یہ رجب شاہ تھا، گڑھی حیدر بیگ کا غنڈہ جسے کوئی بھی اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا تھا لیکن اس وقت وہ بری کیفیت میں تھا، اس کے سینے پر ایک بڑا گھاؤ تھا اور اس کی گردن جس طرح ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے لیکن جب شمشادو نے اسے قریب جا کر دیکھا تو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بے ہوش نہیں ہے بلکہ مر چکا ہے اور اپنی موت نہیں مرا ہے، سینے کے زخم سے ابلنے والا خون ادھر ادھر بہہ رہا تھا۔ دوسرے لمحے شمشادو کے حلق سے ایک دھاڑ نکلی۔

''خون ہو گیا، کسی نے رجب شاہ کو مار دیا، خون ہو گیا۔ خون ہو گیا۔''

اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے بیل پر سانٹے برسانے شروع کر دیئے۔ بیل گاڑی تیزی سے دوڑاتا ہوا بڑے بازار پہنچا۔ راستے بھر چیختا آیا تھا۔ ''خون ہو گیا رجب شاہ کا خون ہو گیا۔'' گڑھی حیدر بیگ میں ہاہاکار مچ گئی۔ رجب شاہ کی بیوی کو خبر پہنچی تو وہ دھاڑیں مارتی باہر نکل آئی۔ شمشادو کی نشاندہی پر بہت سے لوگ لاش کے پاس پہنچ گئے۔ پھر کچھ لوگ چوہدری سردار علی کے پاس بھی پہنچ گئے۔

''رجب شاہ کا خون ہو گیا چوہدری صاحب۔ ہمارے لئے آپ سے بڑا کون ہے جی۔ آپ کے پاس خبر دینے آئے ہیں۔''

''او ہو...... بالآخر یہ ہو ہی گیا۔ ہمیں معلوم تھا ایسا ہونا ہے۔ احمد دین کے پاگل پن کی تو ہمیں خبر ہو گئی تھی۔'' پھر چوہدری صاحب نے اپنے بیٹے حیدر علی خان کو بلایا اور بولے۔ ''حیدر علی سنا تم نے آخر کار احمد دین نے رجب شاہ کو قتل کر دیا۔ تم ایک کام کرو حیدر علی...... اور فوراً کرو۔''

''جی ابا جی حکم دیں؟''

''فقیر محمد کو جہاں ملے ہمارے پاس لے آؤ۔ اس کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔''

''کیوں ابا جی۔ اس کی زندگی خطرے میں کیوں ہے؟''

''تم سے اس بے وقوفی کے سوال کی امید نہیں تھی۔ بے وقوف وہ سب سے معتبر گواہ ہے۔ اس نے احمد دین کو رجب شاہ کو مارتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور ہاں فقیر محمد کو یہاں پہنچا کر پولیس کو خبر کرنے کے لئے بندے دوڑا دو۔''

''جی ابا جی۔'' حیدر علی نے سر جھکا کر کہا۔ (جاری ہے)

خوف

ایم اے راحت

قسط : 2

پولیس تھانہ، گڑھی حیدر بیگ سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ پولیس انسپکٹر کو آنے والوں نے بتایا تھا کہ بستی میں خون ہو گیا ہے اور چوہدری صاحب نے ہمیں بھیجا ہے۔

آگے چوہدری کے آدمیوں کی جیپ اور پیچھے انسپکٹر کچھ سپاہیوں وغیرہ کے ساتھ گڑھی حیدر بیگ پہنچا اور سیدھا چوہدری سردار علی کے ڈیرے پر گیا۔ چوہدری صاحب نے فارم ہاؤس کی عمارت کے باہر ہی انسپکٹر کا استقبال کیا تھا۔

''لو بھئی تھانیدار صاحب، آپ اپنا کام سنبھالو۔ ہم نے لاش کے پاس بندے بھجوا دیئے ہیں تاکہ کوئی اسے ہاتھ نہ لگائے ہم جانتے ہیں کہ پولیس ہر چیز کی چھان بین کرتی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھو تو دو تین بندے قاتل کے گھر بھجوا دو تاکہ وہ فرار نہ ہو سکے۔''

''آپ قاتل کو جانتے ہیں چوہدری صاحب؟''

''او میاں، جانتے نہ ہوتے تو اتنی بڑی بات منہ سے کیسے نکالتے۔ قتل چوہدری نظام دین کے بیٹے نے کیا ہے۔''

تھانیدار نے چار سپاہیوں کے ساتھ اپنے ماتحت کو اس طرف بھیج دیا جہاں لاش پڑی ہوئی تھی اور دو بندوں کو نظام دین کے گھر کی نگرانی کے لئے روانہ کر دیا۔ پھر چوہدری سردار علی نے تھانیدار کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ تھانیدار شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا تھا۔

''دیکھو میاں، زمینداروں میں ایسے کھیل ہوتے رہتے ہیں وہ نظام دین احساس کمتری کا شکار ہے، ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، شادپور میں ہماری حویلی ہے، شہر میں لڑکوں نے بڑے بڑے کاروبار پھیلا رکھے ہیں۔ ہماری آمدنی اتنی ہے کہ ہم اسے سنبھال بھی نہیں پاتے۔ کسی نے اس کی زمینوں میں آگ لگا دی۔ وہ ہمارے اوپر چڑھ دوڑا کہ میری زمینوں کو آگ تم نے لگوائی ہے۔ اب بتاؤ ایسے منہ زور کے لئے کوئی کیا کرے، پتہ نہیں کہاں سے سن گن مل گئی۔ بیچارے رجب شاہ کو اس کے بیٹے احمد دین نے پکڑ لیا اور اسے اتنا مارا کہ وہ چل بسا۔ اس کا چشم دید گواہ فقیر محمد ہے، بلاتے ہیں آپ کے سامنے اسے……او بلاؤ ذرا فقیر محمد کو۔''

''فقیر محمد نے تھانیدار کے سامنے وہی بیان دیا جو کسی حد تک سچ بھی تھا اور پھر شمشادو کو بھی بلایا گیا جس نے وہ لاش دیکھی۔

''اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ فصل جلی تھی۔ ارے فصل دوبارہ ہو جاتی ہے۔ پر کیا کیا کریں بندے کا دماغ اسی طرح خراب ہوتا ہے۔ رجب شاہ کی بیوی کو تو بیوہ کر ہی دیا اس نے۔ اب خود کونسا بچ جائے گا خود بھی بال بچے دار ہے، جاؤ تھانیدار جی دیکھ لو۔ کوئی ضرورت ہو تو ہمارے پاس آ جانا۔''

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب پہلے ذرا لاش کا معائنہ کر لوں اسے پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانا پڑے گا اور ہاں فقیر محمد کو میرے ساتھ بھیج دیجئے اس کی گواہی بڑی اہم ہے۔''

''ٹھیک ہے میاں جو دل چاہے کرو۔ ویسے رجب شاہ کی موت کا ہمیں بڑا دکھ ہے۔''

احمد دین کو رجب شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر فرد جرم عائد کر دی گئی۔ اسے شہر بھیج دیا گیا۔ عدالت میں فقیر محمد نے گواہی دی کہ جو کچھ ہوا اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ چوہدری نظام دین نے ایک وکیل کیا اور باقاعدہ مقدمہ چلنے لگا۔ چوہدری نظام دین پوری بستی والوں کو یہی دہائی دیتا پھر رہا تھا کہ اس کا بیٹا بے گناہ ہے۔ فقیر محمد نے علی الاعلان کہا تھا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے احمد دین کو رجب شاہ کی پٹائی کرتے ہوئے دیکھا تھا، ادھر شمشادو کو چوہدری سردار علی نے اپنے پاس بلا کر اسے قتل کا عینی گواہ بنا لیا تھا۔ شمشادو سیدھا سادہ آدمی تھا، چوہدری سردار علی نے اسے دھمکیاں دی تھیں اور کہا تھا۔ ''دیکھ شمشادو، تجھے بھی اسی بستی میں جینا ہے۔ رجب شاہ ہمارا آدمی تھا احمد دین نے اسے جان سے مار ڈالا۔ کب اور کیسے مارا اس کا صحیح پتہ نہیں لیکن مجرم کو سزا ملنی چاہئے۔ ارے کل کا وہ لونڈا، ذرا لاہور میں جا کر پڑھ لکھ کیا لیا ہمیں دھمکیاں دینے ہمارے ڈیرے پر چلا آیا۔ تجھے ہمارا ساتھ دینا ہے شمشادو، تو نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ احمد دین نے رجب شاہ کو چت لٹایا ہوا تھا اور کسی دھار دار چیز سے اس پر پے در پے حملے کر رہا تھا اور سن شمشادو، بیان سے پھرا تو تیرا کیا ہوگا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔''

شمشادو نے سہم کر گردن ہلا دی تھی۔ ''ٹھیک ہے چوہدری جی جیسا آپ حکم کرو گے ویسا ہی کہوں گا میں۔''

☆……☆……☆

جمیلہ نے نظام دین سے کہا۔ ''بابا! بھائی کو بچانے کے لئے ہم اپنا سب کچھ نچھاور کر دیں گے۔ میں اخبار والوں کو جمع کر کے انہیں تفصیل بتاؤں گی۔ چوہدری سردار علی بہت بڑا زمیندار ہے تو ہم بھی تو اسی زمین پر رہنے والے ہیں، ہماری داد فریاد کہیں نہیں ہوگی۔ حمیدو نے بھائی کو بتایا کہ رجب شاہ نے کھیتوں میں آگ لگائی ہے، بھائی نے اسی لئے رجب شاہ سے پوچھ گچھ کی تھی اور اسے مارا پیٹا تھا۔''

''نہیں جمیلہ نہیں بیٹے تمہیں نہیں اندازہ کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ حمیدو بیچارا بھلا کیا گواہی دے گا۔ چوہدری اس کا بھی خانہ خراب کر دے گا۔ اپنی آگ میں ہمیں خود ہی جلنا ہے بیٹے، بس دیکھو تقدیر میں کیا لکھا ہے۔''

پڑھنا لکھنا تو سب چھوٹ ہی گیا تھا، بیچاری حسینہ بیگم اپنے بچے کو سینے سے لگائے دن رات احمد دین کی رہائی کی دعائیں مانگتی تھی۔ سارا گھر بے کسی کا شکار ہو گیا تھا۔ جمیلہ کی کچھ دوست تھیں جو ہاسٹل میں اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کا باپ اخبار نویس تھا، جمیلہ نے کوشش کی اور اخبارات میں ان لوگوں کے بیانات آ گئے۔ جن میں انہوں نے سرکردگان وطن سے مدد کی درخواست کی تھی اور دہائی دی تھی کہ ایک باپ کے اکلوتے بیٹے کو، ایک بچے کے باپ کو، ایک بیوی کے شوہر کو، ایک بہن کے بھائی کو اس ناگہانی مصیبت سے بچایا جائے، وہ بے گناہ ہے، اسے آزادی دی جائے۔ مقدمہ چلتا رہا، گھر کے سارے اثاثے بک گئے۔ بستی حیدر بیگ کے رہنے والے نظام دین کے خاندان سے پوری پوری ہمدردی رکھتے تھے لیکن خالی ہمدردی سے کیا ہوتا ہے۔

چوہدری نظام دین نے اخبار کو آخری بیان دیا۔ ''جب گھر کا روشن چراغ بجھ جائے تو پورا گھر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے، میرا بیٹا اکلوتا ہے اور گھر کا کفیل ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ اگر اس بے گناہ کو موت کی سزا ملی تو پھر ہمارے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے، ہم سب بھی کسی نہ کسی طرح موت کو اپنا لیں گے۔ ہم زندہ نہیں رہیں گے۔ اگر ہماری داد رسی نہ کی گئی تو ہم سب موت کو گلے لگا لیں گے۔''

لیکن ایسے بیانات تو چھپتے ہی رہتے ہیں، مدد کی ایسی درخواستیں تو کی جاتی رہتی ہیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ ان فضول کہانیوں میں سر کھپائے، فیصلے تو آسمانوں سے ہوتے ہیں اور آخرکار احمد دین کے لئے بھی فیصلہ ہو گیا۔ اسے رجب شاہ کے قتل کے الزام میں سزائے موت اور ساتھ ہی دس لاکھ روپے جرمانہ بھی عائد کیا گیا۔

چوہدری سردار علی نے ایک بار پھر نظام دین کو پیشکش کی تھی۔ ''بیٹے کے مقدمے کے اخراجات کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوگی تمہیں نظام دین، زمین بیچ دو اچھے پیسے دے دوں گا۔''

''یہ زمین تم لے لو چوہدری سردار علی لیکن ایک بات غور سے سن لو اگر اس میں ہمارا پسینہ جذب ہے، اس کے سینے میں اگر ہماری محبت سمائی ہے تو انشاء اللہ یہ تمہیں اناج کا ایک دانہ نہیں دے گی۔ یہ بنجر ہو جائے گی اور اس طرح بنجر ہو جائے گی کہ اس پر صرف دھول اڑے گی، سمجھ لیا تم نے چوہدری سردار علی اس پر صرف دھول اڑے گی۔''

چوہدری سردار علی طنزیہ انداز میں شانے ہلا کر خاموش ہو گیا تھا۔ احمد دین کے لئے ہائیکورٹ اور پھر سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی لیکن چوہدری سردار علی کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ آخرکار اس کی سزائے موت کا دن متعین ہو گیا اور اس کی موت کے لئے بلیک وارنٹ جاری کر دیا گیا۔

چوہدری سردار علی کو اس کی حویلی شادپور میں تمام اطلاعات مل رہی تھیں۔ تمام اپیلیں مسترد ہونے اور سزائے موت کے دن کے تعین کی خبر سن کر اس نے کہا۔ ''کہہ رہا تھا کہ جو آگ آپ نے لگائی ہے وہ آسانی سے نہیں بجھے گی کہتا تو ہمارا بھی یہی تھا۔ پر جلا کون۔ مقابلہ بھی دیکھ بھال کر کیا جاتا ہے۔ کس نے کہا تھا تم سے بھائی کہ چٹانوں سے ٹکراؤ، سر تو پھٹنا ہی تھا۔ کب ہو رہی ہے اسے پھانسی؟''

''چودہ تاریخ کو چوہدری صاحب۔''

''چلیں گے گڑھی حیدر بیگ۔ نظام دین بستی کا بندہ ہے۔ افسوس کرنے تو چلیں گے۔''

☆……☆……☆

بارہ تاریخ کو سردار علی کے دوسرے بیٹے صفدر علی نے چوہدری کو اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ چوہدری نظام دین کا بیان چھپا ہے اخبار میں۔''

''خیر ہے؟ کیا بیان ہے؟''

''لکھا ہے۔ میں چوہدری نظام دین، ولد محمد دین چاروں طرف سے مایوس ہو کر بیان دے رہا ہوں کہ میرا بیٹا احمد دین بے قصور ہے اس نے رجب شاہ کا خون نہیں کیا۔ احمد دین میرا اکلوتا بیٹا ہے، شادی شدہ ہے اور ایک بچے کا باپ ہے، ایک بہن کا بھائی ہے، ایک ماں کا بیٹا اور ایک باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ ایک بے گناہ کو سزائے موت دلوانے میں صاحب اقتدار لوگوں کا ہاتھ ہے، میں کسی کا نام نہیں لوں گا بلکہ آنے والا وقت خود ان کے نام کی تشہیر کرے گا۔ میں سب سے اپیلیں کر چکا ہوں۔ حکومت سے، اہل اقتدار سے، کوئی نہیں سنتا میری، سن لو اور اگر تم نے میری بات نہ سنی تو میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم سب خودکشی کر لیں گے۔ اپنے بے گناہ بیٹے کے پیچھے پیچھے اس دنیا سے چلے جائیں گے اور وہ سن لیں جنہوں نے بڑی محنت کر کے میرے بیٹے کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا ہے، ہم زندہ نہیں رہیں گے لیکن ہماری روحیں تمہارا پیچھا کریں گی، ہم تمہیں ایسی موت ماریں گے کہ موت بھی پناہ مانگے گی۔''

چوہدری سردار علی نے یہ خبر سنی اور مسکرا دیا۔ ''خیر پاگل تو ہونا ہی تھا نظام دین کو، ارے بابا، زمینوں کو پھانسی نہیں ہوتی، پھانسی ان ضدیوں کو ہوتی ہے جو ان زمینوں سے اتنے گہرے رشتے جوڑ لیتے ہیں، کیا جاتا چھوٹی سی بات تھی۔ ہماری مان لیتا تو ہم آگے بھی اس کی مدد کر سکتے تھے۔ اب ہو گیا باؤلا، ہونا ہی تھا۔ کوئی کیا کر سکتا ہے، چلو ٹھیک ہے، ہم ان روحوں کا انتظار کریں گے۔'' چوہدری نے کہا اور ایک قہقہہ لگا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔

☆……☆……☆

احمد دین کو سزائے موت ہو گئی۔ پورا خاندان اس سے آخری ملاقات کرنے کے لئے گیا تھا، اس کی بیوی حسینہ کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں، اس نے اپنے ننھے سے بچے کو سینے سے لگایا اور دیر تک اسے چپٹائے رہا۔

''حسینہ تمہارا احمد دین تمہارے پاس ہے، یہ بڑا ہو کر تمہارا خیال رکھے گا۔'' پھر وہ اپنے بابا سے مخاطب ہوا۔ ''بابا جی معافی چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہو میں قاتل نہیں ہوں۔ بس اتنا کافی ہے میرے لئے۔''

احمد دین کو باپ کے بیان کے بارے میں بتایا نہیں گیا تھا اس لئے اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس کے باپ نے کیا اعلان کیا ہے۔ بہرحال سب سے مل کر اس نے نماز ادا کی اور اس کے بعد پھانسی گھاٹ کی جانب چل پڑا۔ موت کے بعد ضروری کارروائی ہوئی اور پھر اس کی لاش نظام دین کے حوالے کر دی گئی۔

حیرت انگیز طور پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا گیا تھا، پولیس نے خاص طور سے اس بے گناہ انسان کی موت کی کوریج کی تھی لیکن اس وقت خاصا تناؤ پیدا ہو گیا جب چوہدری سردار علی اپنے دونوں بیٹوں اور دو گن مینوں کے ساتھ تدفین میں شرکت کے لئے بستی حیدر بیگ میں داخل ہوا۔

نظام دین نے ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر کہا۔ ''میری بستی کے لوگو! میں نے تمہارے غم میں کبھی تمہارا مذاق نہیں اڑایا، میں نے ہمیشہ تمہارے دکھ پر تمہارا ساتھ دیا۔ آج تم میرے بیٹے کی موت کا مذاق اڑانے والوں کو نہیں روکو گے؟ تم لوگ جانتے ہو میرے بیٹے کو سزائے موت دلوانے میں چوہدری سردار علی کا پورا پورا ہاتھ ہے اور یہ انہی کی وجہ سے موت کے گھاٹ اترا ہے۔ کم از کم چوہدری کو اس تدفین میں شریک نہ ہونے دو، مان سکتے ہو میری بات یا یہاں بھی میری کمزوری کا مذاق اڑواؤ گے۔''

اور بے شمار نوجوان لاٹھیاں لے کر سامنے آ گئے اور انہوں نے چیخ کر کہا کہ اگر چوہدری سردار علی قبرستان کی حدود میں داخل ہوا تو بے شمار لوگ اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

''ارے واہ چلو ٹھیک ہے، میرے جوتے کو کیا غرض پڑی ہے، میں تو نظام دین کو پرسہ دینے آیا تھا۔''

''انتظار کرو چوہدری کہ لوگ تمہیں پرسہ دینے کے لئے دور دور سے آئیں، تمہارے بیٹوں کا، تمہارے اہل خاندان کا، تم سب سے آخر میں مرو گے چوہدری سردار علی، سب سے آخر میں تاکہ کم از کم ایک شخص تو ایسا ہو جسے لوگ پرسہ دینے کے لئے آیا کریں، جاؤ چلے جاؤ۔ بستی کے جوانوں نے اپنے بھائی کے قتل پر غم کا اظہار کیا ہے، چلے جاؤ اس وقت۔''

''ڈیرے پر جا رہا ہوں، آؤ میرے ڈیرے پر آ کر حملہ کرو مجھ پر۔'' چوہدری سردار علی بگڑ گیا اور اس کی جیپ واپس ڈیرے کی جانب چلی گئی۔

احمد دین کی تدفین ہوئی اور تین دن تک بستی کے گھروں میں سوگ منایا گیا۔ خاصی محبت کا مظاہرہ کیا تھا بستی والوں نے۔ تین دن تک بستی کے گھروں میں کھانا نہیں پکا، خود نظام دین کے گھر میں بھی سوگ رہا تھا لیکن ایک انوکھی بات یہ تھی کہ اس گھر سے رونے کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی۔ بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا گیا تھا، اس سلسلے میں شاید نظام دین ہی نے اپنے گھر والوں سے درخواست کی تھی، حسینہ جو نظام دین کی بہو اور احمد دین کی بیوہ تھی، بالکل صابر نظر آ رہی تھی۔ سادہ سے لباس میں ملبوس، اللہ کا نام لیتی ہوئی، اس کے گھر والے بھی آئے تھے اور انہوں نے دلی ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب وہ جانے لگے تو چوہدری نظام دین نے حسینہ سے کہا۔ ''بیٹی میں جانتا ہوں کہ عدت کے دن سسرال ہی میں گزارے جاتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو احمد دین کے بیٹے کو لے کر اپنے گھر جا سکتی ہو۔ نور دین کی پرورش، نور دین کی زندگی تم پر فرض ہے، اسے لے کر اپنے گھر چلی جاؤ۔ عدت کے دن وہیں گزار لینا۔ ہمارے بارے میں تم جانتی ہو کہ ہم لوگ اجتماعی خودکشی کریں گے اور ہماری روحیں چوہدری سردار علی کے خاندان سے انتقام لیں گی۔''

''ہم سب ایک ہیں بابا دو نہیں ہیں، مجھے اسی گھر میں اسی جگہ رہنے دیجئے اور جو فیصلہ آپ سب کے بارے میں کریں وہی میرے بارے میں بھی کیجئے گا۔''

''حسینہ کا باپ انعام اللہ زار و قطار رونے لگا تھا۔ اس کی ماں پچھاڑیں کھانے لگی تھی لیکن حسینہ پر عزم تھی۔

''زندہ رہوں گی تو اس گھر میں رہوں گی اور اماں اگر زندگی باقی نہیں ہے تو بھی میری زندگی کا ہر تار اسی گھر سے منسلک رہے گا، تم لوگ جاؤ، میں بہت خوش ہوں، یہاں کم از کم میرا رابطہ اپنے احمد دین سے تو رہے گا۔''

ماں باپ چلے گئے، حسینہ نے کسی کی بات نہیں مانی تھی بستی کے لوگ نظام دین کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ نظام دین نے احمد دین کے دسویں کی فاتحہ کے بعد اپنی زمین کے گرد چاروں طرف چکر لگایا۔ بستی کے کچھ لوگ اب بھی اس کے ساتھ تھے، جلی ہوئی زمینیں اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ نظام دین نے تین چکر پورے کئے، یہ بہت بڑا کام تھا اور پھر ایک جگہ بیٹھ کر فاتحہ خوانی کرنے لگا۔

بستی کے کچھ بزرگوں نے کہا۔ ''نظام دین، تم سے اب یہ زمینیں نہیں سنبھالی جائیں گی، نوجوان کسانوں سے بات چیت کرو، یہ تمہارا زندگی بھر کا سہارا ہے۔''

نظام دین نے عجیب سی نگاہوں سے اس بزرگ کو دیکھا۔

بستی کے بہت سے لوگوں کو نظام دین کا اخبار میں چھپا ہوا بیان یاد تھا لیکن سب جانتے تھے کہ یہ جذباتی باتیں ہوتی ہیں، خودسوزی کی دھمکیاں اور اس طرح کی باتیں اخبارات میں چھپتی ہی رہتی ہیں، کچھ واقعات اور کچھ بیانات پر عمل ہو بھی جاتا ہے لیکن بہرحال ہر شخص میں یہ ہمت اور یہ جرأت نہیں ہوتی۔

نظام دین گھر واپس چلا گیا تھا اور پھر اس نے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیا، اس کے بعد جو کوئی بھی ملنے آیا اسے دروازہ بند ہی ملا۔

ہاں غالباً تیسرے یا چوتھے دن کی بات ہے کہ بابا شجاع الدین، نظام دین کے گھر کے پاس سے گزرے تو انہیں اندر سے ایک عجیب سی بدبو کا احساس ہوا، یہ بدبو انسانی گوشت کے سڑنے کی بدبو تھی۔ پہلے تو وہ ناک سکوڑ کر بدبو کی سمت کا جائزہ لیتے رہے اور انہیں یہ اندازہ ہو گیا کہ بدبو نظام دین کے گھر سے ہی آ رہی ہے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر نظام دین کے گھر کا دروازہ پیٹنے لگے۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اتنی دیر میں کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ حافظ ابراہیم نے ناک پر کپڑا رکھ کر کہا۔ ''دروازہ توڑ دو حاجی صاحب مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟''

''مولا کرم کرے۔''

مزید کچھ لوگ آ گئے اور سب کی رائے سے آخرکار دروازہ توڑ دیا گیا۔ بدبو تھی کہ اللہ کی پناہ۔ بہت سے لوگ تو باہر نکل گئے لیکن کچھ نے ہمت کی اور چہروں پر ڈھاٹے باندھ کر اندر داخل ہو گئے۔ بڑے کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے ایک روح فرسا منظر دیکھا اور بری طرح لرز کر رہ گئے۔

دروازے سے کچھ فاصلے پر چوہدری نظام دین کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ پرسکون نیند سو رہا تھا، اس کے پیروں کے پاس اس کی بیوی شریفاں سفید چادر اوڑھے زندگی سے محروم لیٹی ہوئی تھی۔ پھر نوجوان بہو حسینہ بیگم اپنے ننھے سے بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے لیٹی نظر آئی اس سے چند گز کے فاصلے پر جمیلہ ایک دوپٹہ اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ بدبو انہی کے جسموں سے اٹھ رہی تھی اور ایک نگاہ دیکھنے سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ اب اس گھر میں زندگی کا کوئی وجود نہیں رہا ہے، بس احمد دین ان کے درمیان موجود نہیں تھا کیونکہ اس کی باقاعدہ تدفین ہوئی تھی۔ دیکھنے والے یہ منظر دیکھ کر لرز گئے۔ بعض کی تو چیخیں نکل گئیں اور وہ چیختے ہوئے باہر بھاگ آئے اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد ساری بستی میں کہرام مچ گیا۔

گڑھی حیدر بیگ میں صدیوں سے اتنا بڑا کوئی المیہ نہیں ہوا تھا، لوگوں کے اندر شدید ہیجان برپا ہو گیا تھا اور ایک عجیب سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی، ساری بستی ایک جگہ جمع ہو گئی۔ نوجوان جوش سے چیخنے لگے تھے۔

''چوہدری سردار علی کی وجہ سے یہ المیہ رونما ہوا ہے، ہم اس کی زمینوں کو آگ لگا دیں گے، ہم اسے اس ڈیرے میں پھر کبھی نہیں داخل ہونے دیں گے، اس کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''کچھ بھی ہوا ہے لیکن نظام دین کو بھی یہ فعل نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ دین خودکشی کی اجازت نہیں دیتا، جب تم کسی سے انتقام نہیں لے سکتے تو تمہارا مالک تمہارا انصاف کرتا ہے اور وہ ظالم کو نقصان پہنچاتا ہے، اسے سزا دیتا ہے اور پھر سارے کے سارے……''

گلاب علی نے روتے ہوئے کہا۔ ''آپ دیکھو تو سہی ملاجی اندر جا کر، سارے کے سارے سو رہے ہیں، پتہ نہیں کیا طریقہ اختیار کیا ہے انہوں نے مرنے کا، ارے وہ ننھا سا نور دین بھی اپنی ماں کی چھاتی سے چپٹا ہوا موت کو گلے لگا چکا ہے۔''

''بڑے غم کی بات ہے بھیا، اب یہ بتاؤ پولیس کو اطلاع دیں پہلے یا ہم خود کچھ کریں۔''

''دیکھو جذباتی ہو کر قانون ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں، لڑکے پکڑے جائیں گے، چوہدری سے دشمنی ہو جائے گی، زمینیں تو ہیں نا اس کی یہاں پر، بندے آتے جاتے رہیں گے اور پھر وہی بات ہے کہ جو کام چوہدری نے کیا ہے، مطلب یہ کہ نظام دین نے، وہی کام تم کرنے جا رہے ہو۔ اس نے بیوی بچوں کے ساتھ خودکشی کر لی ہے، تم زمینیں جلانے جا رہے ہو، قانون سے کھیلنا اچھی بات نہیں ہے۔ تھانے جا کر خبر کرو، قانون خود ہی کوئی نہ کوئی کارروائی کرے گا۔''

چوہدری نظام دین کے گھر سے دو دو سو گز کے فاصلے پر لوگوں نے گھیرا ڈال دیا۔ شدید بدبو کی وجہ سے وہاں جایا نہیں جا سکتا تھا، ایک وفد سیدھا پولیس چوکی پہنچ گیا اور تھانیدار کو خبر کی گئی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم لوگ، سب مر گئے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، خودکشی کرتا تو صرف نظام دین کرتا، تم کہتے ہو کہ سارے کے سارے۔''

''تھانیدار صاحب، ہمارا فرض تھا کہ آپ کو آ کر خبر کریں، آپ لوگ تو ویسے بھی بڑے آدمیوں کے پچھو ہوتے ہو، خبر کر دی ہے آپ کو باقی آپ جانو آپ کا کام۔''

تھانیدار نے نفری تیار کی۔ چھوٹے موٹے اور بھی دوسرے کام کر لئے گئے اور اس کے بعد پولیس چل پڑی۔ ادھر جن لوگوں نے وہاں گھیرا ڈالا ہوا تھا اور بدبو کی وجہ سے اب بھی اپنے چہروں سے کپڑے لپیٹے ہوئے تھے، ان میں سے کچھ لوگوں نے جن کے چہرے کھلے ہوئے تھے ایک عجیب سی بات محسوس کی۔ وہ یہ کہ شدید ترین بدبو اچانک ختم ہو گئی اور پھر یوں لگا جیسے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ گلاب کے پھولوں کی خوشبو فضا میں منتشر ہو رہی ہو۔ کارخانہ قدرت میں ایسے انوکھے واقعات کی ایک پوری تفصیل ملتی ہے جو بے شک عقل کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے لیکن اگر عمل آسمانی ہو تو عقل بے معنی چیز ہو جاتی ہے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ جو کچھ ہوا ہے کیسے ہوا ہے؟

پولیس جب وہاں پہنچی تو واقعی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ دروازہ چونکہ توڑ دیا گیا تھا اس لئے پولیس آفیسر اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا اور اس کے ساتھ کچھ مقامی لوگ بھی، جنہیں تھانیدار نے اپنے ساتھ خصوصی طور پر لے لیا تھا۔ اندر کا ماحول بالکل بدلا ہوا تھا، ہر طرف صفائی ستھرائی تھی۔ اس بڑے کمرے میں جہاں وہ ساری لاشیں دیکھی گئی تھیں اب ان لاشوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ پورا گھر خاموش اور سنسان تھا لیکن اس گھر میں ایک لمحے کے لئے بھی کسی دہشت یا وحشت کا احساس نہیں تھا۔ جو لوگ پہلے ان لاشوں کو دیکھ کر گئے تھے اور جن لوگوں نے شدید بدبو محسوس کی تھی وہ قسمیں کھانے لگے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس وقت وہ سب کچھ نہیں ہے بلکہ یہ تو بہت تعجب کی بات ہے۔

پورے گھر کی تلاشی لی گئی، پولیس نے بہرحال نظام دین اور اس کے اہل خاندان کی غیر موجودگی کا نوٹس لیا تھا اور لوگوں سے کہا تھا کہ ایسے تمام پتے دیئے جائیں جہاں اس خاندان کی موجودگی ممکن ہو سکتی ہو لیکن جو لوگ اپنی آنکھوں سے ان بے جان جسموں کو دیکھ گئے تھے، وہ یہ بات ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ اس طرح لاشیں غائب ہو سکتی ہیں اور انسانی گوشت سڑنے کی بدبو گلاب کے پھولوں کی خوشبو میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ بہرحال پولیس نے ہر طرح کی کوشش کر لی لیکن نظام دین اور اس کے خاندان کا کہیں نام و نشان نہیں ملا تھا۔

نظام دین کی بہو حسینہ بیگم کے گھر والوں سے بھی رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ وہاں بھی کہرام مچ گیا لیکن اس طرف اس خاندان کا کوئی فرد نہیں گیا تھا، حسینہ کے والد انعام صاحب نے روتے ہوئے بتایا کہ ان سے بیٹی کی کیا بات چیت ہوئی تھی۔ ادھر ویسے تو چوہدری سردار علی کے بہت سے ہرکارے اور پٹھو یہاں گڑھی حیدر بیگ میں موجود تھے لیکن جمال دین کو بہت سی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں، چنانچہ وہی شادپور پہنچا تھا اور اس نے اپنی آمد کی اطلاع چوہدری سردار علی کو کرائی تھی۔ سردار علی کے دونوں بیٹے شہر میں اپنا کاروبار کرتے تھے لیکن ان کی بیویاں فردوس جہاں اور فیروزہ بیگم حویلی شادپور میں ہی رہتی تھیں۔ ایک بیٹی غیر شادی شدہ تھی، جس کا نام نور جہاں تھا، دوسری بیٹی کا نام آسیہ بیگم تھا اور وہ بھی ایک زمیندار گھرانے میں بیاہی گئی تھی جو شادپور سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔

چوہدری سردار علی نے جمال دین سے ملاقات کی۔

''ہاں بھئی جمال دین کیا خبر لائے کوئی خاص بات ہے کیا، تمہارا آنا بے مقصد تو نہیں ہو سکتا؟''

''چوہدری صاحب، بہت بڑا حادثہ، بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے گڑھی حیدر بیگ میں۔''

''کیا؟'' چوہدری سردار علی نے پوچھا اور جمال دین نے، نظام دین خاندان کی موت اور اس کے بعد کی ساری تفصیلات چوہدری سردار علی کو بتا دیں۔

کچھ لمحے تک تو چوہدری سردار علی چکرایا ہوا سا رہا۔ اس کے بعد اس نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ ''اوئے جمال دینے، جاہلوں کی بستیوں میں ایسی کہانیاں گردش کرتی ہی رہتی ہیں، مجھے بھی اس لڑکے کی موت کا افسوس ہے لیکن تو اس وقت موجود تھا جب اس نے میرے سامنے آ کر زبان درازی کی تھی۔ اوئے چوہدری سردار علی میں بھی ایک خرابی ہے، کوئی بدتمیزی کرے تو اسے معاف نہیں کرتا۔ یہ ساری کہانی ہے، نظام دین منہ چھپا کر کہیں چلا گیا ہے۔ تھوڑے دن کے بعد واپس آ جائے گا، بیٹے کا غم تو ہو گا ہی خیر اسے، باقی بستی والے ایسی کہانیاں گھڑ ہی لیتے ہیں۔ پہلے تو لاشوں سے بدبو آ رہی تھی اس کے بعد گلاب کے پھولوں کی خوشبو آنی شروع ہو گئی، اویار تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری عقل کام نہیں کرتی، کونسا دور چل رہا ہے، تمہیں پتہ ہے، ٹیلیویژن، انٹرنیٹ، موبائل فون اور اس دور میں تم روحوں کی کہانیاں لے کر پھر رہے ہو، او ٹھیک ہے یار چل اور کچھ کہنا ہے؟''

''نہیں چوہدری صاحب بستی کے لوگ بڑے جذباتی ہو رہے ہیں، بلکہ یہ سچی بات ہے کہ بستی والوں نے نوجوانوں کو روکا تھا، ورنہ وہ تو آپ کی زمینوں کو آگ لگانے جا رہے تھے۔''

''کون کون تھا جمال دین، دو چار نام مجھے بتاؤ، ان کے بھی ذرا دماغ ٹھیک کرا دوں۔''

''چھوڑیں چوہدری صاحب، گاؤں کے ہی بچے ہیں، تو جوان خون جوش مارتا ہے، بچے ہی ایسی باتوں پر بہت زیادہ جذباتی ہو جاتے ہیں۔''

''او میری بات سن، کافی دن تک بیمار رہ چکا ہوں۔ یہ الٹی سیدھی کہانیاں مجھے آئندہ آ کر مت سنانا، کیا سمجھا؟''

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔''

''اور سن، زمینوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے، رحمت خان اور دوسرے لوگوں کو ہوشیار کر دینا، کہنا زمینوں کی پہرے داری سخت کریں، کچھ اور بندوں کو بھی چوکیداری پر لگا دو۔ زمینوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے اور ہاں اس زمین کا کیا حال ہے؟''

''ابھی تو کچھ بھی نہیں ہے چوہدری صاحب۔''

''او میاں میں سوچ رہا ہوں کہ اس کے سلسلے میں قانونی کارروائی کی جائے، دو چار بندوں کو۔ پٹواری کو چکر میں لا کر زمینوں کا سودا کر لیا جائے، اصل میں، میں وہاں باغ لگوانا چاہتا ہوں۔''

''آپ بڑے ہیں چوہدری صاحب، جو آپ کا حکم ہو گا وہ تو ہو کر ہی رہے گا، پر میری رائے ہے کہ تھوڑے دن خاموشی اختیار کر لیں۔''

''ہوں۔'' چوہدری سردار علی پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

☆......☆......☆

بدرالدین کی کہانی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شادپور میں ہی پیدا ہوا تھا۔ باپ اس کی پیدائش کے چند سال کے بعد مر گیا تھا۔ ماں اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔ اس وقت ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا تو ماں مر گئی۔ چنانچہ ''ڈاکٹر صاحب'' تنہا رہ گئے۔ ماں کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا، اس لئے گھر میں دل نہ لگا نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے رہے۔ ایک دن شادپور ریلوے اسٹیشن کے بینچ پر لیٹے اپنے مستقبل پر غور کر رہے تھے کہ کچھ قلیوں نے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا اور کہا کہ بلا لے لے اور قلی بن جا...... تنہا زندگی جیسے بھی گزر جائے۔ چنانچہ بدرالدین بدرو قلی بن گیا۔ سادہ سی زندگی کوئی مشکل ہی نہیں۔ پھر ایک انوکھی رات آئی۔ سارا دن موسم ابر آلود رہا تھا ایک دو بار بوندا باندی بھی ہوئی تھی اور قلیوں نے ایک طرح سے بارش کا جشن منایا تھا۔ ٹرینوں کے اوقات مقرر تھے، رات کو چار بجے بھی ایک ٹرین آتی تھی۔ ابتدا میں تو بدرو کو شور و غل سے کافی پریشانی ہوئی تھی لیکن پھر اس طرح عادی ہوا کہ اگر ٹرین راستہ بھٹک کر اس کی بینچ تک بھی آ جاتی تو آنکھ نہ کھلتی۔

اس رات بھی جب چار بجے والی ٹرین شادپور ریلوے اسٹیشن پر رکی تو وہ معمول کے مطابق سوتا ہی رہا تھا۔ البتہ قلی بننے کے بعد ایک احساس ایک ایسا شعور جاگتا رہتا تھا جس کا نیند سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کوئی یقین کرے یا نہ کرے بدرالدین کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ چار بجے ہیں اور وہ ٹرین آنے والی ہو گی۔ اس دن بھی بدرالدین سوتا ہی رہا تھا، ٹرین آئی اور اس کے شعور نے اسے اس کا احساس دلایا۔ لیکن اس وقت وہ چونک پڑا جب ایک آواز اس کے کانوں کے پاس سے گزری۔

اس نے چونک کر نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھول دیں اور اسے اپنے سامنے صرف دو آنکھیں نظر آئیں۔ دو روشن اور چمکدار آنکھیں، ایسی خوبصورت آنکھیں جنہیں رات کی اس تاریکی میں بھی اگر دیکھ لیا جائے تو زندگی بھر فراموش نہ کیا جا سکے۔ ان آنکھوں میں ایک ایسی چمک، ایک ایسی روشنی تھی جسے الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں تھا۔ ایک لمحے تک وہ نیند بھری نگاہوں سے ان آنکھوں کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد گھبرا کر اٹھ گیا۔

وہ ایک برقع پوش عورت تھی اس نے اپنے چہرے پر نقاب لپیٹا ہوا تھا۔ اس لئے صرف اس کی آنکھیں ہی بدرالدین کو نظر آئی تھیں۔ باقی جسم سیاہ برقعے میں چھپا ہوا تھا۔ بدرالدین کو اس عالم میں بھی صرف ایک احساس ہوا کہ ان دو آنکھوں کے سوا دنیا میں اور کچھ نہیں ہے لیکن جب حواس جاگے تو وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہکلائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جج...... جی، مم...... مجھ سے، کک...... کوئی کام ہے۔''

آنکھیں عجیب سے انداز میں بدرالدین کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر ایک لمحے کے اندر بدرالدین نے ان کا رنگ بدلتے ہوئے دیکھا، کچھ لمحوں بعد اسے ایک انتہائی مترنم آواز ابھری۔ ''معاف کیجئے گا میں نے آپ کو سوتے سے جگایا ہے لیکن آپ کا جاگنا بے حد ضروری تھا۔''

''جی فرمائیے۔ کوئی بات نہیں ہے۔'' بدرالدین نے کہا۔

''رات آدھی سے زیادہ گزر گئی ہے اور باہر کوئی ایسی سواری نہیں ہے جس سے میں اپنا یہ سفر مکمل کر سکوں۔ میں نے مسافر خانے میں سوتے ہوئے دوسرے قلیوں کو بھی دیکھا ہے، سب گہری نیند سو رہے ہیں، بس آپ ہی میری ایک آواز پر جاگ گئے، براہ کرم میری مدد کیجئے میں تنہا ہوں۔''

بدرالدین جھرجھری سی لے کر رہ گیا، نہ جانے کیوں اس کے بدن میں سرد لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ ایک عجیب سا احساس تھا، ممکن ہے یہ احساس نیند سے جاگنے کی وجہ سے اور اچانک ہی پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے دل میں بیدار ہو گیا ہو، بہرحال اب اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

''کیا آپ چار بجے والی ٹرین سے آئی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں اور ٹرین گئے ہوئے بھی اچھا خاصا وقت گزر گیا ہے، پریشان پھر رہی ہوں۔''

''جانا کہاں ہے آپ کو؟''

''حویلی سردار علی۔'' اس نے جواب دیا۔

کوئی اجنبی جگہ نہیں تھی، چوہدری سردار علی بہت بڑے زمیندار تھے اور بڑی مشہور شخصیت کے مالک۔ شادپور میں ان کی کافی جائیدادیں بھی تھیں، تقریباً سبھی لوگ انہیں جانتے تھے، بدرالدین نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ ان خاتون کو وہاں تک پہنچانے کا کیا بندوبست کرے۔ اچانک ہی اسے چاچا رحمت علی یاد آئے۔ چاچا رحمت علی یہیں تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے۔ ریلوے کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر ان کا اپنا تھا۔

تانگہ چلاتے تھے، ویسے وہ اس وقت سو رہے ہوں گے، لیکن غریب آدمی تھے اور اچھے آدمی تھے، اگر ان سے کسی مشکل کا اظہار کیا جائے تو منع نہیں کریں گے۔

''آپ کے ساتھ کوئی سامان ہے؟'' بدرالدین نے پوچھا۔

''ایں...... سامان...... نہیں سامان تو نہیں ہے۔''

''چلئے خیر آیئے میں کوشش کرتا ہوں۔'' بدرالدین نے کہا اور ان خاتون کے ساتھ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔

پھر تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے آخر کار وہ رحمت علی چاچا کے کوارٹر کے سامنے پہنچ گیا۔ معمول کے مطابق رحمت علی چاچا کوارٹر کے باہر ہی سو رہے تھے، تھوڑے فاصلے پر تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ ان کے ہوشیار گھوڑے نے ناک سے کھرکھر کی آواز نکالی اور پھر اچانک ہی زور سے ہنہنایا۔ پتہ نہیں قدموں کی چاپ نے اسے ہوشیار کر دیا تھا۔ یا پھر وہ ڈر گیا تھا لیکن اس کی آواز سے رحمت علی چاچا بھی جاگ گئے اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ''کیا بات ہے، کون ہے؟ کیا ہوا؟''

''چاچا جی میں بدرو ہوں۔'' بدرالدین نے کہا۔

''کون بدرو؟'' رحمت علی چاچا بدستور نیند کے عالم میں تھے۔

''ارے آپ کا بدرو قلی۔''

''ارے کیا بات ہو گئی، یہ کون ہے؟''

''مسافر ہیں رحمت چاچا، بیچاری چار بجے والی ریل سے آئی ہیں۔ انہیں حویلی سردار علی جانا ہے۔ عورت ذات ہیں، نظر انداز نہیں کر سکتے، بیچاری پریشان ہیں، مجبوراً میں نے آپ کو جگایا ہے۔''

''تو اچھا کیا نا بیٹا! کسی کی مدد کرنا تو اچھی بات ہوتی ہے۔ میں ذرا منہ پر پانی کے چند چھینٹے مار لوں۔ ابھی تیار ہو کر آیا تم ایسا کرو ذرا تانگہ سیدھا کر لو، یہ گھوڑا کیوں چیخ رہا ہے۔ اسے ہاتھ مت لگانا، رات میں مزاج بگڑ گیا ہو گا اس کا۔''

رحمت علی چاچا بڑبڑاتے ہوئے نلکے سے منہ دھونے لگے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد تانگہ اور گھوڑا جوڑ لیا اس دوران وہ برقع پوش لڑکی ایک طرف جا کر کھڑی ہو گئی تھی لیکن گھوڑے کا مزاج کچھ زیادہ ہی بگڑا ہوا تھا، قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا، بڑی مشکل سے رحمت علی چاچا نے اسے تانگے میں جوتا اور پھر اچانک ہی لڑکی کی آواز ابھری۔

''تمہارا نام بدرو ہے، ابھی تم نے یہی نام انہیں بتایا تھا۔''

''ہاں جی بدرالدین۔''

''بدرالدین کیا تم میرے ساتھ حویلی تک چلنا پسند کرو گے؟''

''آپ کے ساتھ۔''

''ہاں ویسے تو کوئی بات نہیں ہے لیکن اگر تم چلو گے تو......''

''نہیں جی معافی چاہتا ہوں، ویسے آپ چاچا رحمت علی پر پورا پورا بھروسہ کر سکتی ہیں، بہت اچھے آدمی ہیں یہ۔'' بدرالدین نے جواب دیا، اس کے بعد لڑکی کی کوئی آواز نہیں سنائی دی اور وہ خاموشی سے تانگے میں جا بیٹھی۔

پھر رحمت علی نے تانگہ ہانک دیا اور بدرالدین واپس اپنی بینچ پر آ کر لیٹ گیا، لیکن نیند اڑ گئی تھی۔ اس رات نہ جانے کیوں وہ بہت دیر تک اپنے بارے میں سوچتا رہا۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہ گیا ہوں میں۔ میری کوئی اوقات کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، بینچ پر زندگی گزر رہی ہے، جو صدمہ دل و دماغ پر بیٹھا ہوا ہے ماں کی موت کا، اسے دور کرنے میں ہی زندگی گزار دی ہے، بہت سوگ منا چکا، ماں جیسی ہستی اس کائنات میں دوبارہ کبھی نہیں مل سکتی لیکن جو چلا جاتا ہے اسے واپس لانا بھی بس میں نہیں ہوتا تو پھر انسان کو صبر ہی کرنا پڑتا ہے۔ میرے لئے بھی صبر ضروری ہے۔ بھلا اس طرح اپنے آپ کو ایک ناکارہ اور بے بس انسان سمجھ کر اس بینچ پر زندگی تو نہیں گزاری جا سکتی اور اس سوچ کی وجہ تلاش کرنے میں بھی اسے کوئی دقت نہیں پیش آئی، وہ خوبصورت آنکھیں، وہ حسین آنکھیں اس کے حواس پر مسلط ہو گئی تھیں۔ ایسی حسین آنکھوں کی قربت، ایسی حسین آنکھوں کا حصول، ایسی کسی شخصیت کا اپنے پاس موجود ہونا جس کا لہجہ اس قدر مترنم ہو، جس کا انداز اس طرح حسین ہو، کیا یہ کسی انسان کی آرزو یا طلب نہیں ہو سکتی، شاید اسی آرزو اسی طلب نے اس کے ذہن میں یہ احساس پیدا کیا تھا کہ ایک عملی انسان بننے کے لئے اس بینچ کو چھوڑ کر عمل کی دنیا میں نکلنا ہو گا یہ بہت ہی ضروری ہے۔ پھر نہ جانے کب آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح کو جب جاگا تو رات کے واقعات ذہن سے محو ہو چکے تھے اور اس کے بعد وہی دنیا، ریلوے اسٹیشن کا ہلکا پھلکا ہنگامہ اور بس اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ البتہ دوپہر کو اس نے ایک برقع پوش عورت کو دیکھا تو اسے گزری رات یاد آ گئی۔ اسے ایک دم احساس ہوا کہ ذہن پر ایک ہلکا سا بوجھ ہے، اس بوجھ کو وہ کوئی نام تو نہیں دے سکتا تھا۔

پھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ ٹہلتا ہوا باہر نکل آیا، چاچا رحمت اپنے تانگے کی پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ وہ ٹہلتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو چاچا رحمت نے اسے آواز دی۔ ''ارے بدرو، ادھر آ، بات سن۔''

چاچا رحمت ایک دم مستعد ہو کر بیٹھ گئے تھے، بدرالدین ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے چاچا رحمت کو سلام کیا تو چاچا رحمت نے کہا۔ ''کسی کام سے جا رہا ہے بھئی؟''

''نہیں چاچا، بس ایسے ہی باہر نکل آیا تھا۔''

''ارے بیٹھ ذرا، رات کی بات بتاؤں تجھے۔''

''رات کی بات؟''

''ہاں۔''

''کوئی خاص بات ہو گئی کیا چاچا رات کو؟''

''وہ جو بی بی آئی تھی نا جسے تم نے ہمارے تانگے میں بٹھا کر حویلی سردار علی پہنچانے کو کہا تھا۔''

''ہاں پھر۔''

''ایک بات بتا بدرو، ہم تو بڑے پھیر میں ہیں۔''

''ارے...... کیا ہوا چاچا رحمت؟''

''دیکھ بدرو، پہلی بات تو یہ ہے کہ رات کو چار بجے والی گاڑی سے یہاں اس اسٹیشن پر ایک اکیلی عورت اتری، جو برقعے میں لپٹی ہوئی تھی۔ کوئی بھی عورت رات کو چار بجے کسی اسٹیشن پر اکیلی نہیں اترتی، کوئی نہ کوئی مرد تو اس کے ساتھ ہوتا، پھر یہ ہمت کہ تمہیں جگایا اور اس کے بعد ہمیں جگایا گیا۔ چلو ساری باتیں مان لیتے ہیں ہم۔ شہر کی عورتیں تو خیر تیز ہوتی ہیں پر ایک بات بڑی عجیب تھی، ہمارا جو یہ گھوڑا ہے نا، سچی بات یہ ہے کہ یہ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے اور ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ بے شک بڑا شریر ہے، پر اس وقت ایسا بگڑ رہا تھا کہ ہمیں خود حیرت ہوئی۔ پھر تم تو واپس چلے گئے تھے، مگر یہ ایسا کودتا اور اچھلتا رہا تھا جیسے بڑا ہی ڈرا ہوا ہو، یہ تو ہم نے مان لیا کہ رات کے وقت اسے سوتے سے جگا کر ہم نے تانگے میں جوتا تھا، پر ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے، اس نے ایسی حرکتیں کبھی بھی نہیں کیں۔''

''تو پھر چاچا رحمت، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' بدرو نے پوچھا۔

''گھوڑا ڈر رہا تھا بدرو۔''

''ڈر رہا تھا؟''

''ہاں۔''

''تو پھر اس میں ایسی کیا خاص بات ہو گئی؟''

''ہوئی ہے نا بات۔''

''کیا؟''

''بھیا، یہ جو جناور ہوویں ہیں نا، ان میں مالک نے ایک خاص قوت رکھی ہوتی ہے، بھوتوں اور پریتوں کو پہچاننے کی قوت۔''

''کیا؟'' بدرو نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھیا زبان کھول کر کہنے سے کبھی کبھی زبان بھی باہر نکال لی جاتی ہے، پر تم سے کہہ رہے ہیں کسی اور سے تو نہیں، ہمیں تو کچھ گڑبڑ لگی تھی۔''

''کیسی گڑبڑ چاچا رحمت، کچھ بتایئے تو سہی؟'' بدرالدین کو بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

''بھیا لگتا تھا کوئی بھتنی تھی وہ؟'' رحمت نے کہا اور بدرالدین ہنس پڑا۔

''نہ بھیا نہ...... مسوست تم، ہمارا تجربہ تم سے بہت زیادہ ہے۔''

''چاچا رحمت ایک بات بتاؤ؟''

''ہاں بولو۔''

''آپ نے پہلے کبھی بھتنی دیکھی ہے؟''

''دیکھی ہے نا، جب ہی تو کہہ رہے ہیں۔''

''اچھا دیکھی ہے، کہاں ذرا بتائیں مجھے؟'' بدرالدین نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ارے ایک بار ہم کہیں جانے کے لئے نکلے تھے، کیا بتائیں تمہیں، سسرال جا رہے تھے۔ گھر والی گئی ہوئی تھی میکے، بڑی یاد آ رہی تھی، جہاں ہماری گھر والی کا میکہ تھا وہاں رستے میں برگد کا ایک پیڑ پڑتا تھا۔ ہمارے سسر نے کئی بار ہمیں بتایا تھا کہ اس برگد پر چڑیل رہتی ہے، ہم نے کبھی چڑیل نہیں دیکھی تھی، ہم نے سوچا کہ لوگ قصے کہانیاں سناتے ہیں، ایسی ہی کہانی اس چڑیل کی بھی ہو گی۔ پر ہمیں اس سے کیا، تو بھیا جا رہے تھے ہم اپنی سسرال مگر ہو گئی رات، ہم نے سوچا کہ تھوڑا سا فاصلہ تو رہ ہی گیا ہے چلو چلتے ہیں، اس وقت تانگہ نہیں تھا ہمارے پاس، پیدل ہی جا رہے تھے، برگد کے درخت کے نیچے پہنچے تو وہاں ہم نے ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا، لہنگا پہنے ہوئے تھی، چمکدار کپڑے تھے۔ اس کے کپڑوں میں شیشے لگے ہوئے تھے اور اوپر سے نکلا ہوا تھا چاند، یہ ہاتھ بھر لمبا گھونگھٹ نکالے ہوئے تھی، ہم تو بھیا اسے دیکھ کر حیران رہ گئے، ہمدردی میں اس کے پاس پہنچے تو ہم نے کہا کہ کاہے کو یہاں بیٹھی ہو، تمہیں چوروں اور ڈاکوؤں کا ڈر نہیں ہے کیا۔ اتنا سارا زیور بھی پہنا ہوا ہے۔ آخر یہاں کیوں بیٹھی ہو، تو بھیا اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

ہم نے حیرت سے کہا۔ ''ہمارے ساتھ۔''

''ہاں۔'' وہ بولی۔

''تو پھر۔'' بدرالدین نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''ہم نے اس سے پوچھا کہ بھر جائی جاؤ گی کہاں، تو وہ بولی تمہارے ساتھ۔ اب تو ہم حیران رہ گئے، ہم نے سوچا جا رہے ہیں بیوی کے میکے، اگر ہم اسے اپنے ساتھ لے گئے اور کسی نے دیکھ لیا تو اپنے سالے ہی اتنے لٹھ باز ہیں کہ مار مار کر کھوپڑی توڑ دیں گے۔ ہم نے اس کے ہاتھ جوڑے اور کہا بی بی ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے، یہ کہہ کر ہم آگے بڑھے تو بھیا۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ پیروں میں جھانجھن پہنے ہوئے تھی اور وہ بج رہی تھیں۔ چھن چھن چھن چھن۔ بڑی عجیب سی لگی ہمیں اس کی چال۔ ہم رک گئے اور ہم نے اسے سمجھایا کہ ہم تجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ وہ ہنسنے لگی اور بولی۔ ''گھونگھٹ تو الٹ دو ہمارا، اس کے بعد منع نہیں کرو گے، جائیں گے تمہارے ساتھ۔''

''اب بات تو بڑی عجیب تھی اس سے جان چھڑانا بھی تھی۔ لے بھیا ہم نے گھونگھٹ الٹ دیا، پتہ ہے کیا دیکھا۔''

''کیا دیکھا؟'' بدرو نے دلچسپی سے پوچھا۔

''سوکھی ہوئی کھوپڑی، لمبے لمبے دانت، زبان باہر نکلی ہوئی، آنکھوں کی جگہ دو سفید گولے۔ ارے بھیا ایسے بھاگے ہم تو ایسے بھاگے کہ سسرال کے دروازے پر جا کر ہی دم لیا، پھر پتہ ہے اس کے بعد کیا ہوا؟''

''مجھے کیا معلوم رحمت چاچا۔''

''کئی دن بے ہوش رہے تھے، بخار میں تپتے رہے تھے اور نہ جانے کیا کیا بکتے رہے تھے، سارے حکیم وید ہمارے پاس اکٹھے کر دیئے گئے تھے تو ایسے دیکھی تھی ہم نے چڑیل۔''

''مگر اس عورت کو آپ نے غور سے دیکھا تھا؟''

''نہیں غور سے تو نہیں دیکھا تھا پر گھوڑا جس طرح پریشان ہو رہا تھا اس سے ہمیں یہ خیال آیا کہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی اور پھر سب سے بڑی بات تو تمہیں بتانی ہی رہ گئی۔''

''وہ کیا؟''

''وہ حویلی کے سامنے والے حصے میں نہیں اتری تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہیں پتہ ہے نا کہ حویلی کے سامنے والے حصے میں چوکیدار ہوا کرتے ہیں، پیچھے پرانی حویلی ضرور دیکھی ہو گی تم نے، جواب ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر رہ گئی ہے۔''

''ہاں تو پھر۔''

''پرانی حویلی پر اتری تھی وہ۔''

''کھنڈر میں؟'' بدرو نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''مگر وہ کیسے؟''

''جب ہم بھیا حویلی پہنچے تو وہاں بالکل خاموشی طاری تھی، ظاہر ہے سونے کا ٹائم تھا۔ ہم نے کہا بی بی اگر کہو تو اتر کر دروازہ بجائیں تو وہ بولی کہ نہیں یہاں نہیں اترنا پیچھے کی طرف چلو، ہمیں حیرت ہوئی تھی لیکن پھر بھی ہم نے اسے پیچھے اتار دیا۔''

''پھر۔''

''پیسے دیئے اس نے ہمیں اور اس کے بعد ٹوٹی حویلی میں چلی گئی۔''

''مگر ٹوٹی حویلی کا تو کوئی دروازہ ہی نہیں ہے اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں۔'' بدرالدین کو حویلی کے آس پاس کے بارے میں پوری طرح معلومات حاصل تھیں۔

''اسی پر تو حیرت ہوئی تھی اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس کے بعد بھیا چلے آئے واپسی میں گھوڑا ٹھیک تھا اور اب تک ٹھیک ہے، پر تھی کوئی گڑبڑ ضرور۔''

''ویسے تو خیر کوئی بات نہیں ہے لیکن یہ واقعی تعجب کی بات ہے کہ وہ ٹوٹی ہوئی حویلی میں داخل ہوئی تھی اور جہاں تک چاچا رحمت علی اس کے چڑیل ہونے کا سوال ہے تو میرا دل تو خیر نہیں مانتا، پہلی بات تو یہ کہ شہر سے آئی تھی، ریل سے اتری تھی، تانگے میں بیٹھ کر حویلی گئی تھی۔ تمہیں پیسے دیئے تھے اور پھر تم نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں، وہ آنکھیں چاچا بڑی خوبصورت تھیں، آپ یقین کرو بہت ہی خوبصورت، اتنی خوبصورت آنکھیں میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔''

''ہوں گی، ہوں گی بھیا...... ہم تو ایسے ہی کہہ رہے تھے بس یونہی ہمارے دل میں خیال آ گیا۔ ہم نے سوچا کہ تم سے بات کریں، چلو چھوڑو، ہو گی کوئی، اب ہم کیا کریں۔'' چاچا رحمت علی نے کہا لیکن بدرالدین سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

کیا چڑیلیں ایسی ہو سکتی ہیں، مگر اس نے کبھی چڑیلیں دیکھی نہیں تھیں جو ان کے بارے میں کچھ معلومات ہوتیں۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ ایک عجیب سا احساس ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اس نے کہا تھا کہ بدرالدین تم میرے ساتھ چلو، کیا مجھے بھی وہ ٹوٹی حویلی میں ہی لے جاتی۔ کیا ہوتا اور کیسے ہوتا بدرالدین سوچ میں ڈوب گیا تھا، ایک خلش اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اسے رہ رہ کر وہ حسین آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

چوہدری سردار علی اپنی حویلی میں بالکل پرسکون تھا، جو واقعات گزرے تھے انہوں نے اسے تھوڑے دن تک پریشان ضرور رکھا تھا لیکن اس طرح کے لوگوں کے دل بھی کالے ہو جاتے ہیں اور کالے دلوں میں کسی طرح کا دکھ درد زیادہ دیر نہیں رہتا، چنانچہ چوہدری سردار علی ہی نہیں اس کے گھر کے لوگ جو ان تمام باتوں سے واقف تھے، گزرے ہوئے واقعات بھول چکے تھے۔

معمولات زندگی جاری تھے، چوہدری کئی مہینے بیمار رہا تھا، غذاؤں وغیرہ سے اس نے صحت تو حاصل کر لی تھی لیکن اب بھی اس کے لئے باقاعدگی سے کھانے پینے کی اشیاء آیا کرتی تھیں۔ خاص طور سے رات کو دودھ کا استعمال تو لازمی ہوا کرتا تھا۔ ملازمہ آخری چیز اسے دودھ کے گلاس کی صورت میں دیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی چوہدری سردار علی اپنے بیڈروم میں ایک آرام کرسی پر دراز کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دودھ آنے کا وقت تھا۔ دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور اس کے بعد ملازمہ دودھ کا گلاس لئے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

چوہدری سردار علی نے ایک گہری سانس لے کر کتاب رکھی اور بولا۔ ''کبھی کبھی زندگی کے معمولات بھی کتنے برے لگتے ہیں اب جیسے یہ دودھ۔'' اس نے نگاہیں اٹھا کر ملازمہ کو دیکھا دوسرے لمحے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

(جاری ہے)

خوف

ایم اے راحت | قسط : 3

کتاب پڑھنے کی وجہ سے کمرے میں تیز روشنی تھی اور اس تیز روشنی میں اس نے جو چہرہ دیکھا تھا وہ کسی طور کسی ملازمہ کا چہرہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک انتہائی سلیقے کے لباس میں ملبوس۔ بہت ہی صاف ستھرے اور شگفتہ چہرہ والی لڑکی تھی جس کی خوبصورت آنکھیں چاند کی طرح چمک رہی تھیں۔ چوہدری سردار علی نے اپنی حویلی میں اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور پھر وہ بھی اس انداز میں۔ لڑکی باادب تھی۔ اس نے دودھ کا گلاس چوہدری صاحب کی کرسی کے برابر چھوٹی میز پر رکھا۔ گلاس سرپوش سے ڈھکا ہوا تھا۔ چوہدری سردار علی نے خود کو سنبھالا اور بولے۔ "تم کون ہو بیٹی، میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"پہلی بار ہی آئی ہوں چوہدری صاحب۔" لڑکی کی مترنم آواز ابھری۔

"نوکر رکھا گیا ہے تمہیں یہاں؟"

"نہیں اپنے دکھوں کی ماری ہوں، اپنی ضرورت سے یہاں آئی ہوں۔"

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟" چوہدری حیرانی سے بولا۔

"کچھ قرضے ہیں ہمارے چوہدری صاحب آپ پر، بابا صاحب نے کہا کہ بیٹا، اپنے اپنے قرضے اپنے آپ وصول کرو اور انتخاب کرلو کہ کس سے قرضہ وصول کرنا ہے۔ ہم اسی لئے یہاں آئے ہیں چوہدری صاحب۔ اب دو دن سے حویلی والوں کو بغور دیکھ رہی ہوں، اپنا شکار چن رہی ہوں، ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ کسے اپنا شکار بناؤں لیکن میرے خیال میں میری عمر کی آپ کی چھوٹی بیٹی ہے، کیا نام ہے اس کا نور جہاں، بس وہ ٹھیک رہے گی۔"

چوہدری سردار علی کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آیا تھا، البتہ لڑکی کے انداز میں انہوں نے کچھ عجیب سی بات محسوس کی تھی، پھر انہوں نے کہا۔ "میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات بھی نہیں آئی۔"

"سمجھا دیتی ہوں چوہدری صاحب، میں نظام الدین کی بیٹی جمیلہ ہوں زرعی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ ایک مستقبل سوچا تھا میں نے اپنا مگر آپ نے ہم سے زندگی ہی چھین لی۔ اب چوہدری صاحب، ہم اپنا بدلہ لینے کے لئے سرگرداں ہیں۔ بابا نے کہا ہے کہ بھائی اپنا اپنا شکار خود چن لو، دیکھیں کیا ہوتا ہے اور ہاں ایک کام ضرور کریں۔ یہ دودھ نہ پئیں اس میں چھپکلی پڑی ہوئی ہے۔ چلتی ہوں۔" وہ واپسی کے لئے مڑی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

چوہدری سردار علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتا رہا اور پھر اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دروازے کے پاس جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر طویل راہداری سنسان پڑی ہوئی تھی۔ کسی کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ چوہدری سردار علی کے بدن کے سارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

نہ جانے کیا سوچ کر وہ واپس پلٹا۔ دودھ کے گلاس سے سرپوش ہٹایا تو اس میں کالے رنگ کی ایک چھپکلی تیر رہی تھی۔ چوہدری کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی زوردار تھی۔ رات کے سناٹے میں یہ چیخ دور دور تک سنی گئی تھی اور اس بھیانک چیخ کو سن کر سبھی جاگ گئے تھے۔ چوہدری سردار علی چیخیں مارتا ہوا دروازے سے باہر نکل آیا۔

"کیا ہوا اباجی، کیا ہوگیا۔ کیا ہوگیا؟"

فردوس جہاں، فیروزہ بیگم، نور جہاں اور آسیہ سب کے سب باہر نکل آئے تھے۔ حیدر علی اور صفدر علی اس وقت شاہ پور میں موجود نہیں تھے۔

سردار علی کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا، وہ بولنے کی کوشش کررہا تھا لیکن بول نہیں پا رہا تھا۔ پھر سردار علی کو دوسرے کمرے میں لے جاکر بٹھایا گیا۔ پانی پلایا گیا۔ کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی، وہ بول ہی نہیں پا رہے تھے، خوف سے ان کا برا حال تھا، پھر انہوں نے بمشکل تمام خود پر قابو پایا اور بولے۔ "وہ...... وہ لڑکی...... تم نے اسے دیکھا، نظام الدین کی بیٹی جمیلہ، وہ...... وہ، میرا مطلب ہے وہ میرے کمرے میں آئی تھی۔"

"نظام الدین کی بیٹی جمیلہ آپ کے کمرے میں آئی تھی۔" سردار علی کی ایک بہو فردوس جہاں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں وہی...... وہی۔ میرے کمرے میں دودھ لے کر آئی تھی اور...... اور اس دودھ میں چھپکلی تیر رہی تھی، کالی چھپکلی۔"

سب لوگ سردار علی کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے اچانک ہی ان کا ذہنی توازن خراب ہوگیا ہو۔

"آپ آرام سے بیٹھئے اباجی، کوئی خواب دیکھ لیا ہے شاید آپ نے۔"

"دیکھو فضول باتیں مت کرو مجھ سے، میں اس قدر بوڑھا آدمی نہیں ہوں کہ خوابوں سے ڈر کر اس طرح دہشت زدہ ہوجاؤں، چلو میرے کمرے میں چلو میں تمہیں دکھاؤں کہ دودھ میں چھپکلی ہے یا نہیں اور وہ لڑکی میرے کمرے میں آئی تھی یا نہیں۔ آؤ میرے کمرے میں آؤ۔" سردار علی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تقریباً سبھی افراد اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سردار علی کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے خوفزدہ ہو رہا تھا، چنانچہ اس کی دوسری بیٹی نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔

"وہ دیکھو، دودھ......" مگر سردار علی کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا کیونکہ دودھ کا گلاس وہاں موجود نہیں تھا۔ سردار علی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر آنکھیں بند کرکے اپنے بستر کی جانب بڑھ گیا اور بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"قسم کھاتا ہوں، میں یہاں بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا، بڑی خوبصورت سی لڑکی تھی، بڑے ادب سے اس نے دودھ کا گلاس رکھا اور پھر مجھ سے اپنا تعارف کراتی ہوئی بولی کہ وہ نظام الدین کی بیٹی جمیلہ ہے اور ہم لوگوں سے اپنی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ نور، نور......" سردار علی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور سب اس کے آگے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

"نور کیا مطلب نور؟"

"کچھ نہیں۔" سردار علی گہری سانس لے کر بولے۔ "ہوسکتا ہے واقعی میرے ذہن پر کوئی برا اثر ہوگیا ہو، اب میں کیا کروں؟"

"اباجی اگر آپ چاہیں تو ہم میں سے کسی کے بھی کمرے میں سو جائیں، آپ کو یقیناً کچھ وہم سا ہوگیا ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو، میں اپنے کمرے میں سو جاؤں گا، بے فکر رہو تم لوگ، جو کچھ ہوگیا، مگر تم یقین کرو وہ دودھ کا گلاس لے کر آئی تھی، سب کچھ ہوش و حواس کے عالم میں ہوا تھا، خدا جانے یہ سب کچھ کیا ہے؟"

کافی دیر تک سردار علی کے اہل خاندان اس کے پاس بیٹھے رہے، رات کافی ہوگئی تھی، وہ سب اس کی دلجوئی کرتے رہے لیکن سردار علی کے سینے پر بڑا بوجھ طاری تھا، اس کے ذہن میں لڑکی کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے، یہ بات بھی اس کے علم میں آچکی تھی کہ نظام دین نے مرنے سے پہلے بیان دیا تھا کہ اس کے گھر کا بچہ بچہ چوہدری سردار علی کے اہل خاندان سے انتقام لے گا، کیا واقعی ایسا ہوسکتا ہے۔

دوسری صبح وہ تقریباً بیماروں جیسی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ گھر کے لوگ اس کی کیفیت دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "دیکھو ایک کام کرو، صفدر اور حیدر کو شہر سے بلوالو، کہنا کچھ بات کرنی ہے ان سے۔"

"فون کئے دیتی ہوں۔" حیدر علی کی بیوی نے کہا۔

چوہدری سردار علی اپنے آپ کو سنبھالتا رہا تھا، کئی بار وہ اپنے کمرے میں اس کرسی پر بیٹھ کر دروازے کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کررہا تھا کہ رات کو جو کچھ ہوا ہے وہ ایک وہم یا خواب تھا۔

پھر جب ملازمہ دودھ لے کر آئی تو وہ دہشت سے اچھل پڑا۔ اس نے غور سے ملازمہ کو دیکھا لیکن یہ وہی ملازمہ تھی جو روزانہ اس کے لئے دودھ لاتی تھی۔

"سن، پچھلی رات تو دودھ کیوں نہیں لائی تھی۔"

"سچ بتاؤں صاب جی؟" ملازمہ نے کہا۔

سردار علی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ "تو کیا تو جھوٹ بھی بولے گی میرے سامنے؟"

"نہیں مالک، پر بات ہی ایسی ہے، کیا بتاؤں آپ کو؟"

"کیا بات ہے؟" سردار علی کو اپنے بدن میں ایک سنسنی کا سا احساس ہوا۔ ملازمہ رازداری سے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ پھر اس نے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند کیا اور اس کے بعد واپس پلٹی، سردار علی اس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ملازمہ ایسی کون سی راز کی بات بتانا چاہتی ہے لیکن جب وہ پلٹی تو سردار علی کی سانس دہشت سے بند ہوگئی۔ یہ ملازمہ نہیں وہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ اور حلیہ دونوں بدل گئے تھے۔ وہ دو قدم واپسی کے لئے آگے بڑھی، پھر اپنی جگہ رک کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "دودھ تو آج بھی میں ہی لائی ہوں چوہدری صاحب، پر آپ کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس دودھ میں بھی چھپکلی پڑی ہوئی ہے لیکن آپ کو مارنا میری ذمہ داری نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے اپنے شکار بانٹ لئے ہیں، میں نے تو آپ کی بیٹی نور جہاں کا انتخاب کیا ہے۔ آخر کار وہ ماری جائے گی میرے ہاتھ سے، کب ماری جائے گی یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔ آپ اسے کہیں بھی بھجوادیں میں اسے ماردوں گی۔"

سردار علی کا سانس دہشت سے بند تھا، آواز حلق میں گھٹ گئی تھی۔ لڑکی نے مزید کہا۔ "میرے بابا نے اخبارات کو بھی بیان دیا تھا، آپ بھول گئے شاید، چلیں ٹھیک ہے، آپ سے ملاقات کرتی رہوں گی، چاہے آپ کچھ بھی کہیں اور کچھ بھی کریں، لیکن جو بویا ہے وہ تو آپ کو کاٹنا ہی پڑے گا، دودھ بالکل نہ پئیں، چھپکلیاں زہریلی ہوتی ہیں اور میرا کام آپ کو مارنا نہیں ہے۔ ہاں اپنے آبائی قبرستان میں اپنی بیٹی کے لئے قبر ضرور تیار کرالیں۔ اس کی زندگی کے بہت ہی تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔" وہ واپس پلٹی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

چوہدری کے پورے جسم کی جان ہی نکل گئی تھی۔ اب یہ تو خواب نہیں ہے۔ میں جاگ رہا ہوں۔ کیا کروں کیا نہ کروں، بہت دیر تک وہ سناٹے کے عالم میں اپنی جگہ لیٹا رہا۔ چیخ پکار کرکے اپنے گھر والوں کو جمع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ یہ سب کچھ خواب ہے یا حقیقت، وہ بمشکل تمام اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر نکل آیا۔ دروازے سے باہر نکل کر چند ہی قدم چلا تھا کہ اسے ملازمہ نظر آئی جو دودھ کا گلاس ہاتھ میں لئے ادھر آرہی تھی، اسے دیکھ کر چوہدری ایک دم سہم گیا لیکن پھر اس نے ملازمہ کی شکل پہچان لی تھی۔ وہ کھڑا ہوگیا، ملازمہ جلدی سے اس کے پاس پہنچ گئی۔

"دودھ لائے ہیں صاب جی۔"

"اندر آ۔" چوہدری سردار علی نے کہا اور ملازمہ ڈرے ڈرے سے انداز میں اندر داخل ہوگئی۔ چوہدری نے پلٹ کر دیکھا، جس جگہ لڑکی نے دودھ کا گلاس رکھا تھا وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ چوہدری رک کر اس جگہ کا جائزہ لینے لگا لیکن وہاں ایسا کوئی نشان بھی نہیں تھا جس سے یہ اندازہ ہو کہ یہاں کچھ لمحے پہلا گلاس رکھا گیا ہے۔

"کل تو دودھ نہیں لائی تھی میرے لئے؟"

"نہیں صاب جی کل میں بیمار ہوگئی تھی، میں نے فیروزہ بی بی کو بتادیا تھا صاب جی، معافی چاہتی ہوں۔"

چوہدری سردار علی ملازمہ کے جانے کے بعد سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

دوسرے دن حیدر اور صفدر آگئے۔ چوہدری سردار علی انہیں اپنے کمرے میں لے گیا۔

"خیریت اباجی، کیا بات ہے؟" حیدر علی نے باپ سے پوچھا۔

"یار تم لوگ جانتے ہو زندگی میں کبھی کسی سے نہیں ڈرا۔ شیروں کی طرح جیا ہوں لیکن اب اعصاب کمزور ہوگئے ہیں۔ حالات خوفزدہ کردیتے ہیں۔ پہلے تمہیں یہ بتادوں کہ جو کچھ تمہیں بتانے جارہا ہوں وہ خواب، دیوانگی یا اعصاب کی کمزوری ہرگز نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا ہے وہ پورے ہوش و حواس میں دیکھا اور سنا ہے۔ اب میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔" چوہدری نے انہیں پوری کہانی سنادی۔

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد صفدر علی نے کہا۔ "ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں اباجی اس میں ایسی کہانیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس دور کا انسان، بھوت پریتوں اور بدروحوں سے کہیں زیادہ خوفناک ہے۔ آپ سوچیں، بڑے بڑے لوگ اپنے حریفوں کو کرائے کے قاتلوں سے قتل کرادیتے ہیں۔ خودکش حملے سیکڑوں بے گناہوں کو موت کی نیند سلادیتے ہیں، ان مرنے والوں کی روحیں تو کسی سے انتقام نہیں لے پاتیں۔"

"وہی بات۔ تم مجھے پاگل سمجھتے ہو۔" چوہدری سردار علی نے بگڑ کر کہا۔

"نہیں اباجی...... یہ نفسیاتی خوف ہے جو ان لوگوں کے اخباری بیان کے بعد آپ کے دل میں بیٹھ گیا ہے۔"

"اوئے صفدر علی۔ تو کچھ زیادہ ماڈرن نہیں بن رہا۔"

"آپ حکم دیں اباجی، کیا کریں؟"

"حکم ہی دینا ہوتا تو کسی کو بھی دے سکتا تھا۔ مشورہ مانگ رہا ہوں۔"

"اس نے نور جہاں کو اپنا شکار منتخب کیا ہے؟" حیدر علی نے پوچھا۔

"ہاں صاف لفظوں میں کہا ہے۔"

"تو ہم اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔ شہر میں رکھیں گے۔"

"او یہ حل ہے اس بات کا؟"

"ٹھیک ہے کچھ اور سوچتے ہیں۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ کچھ نہ کچھ حل نکل ہی آئے گا۔" حیدر علی نے کہا۔

☆......☆......☆

بدرالدین بیچارہ زندگی میں پہلی بار ایک عجیب سی کشمکش کا شکار ہوا تھا۔ ماں کی موت کے بعد ایک طرح سے اس نے زندگی سے کنارہ کشی کرلی تھی۔ کوئی آگے پیچھے تھا نہیں جس کے بارے میں سوچ کر اپنے آپ کو عمل کی دنیا میں لاتا۔ قلیوں کے درمیان رہ رہا تھا، بس زندگی گزر رہی تھی لیکن اس رات جو کچھ ہوا تھا اس نے اس کے وجود میں ایک ہلچل سی مچادی تھی۔ اس کے ذہن پر وہ لمحے نقش ہوکر رہ گئے تھے۔ ویسے تو بہت بار ایسا ہوا تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر آنے والی سواریوں میں اچھی شکل و صورت کی لڑکیاں بھی ہوتی تھیں جن سے اس کی تھوڑی بہت بات چیت بھی ہوجاتی تھی۔

یوں بدرالدین کی شکل و صورت بھی بہت اچھی تھی اور قلی کے روپ میں بھی وہ خاصا اچھا لگتا تھا، کوئی بھی اسے دیکھ کر دوسری بار ضرور دیکھتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ یہ شخص شکل و صورت سے تو قلی نہیں لگتا بلکہ کسی اچھے خاندان کا فرد معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال اس رات نیند سے جاگا تھا۔ نیند سے جاگنے کے بعد اگر ذہن تھوڑا بہت نیند میں ڈوبا ہوا ہو تو کچھ زیادہ ہی متاثر ہوجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس لڑکی سے وہ نیند کے عالم میں ہی متاثر ہوا ہو۔ اس کے چہرے پر نقاب لپٹا ہوا تھا لیکن وہ آنکھیں، وہ آنکھیں اس کائنات کی تفسیر معلوم ہوتی تھیں، اس قدر خوبصورت آنکھیں کہ لگتا تھا دنیا ان میں سمائی ہوئی ہو اور پھر وہ آواز "معاف کیجئے گا میں نے آپ کو سوتے سے جگایا ہے لیکن آپ کا جاگنا بے حد ضروری تھا۔" وہ آواز کیسی انوکھی آواز تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سونے کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ "تمہارا نام بدرو ہے، ابھی تم نے یہی بتایا تھا، بدرالدین کیا تم میرے ساتھ حویلی تک چلنا پسند کروگے، ویسے تو کوئی بات نہیں ہے لیکن اگر تم چلوگے تو۔"

اسے افسوس ہونے لگا تھا، اس نے اسے ساتھ جانے کے لئے منع کیوں کردیا۔ کسی نے زندگی میں پہلی بار کوئی فرمائش کی تھی، یہ فرمائش کس حوالے سے کی گئی تھی اور پھر بعد میں رحمت چچا کی باتیں، مجھے تو وہ کوئی بھٹکی بھٹکی نہیں ہرگز نہیں۔ بھٹکی اتنی حسین تو نہیں ہوتی۔ وہ ٹوٹی حویلی میں اتری تھی۔

ٹوٹی حویلی، اچانک ہی بدرالدین کے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا، اگر میں اسے ٹوٹی حویلی میں تلاش کروں تو وہ مجھے مل سکتی ہے۔ اس نے سوچا تھا اور پھر اس کے سارے وجود پر ایک سحر سا طاری ہوگیا، حالانکہ دو تین دن گزر چکے تھے لیکن ان دو تین دنوں میں ایک لمحے بھی وہ اسے نہیں بھول سکا تھا اور اسے یاد کرتا رہتا تھا۔ رات کو بینچ پر لیٹ کر نہ جانے کتنی کتنی دیر تک وہ اس کے تصور میں ڈوبا رہتا تھا۔ وہ ٹرین جس سے وہ اتری تھی۔ اس وقت وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ وہ پھر ٹرین سے اترے، آج بھی ایسی ہی کیفیت اس پر سوار تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر مستقل سناٹا طاری تھا۔ قلی جانتے تھے کہ اب دیر تک کوئی ٹرین نہیں آئے گی، چنانچہ وہ بھی ادھر ادھر جا گھسے تھے۔ ویسے بھی اس وقت ایک آدھ ہی قلی اسٹیشن پر رہ جاتا تھا کیونکہ وہ اتنی بڑی جگہ نہیں تھی جہاں زیادہ مسافر آتے۔ کم ہی لوگ یہاں اترا کرتے تھے، جانے والے بھی نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے۔

اس کے دل میں یہ خواہش شدت سے ابھرنے لگی کہ وہ ٹوٹی حویلی میں جاکر دیکھے، اگر وہ بھٹکی ہی ہے تو ہوسکتا ہے ٹوٹی حویلی میں اس نے اپنا مستقل قیام رکھا ہو۔ اسے ایک افسوس سا ہونے لگا، اس نے ایسی بات کیوں سوچی، وہ بھٹکی نہیں ہوسکتی۔ پھر اس سے نہ رہا گیا اور وہ اپنا سرخ کوٹ اتار کر بینچ کے نیچے رکھ کر چل پڑا۔ اب وہ قمیص شلوار میں ملبوس تھا۔

ٹوٹی حویلی تک کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا، تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑی حویلی کے سامنے پہنچ گیا، بڑی حویلی میں مستقل سناٹا طاری تھا، یہاں سے گھوم کر وہ ٹوٹی حویلی پہنچا۔ ٹوٹی حویلی بے شک ایک کھنڈر کی شکل رکھتی تھی، لیکن اس کے نام کے ساتھ کوئی ایسی کیفیت وابستہ نہیں تھی جس کی وجہ سے وہاں جاکر کسی کو خوف کا احساس ہو۔

اس وقت بھی وہ مدھم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آسمان پر ستارے چمکے ہوئے تھے، چاند بے شک نہیں نکلا تھا لیکن ستاروں کی مدھم روشنی نے ماحول کو نمایاں کر رکھا تھا، دور دور تک کوئی آہٹ نہیں تھی، وہ اپنی حماقت پر لعنت بھیجنے لگا، اگر وہ بھٹکی بھی ہے تو جیسے مجھ سے ملنے کے لئے بیتاب ہو رہی ہوگی۔ وہ اپنا ہی مذاق اڑانے لگا اور پھر پتھر کی ایک سل پر بیٹھ گیا۔

یہاں سے نئی حویلی کا عقبی حصہ نظر آتا تھا، جس میں کہیں کہیں مدھم روشنیاں چمک رہی تھیں۔ اچانک ہی اسے کسی چیز کے چلنے کا احساس ہوا اور وہ اچھل پڑا۔ سرخ اینٹیں تھرتھرائی تھیں۔ اس کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں جدھر یہ آہٹ ہوئی تھی، تب اس نے اس حسین وجود کو دیکھا، ایک خوبصورت جسم، ایک سادہ سے لباس میں ملبوس اسی کی جانب چلا آرہا تھا اور وہ چہرہ۔ آہ کس قدر خوبصورت چہرہ تھا وہ۔

چہرے سے تو اس کی شناسائی نہیں تھی لیکن وہ آنکھیں، وہ حسین آنکھیں جن میں ایک دنیا سمائی ہوئی تھی، تاریکی میں بھی روشن نظر آرہی تھیں۔ بدرالدین کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ اسی کی طرف آرہی تھی، پھر وہ اس کے بالکل سامنے پہنچ گئی۔ اس کے روشن چہرے پر ایک حسین مسکراہٹ تھی۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا، تم بدرالدین ہو نا......" بدرالدین کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔

"اس دن بھی تم مجھے اچھے لگے تھے، آؤ بیٹھ جاؤ۔"

بدرالدین اس طرح بیٹھ گیا جیسے اس کے پیروں کی جان نکل گئی ہو، اس پر سحر سا طاری تھا۔ لڑکی اس سے کوئی تین چار فٹ کے فاصلے پر اینٹوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گئی۔

"بدرالدین میرا نام جمیلہ ہے۔" اس نے کہا۔

"آپ...... جی آپ۔ معاف کیجئے گا۔"

"تم یہاں کیوں آئے ہو بدرالدین؟"

"وہ دیکھئے، آپ میری بات کا بالکل برا نہیں مانیں گی، رحمت چاچا نے بتایا تھا کہ آپ ٹوٹی حویلی پر اترتی ہیں۔ بس یونہی میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں آپ اب بھی یہیں موجود نہ ہوں۔ دیکھئے جی بات اصل میں یہ ہے......"

"پریشان نہ ہو بدرالدین، میں نے ابھی تم سے کہا تھا کہ تم بھی مجھے اچھے لگے تھے، میں نے اسی لئے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ آؤ بدرالدین مجھے حویلی تک چھوڑ آؤ، بس یونہی میرا دل چاہا تھا کہ تمہارے ساتھ بیٹھوں، تم سے باتیں کروں۔"

"میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں جمیلہ صاحبہ؟"

"ہاں کیوں نہیں، ویسے تمہارا لہجہ بتاتا ہے کہ تم پڑھے لکھے ہو۔"

"زیادہ نہیں، انٹر کیا تھا میں نے، اس کے بعد نہیں پڑھا۔"

"قلی کیوں بنے ہوئے ہو؟"

"وجہ ہے اس کی۔"

"باتیں کروگے مجھ سے؟"

"ہاں جی! دل تو یہی چاہتا ہے، آپ ہی کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔" بدرالدین نے جواب دیا اور جمیلہ نے سر جھکا لیا۔ اس کے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے اور وہ اس قدر حسین نظر آرہی تھی کہ بدرالدین کا دل چاہ رہا تھا کہ آنکھیں بند کرکے سو جائے۔ اتنے حسین وجود کو دیکھنے کے بعد اور اس کی طرف سے پرالتفات باتیں سننے کے بعد دنیا میں کچھ اور کرنے کو دل نہیں چاہ سکتا تھا، اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور بولی۔ "تم نے بتایا نہیں کہ قلی کیوں بنے؟"

"ماں تھی بس ایک، پڑھانا چاہتی تھی، محنت مزدوری کرکے تعلیم دلا رہی تھی، انٹر کا رزلٹ نکلا، خوشی خوشی گھر آیا تو پتہ چلا کہ ماں جاچکی ہے، سوچا کہ ماں کی آرزو ہی پوری نہ ہوسکی تو اب کیا کروں گا زندگی کی فضولیات میں پڑ کر۔ بس یونہی ریلوے اسٹیشن پر آنکلا تھا۔ ان قلیوں میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بے لوث اور بے غرض، جبکہ دنیا بڑی عجیب اور مطلبی سی ہے، انہی کے مشورے پر بلا لے لیا، بس زندگی گزر رہی ہے۔"

وہ خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھی رہی پھر اس نے کہا۔ "زندگی اتنی بے وقعت تو نہیں ہے بدرالدین کہ اسے یوں بینچوں پر گزار دیا جائے، میں کیا کہوں تم سے، سوچنا ضرور اپنے بارے میں، اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرو۔"

بدرالدین نے گردن اٹھائی اسے دیکھا اور بولا۔ "بس، جمیلہ صاحبہ! کیا کہیں، دیکھیں آگے کا وقت کیا کہتا ہے، آپ بھی تو اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔"

اس نے بدرالدین کی آنکھوں میں دیکھا اور یہ ایسے لمحات تھے کہ بدرالدین خود ہی اپنا سوال بھول گیا، وہ بولی۔ "بتادوں گی وقت آنے پر بتادوں گی۔"

"ایک عجیب بات بتاؤں آپ کو، رحمت چچا آپ سے ڈر گئے تھے، بس بیچارے سیدھے سادے آدمی ہیں نجانے کیا سمجھے تھے وہ آپ کو۔"

"بھوت سمجھے ہوں گے جو حویلی میں بلکہ ٹوٹی حویلی میں آگھسا ہے۔"

"ویسے یہ بات تو سوچنے کی ہے کہ آپ ٹوٹی حویلی میں کیوں نظر آرہی ہیں؟"

"بس بدرالدین میں نے کہا نا تمہیں بتادوں گی بعد میں، ایک کام تھا ذرا چوہدری صاحب سے، اس کے سلسلے میں یہاں آئی تھی، تم بہت اچھے انسان ہو بدرالدین، بس اور کیا کہوں۔"

"آپ میرے یہاں آنے سے ناراض تو نہیں ہوئیں؟" بدرالدین نے سوال کیا۔

"یہ حویلی میری ملکیت تو نہیں ہے۔ چلو اب جاؤ، میں بھی چلتی ہوں۔"

"کل پھر آؤں؟" بدرالدین نے سوال کیا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر بدرالدین کو دیکھا کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "ٹھیک ہے آجانا لیکن احتیاط سے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" بدرالدین نے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو بدر الدین نے ڈرتے ڈرتے اس کے پیروں پر نگاہ ڈالی۔ رحمت علی چچا نے بتایا تھا کہ چڑیل کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں لیکن جمیلہ کے پاؤں تو سیدھے تھے، اس نے ان میں بہت خوبصورت چپلیں بھی پہنی ہوئی تھیں اور ان چپلوں میں اس کے سفید پاؤں اتنے حسین نظر آرہے تھے کہ بدر الدین کا دل چاہا کہ انہیں چوم لے۔

جمیلہ واپس چل پڑی۔ وہ ٹوٹی حویلی کے اندرونی حصے کی جانب جا رہی تھی لیکن بدر الدین کے دماغ میں اس وقت سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں ختم ہو چکی تھیں۔ ورنہ سوچتا ضرور کہ چوہدری سردار علی کی یہ مہمان اس ٹوٹی حویلی کے اس مخدوش حصے کی طرف کیوں جا رہی ہے جبکہ اصولی طور پر اسے چوہدری سردار علی کی حویلی میں ہونا چاہئے تھا۔ اس وقت اس کے ذہن پر اس کی مترنم آواز، اس کے خوبصورت نقوش اور اس کی حسین آنکھیں گردش کر رہی تھیں۔

حویلی سے اسٹیشن تک کا فاصلہ کس طرح طے ہوا، پتہ بھی نہیں چل سکا۔ وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کوئی قلی ریلوے پلیٹ فارم پر موجود نہیں تھا۔ اپنی بینچ پر لیٹ کر وہ چشم تصور سے اس کا حسین سراپا دیکھنے لگا۔ اس سے ہونے والی گفتگو یاد کرنے لگا۔ کتنا نرم، کتنا میٹھا لہجہ تھا اس کا۔ کیسی اپنائیت سے بات کر رہی تھی۔ اس کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''زندگی اتنی بے وقعت تو نہیں ہے بدر الدین کہ اسے یوں بینچوں پر گزار دیا جائے، سوچنا ضرور اپنے بارے میں، اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرو۔''

کیوں آخر کیوں؟ یہ جملے اس نے کیوں کہے، کیا اس کے دل میں بھی بدر الدین کے لئے کوئی مقام پیدا ہو چکا ہے، کیا ایسا ممکن ہے لیکن وہ ہے کون؟ ساری رات وہ اسے خوابوں میں دیکھتا رہا، نجانے کس کس روپ میں، پھر دن کاٹنا مشکل ہو گیا، رات کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ بس یہ آرزو تھی کہ جلدی سے رات ہو جائے۔

نجانے کتنے جتن کے بعد رات ہوئی اور وہ بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کا وقت بھی کس طرح جان کا عذاب بن جاتا ہے، اس کا اندازہ اسے آج کی پوری رات ہوا تھا۔

حویلی کی طرف جاتے ہوئے اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ کہیں یہ عذاب زندگی کا روگ ہی نہ بن جائے۔ آخر وہ ہے کون، ٹوٹی حویلی کا راز کیا ہے، وہ ٹوٹی حویلی میں کیوں اندر گئی تھی؟ حویلی کو اس نے اندر سے نہیں دیکھا تھا، کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ جب وہ چوہدری سردار علی کی مہمان ہے تو پھر ٹوٹی حویلی سے اس کا کیا واسطہ۔ کئی بار ذہن میں رحمت علی چچا کے الفاظ ابھرے لیکن پچھلی رات کا تجربہ بھی ایسا نہیں تھا جس سے یہ احساس ہوتا کہ وہ کوئی پراسرار شخصیت ہے۔

بہر حال سفر طے ہوا اور وہ حویلی پہنچ گیا۔ دل میں ایک لگن تھی ورنہ اسے کیا پڑی تھی کہ کسی خوفناک جگہ گھستا پھرتا اور اپنی زندگی خطرے میں ڈالتا۔ طبیعت میں ایک جولانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے ملنے کا تصور بڑا دلکش لگ رہا تھا۔

نئی حویلی میں ابھی زندگی دوڑ رہی تھی۔ روشنیاں نظر آرہی تھیں، سامنے کے حصے میں کچھ لوگ بھی موجود تھے۔ بہر حال وہ پرانی حویلی میں داخل ہو گیا۔ پچھلی رات اتنا اندر تک نہیں آیا تھا۔ اس نے لڑکی کو اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا چنانچہ وہ اسی راستے سے آگے بڑھ گیا، آگے کی صورت حال ذرا مختلف تھی، کہیں کہیں چھتیں ستونوں پر سائبان بنائے ہوئے تھیں، لیکن ان میں بھی سوراخ تھے۔ اینٹوں کے ڈھیر بہت وسیع علاقے میں پڑے ہوئے تھے۔ حویلی کی اینٹوں سے گزر کر وہ اندر داخل ہو گیا۔

ستارے بدستور ماحول کو ایک پراسرار روشنی دے رہے تھے، اس کے دل میں پہلی بار ایک کپکپاہٹ کا احساس ہوا تو اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے سوچا کہ انسان دنیا سے کتنی بھی لاتعلقی کا اظہار کرے لیکن اگر دل میں خوف کا بسیرا ہو تو اس کا مطلب ہے کہ جینے کی آرزو سینے میں پل رہی ہے۔ حادثے ذہنی طور پر نجانے کیسے کیسے احساسات میں مبتلا کر دیتے ہیں لیکن آخر کار زندہ رہنے کی آرزو دل میں پیدا ہو ہی جاتی ہے، تنہا زندگی میں انسان اپنے آپ کو کتنا ہی مطمئن سمجھ لے لیکن ایک محرومی کا احساس ہمیشہ رہتا ہے، یہ سوچیں اس کے ذہن کو زندگی دے رہی تھیں۔

جگہ جگہ حویلی کی اینٹیں پیروں کے وزن سے نیچے ہو جاتیں اور توازن سنبھالنا پڑتا، چھتوں کے سائبان بھی بڑے مخدوش تھے، ذرا سی آواز پر بھی اوپر سے مٹی جھڑنے لگتی تھی لیکن بعض جگہیں مضبوط بھی تھیں، کہیں کہیں برجیاں بھی بنی ہوئی تھیں، ایک بار اینٹوں سے اس کا پاؤں پھسلا تو انتہائی بھیانک آوازیں ابھریں اور ایک لمحے کے لئے دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے لاتعداد پراسرار روحیں اچانک ہی لپک پڑی ہوں، اس نے سہمی ہوئی نگاہیں چاروں طرف ڈالیں اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ یہ کبوتر تھے جنہوں نے وہاں بسیرا کیا ہوا تھا اور اس وقت اس کی مداخلت سے چونک کر بھاگ نکلے تھے۔ کبوتروں کی تھوڑی تھوڑی تعداد وہاں موجود تھی، اس نے دل ہی دل میں ان سے معذرت کی، دیواروں میں کچھ ایسے خلا بنے ہوئے تھے جن میں کبوتروں نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ بیچارے میری وجہ سے پریشان ہوئے اس نے سوچا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

نجانے کیسے کیسے راستے سے گزر رہا تھا وہ لیکن ابھی تک لڑکی کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آیا تھا۔ کوئی بیس منٹ تک وہ حویلی کے مختلف حصوں میں چکراتا رہا۔ پھر اچانک ہی ایک احساس نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اب تک حویلی کے ماحول اور اپنے خیالات پر غور کرتے ہوئے وہ اس بات کو بھول گیا تھا لیکن اب جو غور کیا تو اسے فوراً ہی یہ احساس ہو گیا کہ حویلی میں کوئی پراسرار بات ضرور ہے۔ بے شک اس کی آہٹ پر کبوتر اڑے تھے لیکن کبوتروں کے اڑنے سے اینٹیں نہیں کھسکتیں۔ اپنے قدموں کی آواز کے علاوہ ایک آواز اسے مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ بالکل ایسی ہی آواز جو خود اس کے قدموں سے پیدا ہو رہی تھی۔

اس نے تو اب تک یہی سمجھا تھا کہ کیونکہ اس کے پیروں کے نیچے آ کر اینٹیں کھسک رہی ہیں اور یہ اسی کے قدموں کی آواز ہے لیکن اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اور آواز بھی ہے جو اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ اس احساس نے بدن میں سرد لہریں دوڑا دیں۔ ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا تو اسے ایک انسانی جسم نظر آیا۔

ایک بار پھر اس کے بدن میں شدید کپکپاہٹ دوڑ گئی تھی۔ اس نے اس انسانی جسم کو دیکھا اور پھر اچانک ہی اس کی نگاہ اس چہرے اور ان آنکھوں پر پڑی، یہ آنکھیں جو زندگی سے بھرپور تھیں، اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''کیا تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی تھیں جمیلہ؟''

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور پھر اس کے حلق سے ہنسی کی آواز نکل گئی۔ ''کیوں خیریت، اس میں ڈرانے کی کیا بات تھی؟''

''میں تو بہت دیر سے اس کھنڈر میں بھٹک رہا ہوں، تم نظر نہیں آئیں۔''

وہ ایک دم ہنس پڑی، اس کی ہنسی بھی اتنی ہی حسین تھی جتنی اس کی آنکھیں۔

''آؤ۔'' اس نے کہا اور وہ اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے وہ ایک صاف ستھری جگہ پہنچ گئی۔ جہاں پتھر کی ایک چوڑی سِل نظر آرہی تھی۔

''بیٹھو۔''

وہ بیٹھ گیا، سارا خوف دور ہو گیا تھا اور دل پر ایک خوشی کا تصور چھا گیا تھا۔

''ہاں اب بتاؤ کیوں ڈر رہے تھے؟''

''یہ حویلی خاصی پراسرار ہے اور سب سے زیادہ تعجب مجھے اس بات پر ہے کہ تم اگر چوہدری سردار علی کی مہمان ہو تو پھر اس ٹوٹی حویلی میں کیا کر رہی ہو۔ ویسے بڑی ہمت کی لڑکی ہو تم کہ یہاں تمہیں خوف نہیں محسوس ہوتا۔''

اچانک ہی اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے ویرانی سی پھیل گئی، اس نے گردن جھکالی اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے؟''

''نہیں...... بس ایسے ہی۔''

''جمیلہ، میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایک افسردگی سی تھی۔

''کیوں کیا بات ہے، مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی؟''

''بتادوں گی۔'' اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''کب، تم مجھے مسلسل ٹال رہی ہو؟''

''دیکھو، زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نہ جاننا بہتر ہوتا ہے۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اپنے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں، تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، بتادو مجھے۔''

''تھوڑا سا وقت اور دے دو، بتادوں گی۔'' اس نے بدستور افسردہ لہجے میں کہا اور بدر الدین خاموش ہو گیا۔

''بدر الدین تم نے میری بات پر غور کیا؟''

''کون سی بات پر؟''

''یہی کہ زندگی اس طرح کھونے کی چیز نہیں ہے، اپنے آپ کو سنبھال کر زندگی سے سمجھوتہ کرو اور اپنے لئے مقام پیدا کرو۔''

''جمیلہ، انسان زندگی میں ہمیشہ کسی اپنے کی تلاش میں رہتا ہے، مجھے کوئی اپنا ملے تو سہی، میں زندگی کو زندگی سمجھ لوں گا ورنہ تنہا زندگی کوئی چیز نہیں ہوتی۔''

وہ بہت کم بول رہی تھی، کافی دیر تک وہ وہاں بیٹھی رہی اور پھر اچانک ہی چاند نکلنے لگا تو اس نے کہا۔ ''بس جاؤ اور سنو، کل دو بجے میں خود تمہارے پاس اسٹیشن آؤں گی۔''

''نہیں میں یہیں آجاؤں گا۔''

''مجھے وہاں آنا ہے، کل دو بجے میرا انتظار کرنا، میں اسی بینچ پر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔'' وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر بولی۔ ''چاندنی روشنی میں تمہارے پاس بیٹھنا ایک مشکل کام ہوگا، براہ کرم محسوس نہ کرنا۔'' وہ چلی گئی۔

بدر الدین وہیں بیٹھا رہ گیا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ آنکھوں میں حسرت سی بیدار ہو گئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ کاش وہ نہ جاتی۔ کاش کوئی ایسی سبیل ہو جاتی کہ اس کی قربت ہمیشہ کے لئے حاصل ہو جائے۔

''یہی کہ زندگی اس طرح کھونے کی چیز نہیں ہے اپنے آپ کو سنبھال کر زندگی سے سمجھوتہ کرو۔'' کیا کہنا چاہتی ہے وہ۔ اس سے کہوں کہ اگر وہ میری زندگی کی تنہائی دور کر دے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔

''کل رات کو دو بجے میں تمہارے پاس اسٹیشن آؤں گی۔''

''اسٹیشن۔'' بدر الدین نے سوچا۔ ٹھیک ہے آؤ۔ کل میں اپنا دل تمہارے سامنے کھول دوں گا۔

☆......☆......☆

باپ کی تسلی کے لئے وہ آدھی رات تک حویلی میں گھومتے رہے تھے۔ پوری حویلی کا جائزہ لیا تھا۔ پھر حیدر علی کی بیوی فردوس نے اپنے بیڈروم کا دروازہ کھول کر کہا تھا۔

''سنئے! ایک بات سنیں گے آپ؟'' اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

حیدر علی جلدی سے بھائی سے معذرت کر کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

''یہ چوکیداری کیوں ہو رہی ہے۔'' فردوس جہاں نے پوچھا۔

''ارے وہی چکر ہے۔ تمہیں معلوم ہے اباجی۔'' حیدر علی نے ہکلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''حیدر علی اب زیادتی کی حد ہو گئی ہے۔ ویسے ہی ہفتوں میں تمہاری شکل نظر آتی ہے اور آتے بھی ہو تو انہی جھگڑوں میں پڑے رہتے ہو۔ ہماری بھی کوئی جگہ ہے اس گھر میں۔''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں۔'' حیدر علی نے جلدی سے کہا۔ پھر صفدر علی کو بھی آرام کی ہدایت دے کر وہ کمرے میں آگیا تھا لیکن دوسری صبح وہ معمول کے مطابق ناشتے کی میز پر ملے تھے۔ تب حیدر علی نے صفدر علی سے پوچھا۔ ''رات خیریت سے گزر گئی، کوئی بات تو نہیں ہوئی، اباجی کے کمرے کی طرف گئے تھے۔''

''ہاں جاگ رہے ہیں۔ چائے پی چکے ہیں، پرسکون ہیں۔'' صفدر علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

حیدر علی چونک کر اسے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ''کیوں خیریت، کیا بات ہے؟''

''بس بھائی، انسان وہم کا پتلا ہے، بڑے سے بڑا واقعہ گزر جائے کوئی بات دل میں نہیں آتی اور کوئی چھوٹی سی بات بڑا وہم بن جاتی ہے۔ پہلے تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا لیکن اب تھوڑے دن پہلے کی ایک بات میرے دل میں بری طرح کھٹک رہی ہے۔''

''کیا؟'' حیدر علی نے پوچھا۔

''اس رات میں کافی دیر سے گھر واپس پلٹا تھا، فتح علی روڈ پر گاڑی چلاتے ہوئے ایک بندے نے سڑک کراس کی۔ بڑے غلط طریقے سے وہ بیچ سڑک پر آگیا تھا۔ اگر میں پورے بریک نہ لگاتا تو وہ یقیناً سڑک کے بیچوں بیچ کار کی زد میں آجاتا۔ بہر حال میں نے بریک لگا کر کار روک لی اور اسے برا بھلا کہنے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ خونی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا اور پھر اس کی آواز ابھری۔ ''فکر مت کرو جلد ہی تم سے ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ سڑک کے دوسری طرف چلا گیا۔ اسمارٹ سا جوان آدمی تھا، پہلے تو اس کے نقوش میرے ذہن میں ہی نہیں آئے۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے گاڑی چلانے پر کچھ برا بھلا کہتا اس کے الفاظ میرے لئے حیران کن تھے، بہر حال میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ سڑک کے دوسری طرف دکانوں کی آڑ میں گم ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک اس کے نقوش میرے ذہن میں چکراتے رہے، پھر میں بھول گیا۔ تم سے بھی تذکرہ نہیں کیا لیکن رات کو نجانے کیوں مجھے وہ یاد آگیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کی شکل بھی یاد آگئی، جانتے ہو اس کی شکل کس سے ملتی تھی۔''

''چلو تم بھی کوئی کہانی سنا دو، یار میں کہتا ہوں کہ ہم سب کو ہو کیا گیا ہے۔''

''میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا اور نہ ہی میں فضول باتیں کر کے گھر کی فضا کو کسی طرح پریشانی میں مبتلا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ احمد دین تھا۔ نظام دین کا بیٹا احمد دین...... میں نے مقدمے کے دوران حال ہی میں اسے دیکھا تھا، ورنہ گڑھی حیدر بیگ میں تو کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، تم یقین کرو حیدر بھائی اس کے بعد سے ایک عجیب سی خلش دل میں بیدار ہو گئی ہے۔''

''میرے باپ، خدا کے لئے کسی نئی کہانی کو جنم نہ دو، اباجی کا حال ویسے ہی خراب ہے، کہیں کچھ اور گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

لیکن گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اچانک ہی ایک طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ دونوں نے چونک کر یہ آوازیں سنیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آئے۔ ایک ملازم اور ایک ملازمہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے اور تیزی سے حویلی کے آخری حصے کی جانب سے دوڑتے ہوئے کوریڈور میں آرہے تھے۔ ان کی دہشت ناک آوازیں سن سن کر سب نے کمروں سے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں کی حالت کافی خراب تھی۔ ملازمہ نے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل زمین پر آرہی، ملازم نے اسے اٹھانے کی بجائے اپنی دوڑ جاری رکھی اور پھر لمحوں کے بعد وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔

''صاب جی، صاب جی، صاب جی۔'' اس کی دہشت ناک آواز ابھری۔ اس کا چہرہ انتہائی خوف کا شکار ہو رہا تھا۔

حیدر علی نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا اور بولا۔ ''کیا بات ہے کریم، کیا ہو گیا؟''

''ادھر ادھر صاب جی ادھر......'' ملازم کریم خاں نے ہاتھ سے حویلی کے آخری کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ملازمہ بھی اٹھ کر گھٹنے پکڑے روتی ہوئی آگے آرہی تھی۔

''صاب جی، نوری، نور جہاں بی بی، صاب جی نور جہاں بی بی۔'' ملازمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ منہ خوف سے ٹیڑھا ہو رہا تھا۔

نور جہاں کا نام سن کر حیدر علی اور صفدر علی دہشت زدہ ہو گئے، صفدر نے آگے بڑھ کر نوکر کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کریم بتاؤ کیا ہوا ہے؟''

''خون صاب جی قتل قتل......'' اس نے پھر اس طرف اشارہ کیا اور حیدر علی اور صفدر علی نے حویلی کے پچھلے حصے میں دوڑ لگادی۔

ملازمہ کے تو گھٹنوں میں چوٹ لگی ہوئی تھی لیکن ملازم کریم اور باقی دوسرے لوگ جنہوں نے کچھ آوازیں سنی تھیں دوڑتے ہوئے اس طرف جانے لگے، کریم نے ایک پرانے کمرے کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ''ادھر صاب جی ادھر، وہ والا کمرہ، چھوٹا کمرہ۔''

ایک چھوٹا کمرہ حویلی کے آخری حصے میں تھا اور اس کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ خالی پڑا رہتا تھا۔ اس میں کوئی فرنیچر نہیں تھا، یہاں تک کہ چھت میں پنکھا بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ اسی کمرے میں وہ دہشت ناک منظر ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ نور جہاں ہی تھی۔ اس کے دونوں

پاؤں رسی میں بندھے ہوئے تھے اور وہ ایک کنڈے سے الٹی لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے بال زمین تک آرہے تھے اور اس کی گردن کٹی ہوئی تھی مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں تھا۔ کسی بھی تندرست بندے کی گردن کاٹ دی جائے تو خون کا دریا بہہ جاتا ہے، مگر نور جہاں کی گردن کٹی ہوئی تھی مگر خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے کسی نے گردن کاٹ کر اس کا خون پی لیا ہو۔

دیکھنے والوں کے ہوش و حواس اڑ گئے تھے۔ ایسا ہولناک منظر تھا کہ دیکھا نہیں جاتا تھا، یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کسی کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔

نور جہاں خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ انتہائی بھیانک ہو رہا تھا، بمشکل تمام دیکھنے والوں نے اپنی چیخیں روکی تھیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ نور جہاں کو اس کنڈے سے لٹکا کر اس کی گردن کاٹی گئی ہے یا پھر گردن کاٹ کر اسے اس کنڈے میں لٹکایا گیا ہے۔

بہن تھی، دونوں بھائی اس سے محبت بھی کرتے تھے۔ ان کی چیخیں پوری حویلی میں گونجنے لگیں اور اس کے بعد تو وہ کہرام مچا کہ حویلی اتھل پتھل ہو کر رہ گئی۔ چوہدری سردار علی پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ بہن آسیہ بیگم اور بھابیاں وحشت زدہ ہو کر چیخیں مار رہی تھیں۔ چوہدری سردار علی رو رو کر بس یہی کہے جا رہے تھے۔

''بیڑہ غرق ہو تم لوگوں کا، کہا تھا میں نے دیکھو کچھ ہو نہ جائے، ہائے میری بچی۔''

☆......☆......☆

بدر الدین ان دنوں کچھ نئی کیفیات سے گزر رہا تھا۔ جمیلہ سے ملاقات کے بعد اس کی کایا ہی پلٹ گئی تھی، اس نے بدر الدین کو زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا۔ اس کے دل میں نجانے کیسے کیسے خیالات آتے رہتے تھے، آج بھی صبح ہی سے وہ بڑا خوش خوش نظر آرہا تھا۔ ٹرینیں آرہی تھیں، جا رہی تھیں، وہ اپنا کام بھی کر رہا تھا لیکن شام کو چار بجے آنے والی ٹرین پر وہ موجود نہیں تھا بلکہ وہ آبادی میں حمام پر نہانے چلا گیا تھا۔ نائی سے خوب اچھی طرح شیو بنوائی تھی۔ نئے کپڑے پہنے تھے اور شام کو سات بجے بن سنور کر اسٹیشن پہنچا تو قلیوں نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور ان میں سے اس کے ایک بے تکلف دوست نے کہا۔ ''کیا بات ہے بدرو، آج تو نقشے ہی بدلے ہوئے ہیں، بر دکھاوے کے لئے جا رہے ہو کیا، شادی وادی کرنے کا ارادہ ہے؟''

بدر الدین اسے دیکھ کر مسکراتا رہا پھر بولا۔ ''کیا کہتے ہو تم، شادی کرنی چاہئے یا نہیں؟''

''مل گئی بھیا کوئی مل گئی۔ ضرور کرنی چاہئے، زندگی ہی اس وقت بنتی ہے، پر ہے کون ہمیں بھی بتا دو؟''

''ضرور بتاؤں گا اگر یہ طے ہو جائے کہ کوئی ہے۔''

اسٹیشن کے شیڈ میں بڑی سی گھڑی لگی ہوئی تھی۔ بدر الدین کو لگ رہا تھا کہ آج گھڑی کی سوئیاں جم گئی ہیں۔ آگے نہیں بڑھ رہیں۔

چار بجے وہی ٹرین آئی تھی جس سے وہ اتری تھی لیکن اس وقت تک ٹرین کے مسافر بھی سو رہے ہوتے تھے اور ریلوے اسٹیشن بھی خالی پڑا رہتا تھا۔ البتہ آج اس نے رحیم خاں سے کہا تھا۔ ''یار رحیم خاں، دو سوا دو بجے مجھے چائے چاہئے ہوگی، بس اتنا کر کہ سامان اوپر رکھ دینا، کیک پیسٹری وغیرہ بھی، میرا کوئی دوست آئے گا۔''

''مگر دو بجے تو کوئی ریل نہیں آتی۔''

''یار تجھے میری بات ماننی ہے تو مان لے، سوالات کرنے ہیں تو جانے دے۔''

''ارے نہیں میں سب انتظام کر کے جاؤں گا تو پرواہ مت کر۔''

چائے کے کیبن کا ایک حصہ کھلا چھوڑ دیا گیا اور وہاں چائے وغیرہ کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔ دو بجے ریلوے اسٹیشن بالکل سنسان پڑا ہوا تھا، بس وہ اپنی بینچ پر بیٹھا بیزار نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن اسے اس وقت حیرت ہوئی جب اسے اپنے عقب سے وہی مترنم آواز سنائی دی۔ ''بدر الدین، سو رہے ہو کیا؟''

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا، نگاہیں تو چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ یہ کہاں سے آگئی۔ اس نے سوچا، بے پناہ خوبصورت نظر آرہی تھی۔ برقع پہنا ہوا تھا نہ چہرے پر نقاب لگایا ہوا تھا۔ روشنی میں وہ اتنی دلکش نظر آرہی تھی کہ بدر الدین کی آواز ہی بند ہو گئی۔

''اٹھو آؤ یہاں سے آگے بڑھتے ہیں۔'' وہ بولی اور بدر الدین جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ دونوں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بہت مدھم روشنی تھی، یہاں بھی ایک بینچ پڑی ہوئی تھی، وہ بولی۔ ''بیٹھو بدر الدین، دیکھ لو میں تو ٹھیک وقت پر آگئی۔''

''میں بہت خوش ہوں، مگر تم نے بلاوجہ تکلیف کی جمیلہ، میں آجاتا۔''

''چلو کوئی بات نہیں ہے، اصل میں بدر الدین میں آج جا رہی ہوں۔'' وہ اداسی سے بولی اور بدر الدین اچھل پڑا۔

''کک...... کیا مطلب، کک...... کہاں جا رہی ہو؟''

''اپنے گھر۔'' وہ افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اتنی جلدی، اس لئے آئی تھیں تم اسٹیشن۔'' بدر الدین کی آواز روہانسی ہو گئی۔

''جانا تو تھا نا بدر الدین، آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں۔''

''کہاں ہے تمہارا گھر؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''گڑھی حیدر بیگ، دیکھو گے میرا گھر؟''

بدر الدین کچھ لمحوں تک خاموش رہا پھر بولا۔ ''اگر تم دکھانا چاہو تو دکھا دو، تم نے تو مجھے بہت دکھی کر دیا جمیلہ، مگر کیا اس وقت تم گڑھی حیدر بیگ جا رہی ہو۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ناممکن، اس وقت تو کوئی ریل ادھر نہیں جائے گی، آخری ریل وہی ہوتی ہے، جس سے تم آئی تھیں۔''

''اگر میرا گھر دیکھنا چاہو تو میرے ساتھ چلو۔''

''میں نے تمہارے لئے چائے کا بندوبست کیا تھا۔''

''چھوڑو...... آؤ میرے ساتھ۔''

''مگر جاؤ گی کہاں، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔''

''تم ریلوے اسٹیشن پر رہتے ہو، تم نے ادھر نہیں دیکھا اس پلیٹ فارم پر جو مال گاڑی کھڑی ہوئی ہے بس کچھ دیر میں چلنے ہی والی ہے۔''

''ارے ہاں وہ تو ادھر ہی جائے گی، تمہیں تو بڑی معلومات ہیں۔''

پھر وہ دونوں مال گاڑی کے ایک ایسے کھلے ڈبے میں جا بیٹھے جس میں کوئی شیڈ نہیں تھا۔ جمیلہ کا کہنا بالکل ٹھیک تھا، کچھ ہی لمحوں کے بعد مال گاڑی میں انجن لگا اور پھر وہ آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

''مجھے معاف کرنا جمیلہ، میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو، تم شروع ہی سے میرے لئے پراسرار رہی ہو اسی رات سے جب تم یہاں آئی تھیں۔ کیا کرنے آئی تھیں اور کیا کر کے جا رہی ہو کچھ نہیں معلوم مجھے۔''

مال گاڑی کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

''بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا وقت سے پہلے کھلنا مناسب نہیں ہوتا۔ میں ایک ضروری کام سے یہاں آئی تھی وہ کام میں نے کر لیا۔ جب کام ختم ہو جائے پھر گھر تو واپس جانا ہی ہوتا ہے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

☆......☆......☆

آخر کار مال گاڑی کا سفر ختم ہوا اور وہ کچھ دیر کے لئے گڑھی حیدر بیگ پر رکی۔ جمیلہ اسے ساتھ لے کر نیچے اتر گئی۔ بدر الدین کے لئے واپس شاد پور جانا کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔ جمیلہ نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا، رات کی تاریکی میں وہ لوگ بڑھتے رہے۔ پھر جمیلہ ایک جگہ پہنچ کر رکی۔ یہ قبرستان کا دروازہ تھا۔ بدر الدین کافی حیران نظر آرہا تھا۔ قبرستان میں آگے بڑھ کر وہ ایک قبر کے نزدیک پہنچی۔ پھر اس نے رک کر ڈبڈبائی نگاہوں سے بدر الدین کو دیکھا اور بولی۔ ''وعدہ کر چکے ہو کہ اپنی زندگی سنوارو گے، بہت اچھے ہو تم، کاش بہت پہلے مجھے ملتے۔''

''مگر تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''یہ۔'' اس نے ایک قبر کی طرف اشارہ کیا اور پھر جھک کر قبر کا تعویذ اس طرح اٹھا دیا جیسے کسی صندوق کا ڈھکن ہو۔ بدر الدین دہشت زدہ ہو گیا تھا۔

''خدا حافظ بدر الدین، میرا گھر دیکھ لیا تم نے، میں یہیں رہتی ہوں۔''

''مجھ سے مذاق کر رہی ہو جمیلہ؟''

''نہیں بدر الدین زندگی نے مجھ سے مذاق کیا ہے، میں مر چکی ہوں۔''

اس نے کہا اور تعویذ کا ڈھکن پوری طرح کھول کر قبر میں لیٹ گئی۔

بدر الدین دہشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جھانک کر تعویذ کے اندر دیکھا تو سفید کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ لیکن بدر الدین اس سے بالکل خوفزدہ نہ ہوا۔ ''کاش میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے تعویذ کا ڈھکن بند کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں نے تمہارا گھر دیکھ لیا ہے جمیلہ، خدا حافظ، میں آتا رہوں گا، جمیلہ میں آتا رہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ پڑا۔

(جاری ہے)

حویلی سردار علی میں جو کچھ ہوا تھا وہ ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ایک انسانی زندگی چلی گئی تھی۔ نور جہاں جو بالکل نوخیز اور نوجوان تھی۔ اس بیچاری کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ وہ خوامخواہ ماری گئی تھی۔ چوہدری سردار علی سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہا تھا کہ جو کچھ کیا تھا وہ تو میں نے کیا تھا، میری بچی کیوں نشانہ بن گئی۔ اس بات کے جواب تو بہت سے دیئے جاسکتے تھے لیکن جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

حویلی میں کہرام مچا تو پولیس کو بھی کہیں سے اطلاع مل گئی۔ حویلی سے یہ اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ پولیس پہنچ گئی اور چونکہ اس گھر میں ایک پراسرار قتل ہوا تھا اس لئے پولیس نے کسی کی نہ مانی، لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے جائی گئی اور ڈاکٹرز بھی چکرا کر رہ گئے تھے۔

تفتیش کے دوران ہی وہ مقدمہ علم میں آیا جو احمد دین کے خلاف تھا جس نے رجب شاہ کو قتل کیا تھا اور اس کے نتیجے میں احمد دین کو پھانسی دی گئی تھی اور چوہدری نظام الدین نے اخبارات کو بیان دیئے تھے کہ احمد دین بے گناہ ہے اور اسے موت کی سزا دلوانے میں بڑے چوہدری سردار علی کا ہاتھ ہے۔ اگر احمد دین کو سزائے موت ہوئی تو یہ پورا خاندان بھی موت اپنالے گا اور اس کے بعد اس خاندان کا بچہ بچہ چوہدری سردار علی کے خاندان سے انتقام لے گا۔

اس انتقام کا تھوڑا سا پہلو تو سامنے آیا تھا، یعنی چوہدری سردار علی کو حویلی میں نظر آنے والی وہ پراسرار ملازمہ جس نے کہا تھا کہ وہ نظام الدین کی بیٹی ہے اور اپنا انتقام لینے کے لئے آئی ہے۔ چوہدری سردار علی نے پولیس کو بتایا تھا کہ کس طرح وہ لڑکی حویلی میں دو تین بار نظر آئی تھی۔

بظاہر تو یہ کوئی دلچسپ اور پراسرار کہانی نظر آتی تھی لیکن صرف ان لوگوں کے لئے جن کا اس کہانی کے کرداروں سے کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ پہلا واسطہ سردار علی کو ہی پڑا تھا یا پھر نور جہاں کو جو بیچاری دنیا میں کسی کو کچھ بتانے کے لئے موجود نہیں تھی اور صرف اپنے باپ اور بھائیوں کے لالچ کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ پولیس نے زرعی یونیورسٹی لاہور سے جمیلہ کی تصویریں حاصل کی تھیں۔ یہ تصویریں چوہدری سردار علی کو دکھائی گئیں تو اس نے فوراً ہی پہچان لیا اور کھکھیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہی تھی، یہی تھی وہ، ہائے اب کیا ہوگا؟“

☆......☆......☆

ان ساری کہانیوں کے منظر عام پر آنے کے بعد بدرالدین کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ اس رات ٹرین سے اترنے والی جمیلہ کون تھی۔ بدرالدین کا دل خون کے آنسو رو دیا تھا۔ جمیلہ کے الفاظ اسے یاد آتے تھے تو اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ تین چار دن کے بعد وہ گڑھی حیدر بیگ پہنچ گیا۔ شام کے سناٹوں میں سفر کرتا ہوا قبرستان میں داخل ہوا اور پھر جمیلہ کی قبر پر جا بیٹھا۔

”جمیلہ... یہ تھی تمہاری کہانی، تم نے مجھے زندگی بنانے کے لئے کہا تھا لیکن مجھے بتاؤ میں کس کے لئے زندگی بناؤں۔ جمیلہ میری تقدیر میں شاید یہی لکھا تھا، ماں تھی جو میری زندگی کا سب سے بڑا سہارا تھی، وہ چلی گئی۔ جمیلہ میں برا انسان نہیں ہوں، اب زندگی کا بقیہ وقت تمہاری یاد میں ہی گزرے گا۔“ جمیلہ کی قبر پر بیٹھ کر وہ زار و قطار رویا تھا پھر اس نے کہا تھا۔

”میرا خاندان یہاں آباد ہے جمیلہ، میں معلوم کروں گا کہ نظام الدین، احمد دین اور باقی لوگوں کی قبریں کون کون سی ہیں۔ جمیلہ میں ان قبروں کی دیکھ بھال کروں گا۔ ہر جمعرات کو تم میرا انتظار کیا کرو۔ میں تم سے یہ فرمائش کبھی نہیں کروں گا جمیلہ کہ ایک بار پھر میرے لئے ایک روح کی شکل میں میرے سامنے آجاؤ، مجھ سے بات کرو، جمیلہ اگر تم خود ایسا کرسکتی ہو تو زندگی بھر تم سے کچھ نہیں چاہوں گا، سوائے اس کے کہ تمہیں ایک نظر دیکھ لیا کروں۔“

بدرالدین کی آہ و زاری ایسی تھی کہ کوئی بھی صاحب دل یہاں ہوتا اور اس کی باتیں سنتا تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا اور بہرحال یہ ایک بڑا المیہ تھا، بات یہاں ختم نہیں ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

چوہدری سردار علی تو اب بستر سے ہی لگ گیا تھا، بہت ہی تھکا تھکا اور بیمار رہنے لگا تھا۔ بیٹوں نے شہر میں کاروبار کر رکھا تھا...... اس حادثے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک دن حیدر علی اپنے آفس میں بیٹھا کاروباری ڈیلنگ کر رہا تھا کہ ملازم نے ایک شخص کے آنے کی اطلاع دی۔

”کون ہے، کارڈ نہیں بھیجا؟“

”نہیں جناب، اچھا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کہہ رہا تھا بہت ضروری کام ہے، اچھی حیثیت کا مالک معلوم ہوتا ہے سر جی۔“

”بلاؤ۔“ حیدر علی نے کہا اور ایک فائل میں مصروف ہوگیا۔ آنے والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا اور پھر کرسی گھسیٹ کر سامنے بیٹھ گیا۔

حیدر علی گردن جھکائے فائل کے کاغذات میں الجھا ہوا تھا، فائل بند کر کے اس نے گردن اٹھائی اور بولا۔ ”جی۔“ لیکن اس جی کے ساتھ ہی جیسے اچانک ہی اس کا سانس بند ہوگیا ہو۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

یہ احمد دین تھا، احمد دین کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید نظر آرہا تھا۔ خون کا ایک قطرہ اس کے جسم میں موجود نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بھیانک انداز میں چمک رہی تھیں، حیدر علی کی تو آواز ہی بند ہوگئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے اعصاب سن ہوگئے ہوں حالانکہ برابر میں گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا، لیکن ہاتھ پاؤں ہی نہیں ہل رہے تھے گھنٹی کا بٹن کون دباتا۔

احمد دین کی آواز ابھری۔ ”آغاز ہوگیا ہے حیدر علی، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستے ہیں۔ تمہارے خاندان کا کوئی بھی فرد زندہ نہیں بچے گا۔ میرے باپ نے عہد کیا تھا اور اس عہد کو پورا کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے، بلکہ میری ذمہ داری تو کچھ زیادہ ہی ہے، بابا نے تم دونوں کو میرے کھاتے میں رکھا ہے، یعنی تمہارا بھائی صفدر علی اور تم بھی۔ تم دونوں کی ہلاکت میری ذمہ داری ہے، یہ مت سمجھنا بات ختم ہوگئی، ابھی تو آغاز ہوا ہے، انجام اچھا نہیں ہوگا، بس اطلاع دینے آیا تھا تمہیں۔“ یہ کہہ کر احمد دین اپنی کرسی سے اٹھا دروازے کی طرف جانے کے بجائے اس نے کھڑکی کا رخ کیا تھا۔ یہ کھڑکی عقبی سمت میں کھلتی تھی اور کافی بلندی پر تھی، حیدر علی کی گردن اس کے ساتھ ساتھ گھوم گئی۔ تب اس نے وہ عجیب و غریب منظر دیکھا اور دہشت سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رک گئی۔ احمد دین اس کھڑکی میں داخل ہوا تھا اور پھر اس کا جسم آرام سے اس کھڑکی سے پار ہوگیا۔ جیسے وہ کوئی ہوا ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی حیدر علی بے ہوش ہو کر کرسی سے نیچے گر پڑا تھا۔

اسے گھر تک پہنچانے کے سلسلے میں دفتر کے اسٹاف نے ہی کام کیا تھا۔ حیدر علی بول ہی نہیں پا رہا تھا۔ گھر پر ڈاکٹر کو بلایا گیا اور اسے انجکشن وغیرہ دیئے گئے۔ صفدر علی نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے لیکن اس نے صفدر علی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

”بس اچانک ہی طبیعت خراب ہوگئی ہے، میرا خیال ہے میں کچھ دن کے لئے بستی چلا جاؤں...... شاد پور۔“

”چلے جاؤ، کیا ہرج ہے؟“

صفدر علی بیچارے کو تو حقیقت معلوم نہیں تھی، یہ دوسرا بے گناہ تھا جو باپ اور بھائی کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہوا تھا۔ بہرحال حیدر علی شاد پور چل پڑا۔ یہاں آکر بھی اس نے دو دن کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن تیسرے دن اس نے اپنی بیوی کو تفصیل بتائی۔ فردوس جہاں چکرا کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

”حیدر علی! میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ اس حویلی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اچھا نہیں ہے۔“

”میرا ساتھ چھوڑ دو گی فردوس جہاں۔“

”یہ بات نہیں ہے، یہاں بھی ایک عجیب و غریب بات ہوئی ہے۔“ فردوس جہاں نے کہا۔

حیدر علی چونک کر اسے دیکھنے لگا، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا؟“

فردوس جہاں کچھ دیر تک خوفزدہ نگاہوں سے حیدر علی کو دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”پائیں باغ میں وہ خشک حوض کے دوسری طرف جو پھول کھلے ہوئے ہیں، تمہیں معلوم ہے کہ پھولوں کا وہ کنج میں نے ہی لگوایا تھا۔ میں وہاں اکثر جاتی رہتی ہوں، اس دن دوپہر کے وقت میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے یونہی باہر نگاہ ڈالی تو پھولوں کے کنج کے پاس مجھے ایک عورت نظر آئی۔ دیہاتی قسم کی عورت تھی۔ سادہ سا لباس پہنے ہوئی تھی۔ اس نے ایک بچے کی انگلی پکڑی ہوئی تھی، بچے کی عمر ڈھائی سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ پھولوں کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ میں سمجھی کہ بستی کی کوئی عورت ہے اور پھول چرانے آئی ہے، تمہیں پتہ ہے کہ میں ان پھولوں پر جان دیتی ہوں۔ میں تیزی سے اپنے کمرے سے باہر نکلی اور پھر تیز رفتاری سے چلتی ہوئی پھولوں کے اس کنج کے پاس پہنچ گئی۔ عورت مجھے دیکھنے لگی تھی۔ تم یقین کرو بڑا عجیب سا چہرہ تھا۔ اتنا عجیب کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ خوبصورت عورت تھی، لیکن چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ بچہ بھی پیارا تھا۔ میں نے اس سے درشت لہجے میں پوچھا کہ کیا وہ پھول توڑنے آئی ہے تو وہ مسکرا دی، اس کے دانت بے حد سفید تھے اور ہونٹ ایسے سرخ تھے جیسے خون میں رنگے ہوئے ہوں، اس نے کہا۔

”ہمیں پھولوں کی کیا ضرورت پڑسکتی ہے بیگم جی، ہم تو آپ سے ملنے آئے ہیں۔ حسینہ ہے ہمارا نام بیگم جی۔ آپ کے سسر نے ہمارے شوہر کو موت کی سزا دلوادی تھی، ہم نے قسم کھائی تھی کہ آپ سے بدلہ لیں گے تو ہم آگئے ہیں بیگم جی ہمیں پتہ چل چکا ہے کہ جمیلہ اپنا کام پورا کرچکی ہے۔ اب ہم بھی اپنا فرض پورا کریں گے۔“

”اسی وقت پیچھے سے فیروزہ نے مجھے آواز دی اور میرا چہرہ اس طرف گھوم گیا۔ فیروزہ میری طرف آرہی تھی، میں نے پلٹ کر پھر اس عورت کی طرف دیکھا، یقین کرو وہاں کسی کا کوئی وجود نہیں تھا۔“

حیدر علی خوفزدہ نگاہوں سے بیوی کو دیکھنے لگا۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ احمد دین کی بیوی کا نام حسینہ ہے۔

کچھ لمحوں کے بعد فردوس جہاں نے پھر کہا۔ ”نور جہاں کی موت جیسے ہوئی ہے اسی نے سب کے حواس چھین لئے ہیں اور اب تم یہ کہانی سنا رہے ہو۔ میں کہتی ہوں ہم سب کا کیا بنے گا؟ تمہارے ابا نے تھوڑی سی زمینوں کے لالچ میں آکر سب کو عذاب میں ڈال دیا ہے۔ زندہ لوگوں سے بچاؤ کا بندوبست بھی کرلیا جائے، مگر ان مظلوم روحوں کا کیا کیا جائے، میں تو اپنے میکے جا رہی ہوں، حیدر علی مجھے گھر بھجوادو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں بھی مشکل میں پڑ گیا ہوں، تم یقین کرو، یہ طویلے کی بلا بندر کے سر آئی ہے۔ ابا جی نے اپنا کھیل کھیل کر سب کی گردن پھنسادی ہے۔“

”وہ تم باپ بیٹے جانو، مجھے پہنچادو میرے گھر۔“

”تھوڑا سا صبر کرو فردوس، ذرا ابا جی سے بات کرلوں۔“

اور اسی شام حیدر علی نے باپ کے پاس بیٹھ کر کہا۔ ”ابا جی! بات ایک نور جہاں کی موت کی ہی نہیں ہے۔ میری بہن سب سے پہلے موت کے گھاٹ اتر گئی۔ وہ خونی خاندان ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑے گا...... ابا جی اتنی زمینیں ہیں ہماری۔ کیا کریں گے ہم سب ان زمینوں کا، بلاوجہ اس چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے کے لئے ہم نے ایک خاندان کو موت کے گھاٹ سلادیا اور اب ابا جی جو کچھ ہو رہا ہے آپ خود دیکھ لیجئے۔“

”مجھے ہی برا بھلا کہتے ہو، اگر تم دونوں کھڑے ہو کر کہتے کہ ابا جی ایسا مت کرو تو بھلا میں کیا انکار کرتا، میں تو خود بیمار آدمی ہوں۔ تم بھی تو میرے لالچ میں شریک تھے۔“

”ابا جی! وہ ہم سب کو مار ڈالیں گے، احمد دین کی روح میرے پاس آئی تھی، وہ ہم سب کو ماردیں گے وہ چھوڑیں گے نہیں۔ احمد دین کی بیوی حسینہ فردوس کے پاس آئی تھی۔“ حیدر علی نے ساری کہانی چوہدری سردار علی کو سنائی اور چوہدری سردار علی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”فردوس گھر جانا چاہتی ہے، اسے گھر بھجوادوں اگر آپ کہیں تو۔“

”بھجوادو بیٹا، مگر یہ کوئی حل نہیں ہے، ارے کوئی ملا سیانا تلاش کرو، کسی سے بات کرو۔ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو روحوں کو پابند کردیتے ہیں، حاضرات کرتے ہیں اور ان سے معاہدے کرلیتے ہیں وہ کچھ کرو، ایسا کرتے ہیں گڑھی حیدر بیگ چلتے ہیں۔ تم ایسا کرو حیدر علی لوگوں سے بات کرو۔ کچھ بزرگوں سیانوں کو بلاؤ، صلاح مشورے کرو کہ کوئی ہماری اس مشکل سے ہمیں نجات دلادے۔“

”نیا کھیل نہ شروع کریں ابا جی۔ یہ سب کے سب کھاؤ پیر ہوتے ہیں۔ آئیں گے، دونوں ہاتھوں سے لوٹ مار کریں گے اور ناکامی سے گردن جھکا کر چلے جائیں گے، نہیں ابا جی ایسا مت کریں، کچھ اور کرتے ہیں، کچھ اور سوچتے ہیں۔“

”سوچو، سوچو بیٹا، اگر میں کچھ کہوں گا تو بعد میں کہو گے کہ ابا جی، آپ ہی نے نہیں چلنے دی تھی۔“

بہرحال بڑے خوف کی فضا پیدا ہوگئی تھی...... ہر شخص خوفزدہ تھا، بہوئیں تو خاص طور سے کہتی تھیں کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ جرم ابا جی نے کیا اور بھگت رہے ہیں گھر کے سارے لوگ۔ مگر بھگتنا تو تھا ہی۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ بات حیدر علی ہی کی نہیں تھی، صفدر کے لئے بھی احتمالی خطرہ تھا۔

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا ادھر فردوس بیگم نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ وہ اپنے گھر جائے گی۔ چنانچہ سب سے پہلے فردوس بیگم کو گھر بھجوادیا گیا اور اس کے بعد چوہدری سردار علی اپنا منصوبہ بنا کر حیدر علی کے ساتھ ایک بار پھر گڑھی حیدر بیگ چل پڑا۔ راستے میں حیدر علی نے چوہدری سردار علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اب بستی جا کر یہ کہنا مت شروع کردینا ابا جی کہ رجب شاہ کو آپ نے قتل کرایا تھا۔ اس قتل کا اعتراف مت کرلینا ورنہ ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی ہم سب کو۔ ایک بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتروایا ہے ہم نے۔“

”ہاں یہ تو ٹھیک کہتے ہو، سمجھاتے رہا کرو مجھے بیٹا بوڑھا ہوچکا ہوں۔ دماغ خشک ہوگیا ہے کام نہیں کرتا، ارے اب تو تم بچوں ہی کا دور ہے، منع کرتے زمینوں کے لئے تو کبھی ضد نہ کرتا۔“

”پچھلی باتوں کو چھوڑیں ابا جی۔ اب آگے کی سوچیں۔“

گڑھی حیدر پہنچ کر حیدر علی کے مشورے سے گڑھی حیدر بیگ کے بڑے بوڑھوں کو ڈیرے پر دعوت دی گئی، بڑا اہتمام کیا گیا ان کے لئے، حالانکہ گڑھی حیدر بیگ میں چوہدری سردار علی کے لئے بڑی نفرت پائی جاتی تھی۔ لوگ اس بے کس اور مجبور گھرانے کی موت کو نہیں بھول سکے تھے جس کے گھر کا چراغ بجھا کر چوہدری سردار علی نے باقی سب کی زندگی بھی چھین لی تھی۔ لوگوں کو یقین تھا کہ احمد دین نے رجب شاہ کو قتل نہیں کیا ہے۔ بہرحال جو اہتمام کیا گیا تھا اس میں کسی نے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ بڑے بوڑھوں کے ساتھ نوجوان بھی جمع ہوگئے تھے، چوہدری سردار علی نے کہا۔ ”بھائیو! میں نے آپ لوگوں کو ایک خاص مقصد کے لئے بلایا ہے۔“

”کہئے چوہدری صاحب، کیا حکم ہے ہمارے لئے؟“

”نہیں بھائی تمہارے لئے حکم نہیں ہے۔ اصل میں مجھے خواب میں نظام دین بار بار نظر آتا ہے، تم لوگ جانتے ہو کہ اسے غلط فہمی تھی کہ رجب شاہ کے قتل کے الزام میں، میں نے احمد دین کو پھانسی دلوائی ہے، ان لوگوں کو یہ بھی غلط فہمی تھی کہ میں نے ان کی فصلوں کو آگ لگوائی تھی۔ ارے بابا ہم کسان مزدور قسم کے لوگ بھلا فصلوں کو کیسے جلا سکتے ہیں، یہ فصلیں تو ہماری اولاد کی طرح ہوتی ہیں۔ بہرحال جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ نظام دین کی زمینوں پر ایک چھوٹی سی جگہ میں مدرسہ بنوادوں اور اس میں دین کی تعلیم دلوانے کا بندوبست کردوں۔ خرچہ میرا ذمہ، بستی کے بچے دینی تعلیم حاصل کریں گے اور نظام دین کے خاندان کو ثواب پہنچا ئیں گے، کچھ نہ کچھ تو بھلا ہوگا۔ کل سے زمینوں کی صفائی کا کام شروع ہوجائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ بستی میں موجود نوجوان مزدور کل سے کام پر لگ جائیں، صبح کو حیدر علی وہاں پر ہوگا۔ مزدوروں کو پوری پوری اجرت دی جائے گی، زمینوں کی صفائی کر کے وہاں تھوڑے دن کے اندر مدرسے کا کام شروع ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ قبرستان میں ان لوگوں کی قبروں کے گرد احاطہ بنوا کر ان کے مزار پکے کروادیئے جائیں۔ بھائیو اور کیا کرسکتا ہوں ان روحوں کے لئے جنہوں نے غلط فہمی میں آکر اپنی جانیں اپنے ہاتھوں سے قربان کردی ہیں۔ بہرحال مجھے بڑا دکھ ہے۔“

بزرگ تو مصلحتاً خاموش رہے لیکن ایک پرجوش نوجوان بول پڑا۔

”چوہدری صاحب روحوں کے ساتھ بھی مکاری کریں گے، کھیتوں میں آگ آپ نے لگوائی، رجب شاہ کو آپ نے قتل کرا کر احمد دین کو اس کے قتل کے الزام میں پھنسایا، سارے کام تو آپ نے خود کئے ہیں۔ اس کے بعد آپ ان کی روحوں کو خوش کرنے نکلے ہیں۔ بہرحال یہاں یہ خبر پہنچ چکی ہے کہ آپ کی بیٹی مرگئی ہے۔ چوہدری صاحب! مکافات عمل تو ہوتا ہی ہے، آپ کچھ بھی کرلیں، ضمیر کو ماردیا ہے آپ نے تو سب کچھ ماردیا ہے۔“

”بیٹا، جوانی کا جوش ایسا ہی ہوتا ہے، پر میں کچھ نہیں کہوں گا تم سے۔ میرا دماغ ٹھنڈا ہوگیا ہے، جو دل چاہے کہہ لو بستی کے لوگو! مجھے مزدور چاہئیں، جو میں نے سوچا ہے وہ کام میں پورا کروں گا۔“

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سب لوگ واپس لوٹ گئے تو چوہدری سردار علی نے حیدر علی سے کہا۔ ”سب کے دماغ خراب ہوگئے ہیں، ہم نے جو کچھ سوچا ہے اس پر کل سے عمل شروع کردیا جائے۔“

اور مزدوروں کا ملنا کونسی مشکل بات تھی دور ہی ایسا ہے، سب سے بڑا مسئلہ پیٹ کا ہوتا ہے، بیروزگاری اور بھوک ہر قسم کے جذبوں کو سلادیتی ہے، بے شمار نوجوان جلے ہوئے کھیت کی صفائی میں مصروف ہوگئے۔ حیدر علی اپنی نگرانی میں سارے کام کرا رہا تھا۔ زمینیں ایک طرح سے لاوارث ہی پڑی ہوئی تھیں لیکن جب مدرسہ بننے کی بات آئی تو کچھ بزرگوں نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”تم کس حق کے تحت اس زمین پر مدرسہ بنوا رہے ہو۔ یہ لاوارث ہے اور ابھی تک سرکار نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ان زمینوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنا تمہارا حق نہیں ہے چوہدری سردار علی، لیکن اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہی ہو تو بھلا تمہیں روکنے والا کون ہے البتہ اگر کبھی اس سلسلے میں سرکاری طور پر کوئی کارروائی ہوئی تو ہم سب تمہارے خلاف گواہی دیں گے بلکہ درخواست دیں گے کہ ایک لاوارث زمین پر ایک بڑے زمیندار نے قبضہ کر کے اپنی من مانی شروع کردی ہے۔“

”لو، نیکی کرو تب بھی گناہ۔ بھاڑ میں جاؤ، بچے دینی تعلیم حاصل کرتے تو تم لوگوں کو بھی فائدہ ہوتا۔“

”پہلے اپنا دین دنیا ٹھیک کرلو چوہدری صاحب۔“ کسی نے کہا۔

تب چوہدری نے جل کر حیدر علی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے حیدر علی، ایک تو اپنا پیسہ لگاؤ، اوپر سے ان لوگوں کی فضول باتیں سنو، قبروں کی تعمیر کا کام تو تم شروع کرا ہی دو۔ وہاں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، وہ زمین تو سرکاری نہیں ہے، بھئی ہم دوستی کی خاطر، محبت کی خاطر ان قبروں کو پختہ کروا رہے ہیں۔“ چوہدری سردار علی نے کہا پھر بولا۔ ”اور میں خود اس کام کی نگرانی کروں گا۔“

”ٹھیک ہے ابا جی، میں مزدوروں کو بلوا لیتا ہوں۔“ حیدر علی نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

بدرالدین کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس کے دل پر ایسا اثر ہوا تھا کہ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہی چھن گئی تھی۔ چار پانچ دن کے بعد وہ پھر گڑھی حیدر بیگ پہنچ گیا۔ کسی اور سے اس کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ قبرستان ہی جانا تھا، بہت سے پھول لے کر گیا تھا اور شام کے جھٹپٹوں میں کسی آوارہ روح کی مانند قبروں کے درمیان بھٹکتا ہوا آخرکار جمیلہ کی قبر پر پہنچ گیا تھا۔ پھولوں کو ایک طرف رکھ کر بولا۔ ”جمیلہ! بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں تم سے، تم اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اپنی روح کو مجسم کر کے شاد پور پہنچی تھیں۔ وہ تمہارا اپنا کام تھا، میں نہیں جانتا کہ روحوں کے کسی کام کی تکمیل کے لئے اجازت درکار ہوتی ہے یا نہیں لیکن میں نے تمہیں مجسم دیکھا تھا اور تم رحمت چچا کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر حویلی سردار علی پہنچی تھیں۔ اب کیا یہ ممکن ہے کہ جب میں تمہارے پاس آؤں تو تم پھر مجھے ملو، جمیلہ ممکن ہوسکتا ہے کیا ایسا؟“

کوئی جواب، کوئی آہٹ، کوئی سرگوشی نہ سنائی دی۔ البتہ مدھم مدھم ہوا چلنے لگی جو آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی اور پھر بدرالدین اچھل پڑا۔ ان ہواؤں نے ایک سرگوشی کی سی کیفیت اختیار کرلی تھی۔ وہ الفاظ اور وہ مترنم لہجہ اسے صاف سنائی دیا تھا۔

”نہیں بدرالدین، روحیں جب دنیا سے چلی جاتی ہیں تو انہیں بہت سے اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ روحوں کی کہانی ہی الگ ہوتی ہے، وہ تو ایک جذبہ تھا، ایک مقصد تھا جس کی تکمیل کی اجازت ملی تھی، ہم زندہ افراد سے روحانی رابطہ تو رکھ سکتے ہیں، ہم ان کے سامنے مجسم نہیں ہوسکتے۔ اس کی ہمیں اجازت نہیں ہوتی۔ بدرالدین! ایک روح سے محبت بے مقصد عمل ہے۔ مجھ سے محبت نہ کرو، وہ لاحاصل ہے۔“

بدرالدین کو یہ آوازیں ہواؤں کی سرگوشی کی شکل میں سنائی دے رہی تھیں لیکن اس کی روح محبت کے جذبے سے سرشار ہوچکی تھی، اس نے کہا۔ ”جمیلہ! یہ ایک نئی کہانی ہوگی کہ کسی انسان نے ایک روح سے محبت کا آغاز کیا اور اس محبت کو انتہا تک پہنچا دیا، میری تعلیم بہت معمولی سی ہے، میں اپنے علم کی بدولت ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا لیکن میرا احساس بول رہا ہے، محبت کے جذبے روحانی حیثیت ہی رکھتے ہیں۔ اگر قدرت میری سچائیوں کو قبول کرلیتی تو قدرت کی معجزہ نمائی سے کوئی بات بعید نہیں ہے، تم روح ہو جمیلہ، میں تمہیں جسمانی حیثیت سے نہیں چاہتا، ٹھیک ہے، تم اپنی مجبوریوں کی بنا پر مجسم میرے سامنے نہ آؤ لیکن میں تمہارے تصور سے محبت کرتا رہوں گا اور اس محبت کی ایک مثال قائم کروں گا، میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔“ اس نے جمیلہ کی قبر پر پھول چڑھائے اور پھر ان قبروں پر بھی جو جمیلہ کے اہل خاندان کی تھیں اور جن کی نشاندہی جمیلہ نے کی تھی۔ فاتحہ خوانی کرنے کے بعد وہ واپس پلٹ آیا لیکن ضمیر مطمئن نہیں تھا۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جمیلہ ریلوے اسٹیشن پر اسے ساتھ ساتھ چھوڑنے آئی ہو۔ ایک بھینی بھینی سی خوشبو، ایک ہلکی سی چاپ ہوا کی سرسراہٹوں کے ساتھ سفر کررہی تھی اور جب وہ ٹرین میں واپسی کے لئے بیٹھا تو اس کے کانوں میں ایک سرگوشی ابھری۔

”خدا حافظ بدرالدین لیکن جو میں نے کہا ہے اس پر بھی توجہ دو، ملنا ہونا کوئی بری بات نہیں ہے، اللہ کے سارے بندے جو زندگی سے دوچار ہیں، کچھ نہ کچھ کرتے ہیں لیکن مجھے خوشی ہوگی کہ تمہیں تمہارا اصل مقام ملے، بے شک شاد پور نہ چھوڑنا لیکن اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کرو۔“ بڑے واضح الفاظ تھے، بدرالدین نے آنکھیں بند کر کے اپنی سیٹ کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

☆......☆......☆

ڈیرے پر چوہدری سردار علی ایک پلنگ پر بیٹھا ہوا خلا میں گھور رہا تھا۔ پاس رکھے ہوئے حقے سے دھوئیں کی ایک لکیر چکراتی ہوئی فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ خمیرے کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی اور چوہدری کی سوچیں نہ جانے کہاں کہاں پہنچ رہی تھیں۔

رہ رہ کر بیٹی کا خیال دل میں آرہا تھا۔ قاتل روح نے نہ جانے کس طرح اسے چھت کے کنڈے سے لٹکا کر زندگی سے محروم کیا تھا۔ کوئی انسانی عمل تو لگتا ہی نہیں تھا کہ کسی سازش کے بارے میں سوچا جائے، خون کا ایک قطرہ بھی زمین تک نہیں آیا تھا جبکہ گردن کٹی ہوئی تھی۔ آہ میری نور جہاں کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ ہوا تو یہ میری وجہ سے ہی تھا اور اب وہ قاتل روحیں سب کی جان کے درپے ہیں۔

بیٹے سعادت مند تھے، باپ کی ہر الٹی سیدھی بات برداشت کرلیا کرتے تھے۔ حیدر علی نے مزدوروں کے حصول کے لئے کوششیں شروع کردی تھیں، تین چار دن سے پہلے یہ کام مشکل تھا حالانکہ اسے شہر جا کر اپنے کاروبار کو بھی دیکھنا تھا، کئی دن سے الجھا ہوا تھا، پہلے شاد پور میں اور اب گڑھی حیدر بیگ میں لیکن سچی بات یہ ہے کہ شہر جاتے ہوئے خوف کا ایک احساس دامن گیر تھا۔ اسے رہ رہ کر وہ لمحات یاد آتے تھے جب احمد دین اس کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ کوئی اور بات تو سوچی ہی نہیں جاسکتی تھی کیونکہ واپس وہ آفس کے دروازے سے نہیں نکلا تھا بلکہ کھڑکی سے ریزہ ریزہ ہوکر نکل گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو روحیں اس طرح ہر جگہ آجاسکتی ہیں انہیں فردوس کے گھر پہنچنا کونسا مشکل ہوگا۔ اس وقت بھی اس نے باپ کو دیکھا جو ویران ویران سا بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چوہدری سردار علی کے پاس پہنچ گیا اور پھر اسے آواز دی۔

"ابا جی!"

چوہدری سردار علی نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "ہاں بیٹا آؤ بیٹھو۔"

"ابا جی ایک بات بتائیں، ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس میں ہمیں کیا دقت ہوسکتی ہے؟"

"سمجھا نہیں بیٹے۔"

"ابا جی آپ نے ان لوگوں کی باتیں کیوں مان لیں، ہم تو نیک کام ہی کر رہے تھے۔ اب اگر اس طرح لوگوں کے روکنے سے رک جائیں تو لعنت ہے ہماری چوہدراہٹ پر۔ مدرسہ بنوا رہے تھے ہم وہاں۔ زمینیں کسی کے باپ کی ملکیت تو نہیں ہیں اور ہم کونسا ان زمینوں پر قبضہ کر رہے تھے۔"

چوہدری سردار علی نے آنکھیں بند کرکے گردن ہلائی اور بولا۔ "بیٹا قبضہ ہی تو کر رہے تھے جس کے نتیجے میں یہ مصیبت بھگتنا پڑی۔ کاش میں یہ لالچ نہ کرتا، اللہ نے جسے جو چیز عطا کی ہے وہ اللہ کی عطا کی ہوئی ہی ہے۔ یار میں جو چاہوں کرسکتا ہوں، کون روکے گا مجھے وہاں مدرسہ بنوانے سے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنے لالچ سے یہ کام کر رہا ہوں، ان لوگوں کی خوشنودی چاہتا ہوں جنہیں اپنے ہاتھوں سے تو نہیں مارا ہم نے لیکن انہیں ہماری وجہ سے دنیا چھوڑنی پڑی۔ بات تو اصل میں یہی ہے حیدر علی کہ ہم سچ کو قبول نہیں کرسکتے۔ رجب شاہ کو بہرحال قتل ہم نے ہی کرایا تھا اور الزام احمد دین پر آگیا تھا۔"

"ابا جی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، آپ بار بار یہ بات زبان سے نہ نکالا کرو۔"

"اویار اس وقت دیواریں کدھر ہیں بتا، تیرے آگے پیچھے ہیں، میرے آس پاس تو نہیں ہیں۔ مجھے ہی نصیحت کرتے رہتے ہو سارے کے سارے، ایسا نہیں سوچا تھا یار میں نے، ہائے میری نور جہاں چلی گئی، اچھا ایک کام کرتے ہیں، زمینوں کی صفائی تو ہوگئی۔"

"جی۔ اب کیا کریں ابا جی؟"

"یوں کرو، کسی مولوی کو پکڑو، جو وہاں زمینوں پر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ پھر ہم وہاں اپنے بندوں سے چارے کی پنیری لگوادیں گے اور اعلان کردیں گے کہ یہ زمین صرف نظام دین کے ایصال ثواب کے لئے کام میں لائی جائے گی یہاں جانوروں کا چارہ اگے گا اور لوگوں کو مفت دے دیا جائے گا۔ بعد میں دیکھ لیں گے سب کچھ۔"

مولوی امام علی نے کھیتوں کے بیچوں بیچ بیٹھ کر پڑھائی شروع کردی۔ دوسری طرف دوسرا کام بھی شروع ہوگیا۔ قبرستان میں ریت اور سیمنٹ کے ٹرک خالی ہونے لگے۔ سنگ مرمر کی سلوں کی کٹائی کا کام شروع ہوگیا۔ قبروں کے گرد چونے سے لائنیں ڈالنی شروع کردی گئیں۔ تین دن اس کام کو شروع ہوئے ہوگئے اور پھر چوتھی رات رد عمل کا آغاز ہوا۔

اس وقت یہاں کام کرنے والے مزدور کھانے پینے سے فارغ ہوکر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ایک مزدور کی نظر ایک قبر کی طرف اٹھ گئی۔ قبر کے اوپری حصے سے ایک روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔

مزدور نے چونک کر یہ روشنی دیکھی پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے مزدور سے بولا۔ "جمالے ذرا ادھر دیکھنا۔"

دوسرے مزدور نے اس کے اشارے پر اس روشنی کی طرف دیکھا۔ پہلے تو یہ خیال گزرا کہ قبر کے دوسری طرف شاید کوئی مزدور بیٹھا ہوا جس نے سگریٹ یا بیڑی سلگانے کے لئے ماچس جلائی ہے۔ لیکن یہ ماچس کی روشنی نہیں تھی کیونکہ یہ روشنی سفید رنگ کی تھی اور شعلہ بلند ہوتا جارہا تھا۔

یہ شعلہ کافی بلند ہوگیا اور اس کے بعد دوسرے تمام مزدور بھی اس طرف متوجہ ہوگئے لیکن اس وقت ان کے چہرے دہشت سے سکڑ گئے جب انہوں نے دیکھا کہ آس پاس کئی قبروں سے ایسی ہی سفید روشنی بلند ہورہی ہے اور پھر سفید روشنی کی چھاؤں میں سفید لباس میں ملبوس کچھ انسانی سائے نظر آئے۔ مزدوروں کی تو گھگھی بندھ گئی اور وہ بری طرح دہشت زدہ ہوکر قبرستان کے گیٹ کی طرف دوڑے لیکن ٹھیکے دار وہیں رکا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان سایوں کو دیکھتا رہا۔

تب ایک آواز ابھری۔ "یہ سب مت کرو بھائی۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے لیکن یہ جو کام کر رہے ہیں وہ ہمارے دشمن ہیں۔ انہوں نے ہمیں زندگی سے محروم کیا اور اب یہ حرکتیں کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ ملیں تو ان سے کہہ دینا کہ انہوں نے اپنی تقدیر خراب کرلی ہے۔ ایسے تو نہیں بخشیں گے وہ۔ آپ لوگ جاؤ، دشمن کا حرام پیسہ ہم اپنے اوپر نہیں خرچ کرنے دیں گے اور سنو اگر بہتری چاہتے ہو تو دوبارہ اس کام کے لئے ادھر کا رخ بھی مت کرنا، تمہیں نقصان پہنچ جائے گا۔"

اچانک ہی وہ روشنیاں بجھ گئیں۔ جیسے بلب بند کردیئے گئے ہوں، ٹھیکے دار سکتے کے عالم میں کھڑا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ مزدوروں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا، پتہ نہیں ٹھیکے دار ضرورت سے زیادہ دلیر تھا یا اس پر سکتہ طاری ہوگیا تھا لیکن جو الفاظ اس نے سنے تھے وہ اسے حرف بہ حرف یاد تھے اور یہ الفاظ اس نے بمشکل تمام چوہدری سردار علی کے ڈیرے پر جا کر اس کے بیٹے حیدر علی کو سنائے اور حیدر علی نے ٹھیکے دار کو چوہدری سردار علی کے سامنے پیش کردیا۔

"ارے تم بکنے دو، انہیں۔ میں تمہیں حفاظت کے لئے مسلح گن مین دوں گا۔"

"چوہدری صاحب گن مین مردوں پر گولیاں نہیں چلا سکتے، آپ خود تو مرو گے ہمیں بھی مرواؤ گے، ہوگے چوہدری تم اپنے گاؤں کے، ہم کسی کی چوہدراہٹ نہیں مانتے، مزدور بھی بھاگ گئے ہیں، جاؤ کسی اور کو پکڑو، وہاں کوئی کام نہیں ہوگا، تم نے جو پیسے ہمیں ایڈوانس دیئے ہیں نا، وہ بہت کم ہیں، ہمارا نقصان پورا کردو پھر ایسا کرو کہ چلو چل کر چار راتیں ہمارے ساتھ قبرستان میں گزارو۔"

"تم اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ ٹھیکے دار، جو پیسے تمہارے باقی رہ گئے ہیں وہ میں تمہیں دیئے دیتا ہوں، حساب بتادو۔"

حیدر علی کو معلوم تھا کہ چوہدری سردار کو چڑھ جائے گی اور پھر کچھ نئے جھگڑے کھڑے ہوجائیں گے، بہرحال اس نے مک مکا کرلیا، ٹھیکے دار کو رقم دے دی گئی۔ مزدور پہلے ہی جاچکے تھے، ٹھیکے دار بھی چلا گیا۔

چوہدری سردار علی خاموش بیٹھا ہوا تھا، پھر اس نے کہا۔ "میں کہتا ہوں دنیا میں کوئی ایسا عالم نہیں ہے جو ان کے دماغ ٹھیک کردے۔"

"ابا جی کیوں کئے کرائے پر پانی پھیر رہے ہیں۔ آپ روحوں سے لڑیں گے۔" حیدر علی کو وہ لمحات یاد تھے جب احمد دین اس کے دفتر میں آیا تھا۔ اس کی جان نکلی ہوئی تھی۔ ادھر فردوس جہاں نے جو کہانی سنائی تھی وہ بھی اس کے لئے بڑی ہولناک تھی۔ موبائل فون پر فردوس جہاں سے رابطہ تھا، وہ اپنے میکے چلی گئی تھی۔

ادھر مولوی امام علی کھیتوں میں بیٹھے پڑھائی میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ بھی ایسے واقعات پیش آئے، اس دن بھی وہ بیٹھے پڑھ رہے تھے، عمر رسیدہ آدمی تھے، ویسے بھی عبادت میں زندگی گزاری تھی۔ ڈر خوف نہیں تھا انہوں نے پڑھائی کے دوران پوری طرح عالم ہوش میں نظام دین، اس کے بیٹے احمد دین اور نظام دین کے گھر کی عورتوں کو دیکھا، کھیت کے بالکل کنارے چلے آرہے تھے، پہلے تو مولوی امام علی حیران ہوئے کہ رات کے اس حصے میں یہ لوگ کہاں سے آرہے ہیں اور سیدھے کھیتوں میں کیوں گھسے چلے آرہے ہیں لیکن پھر انہوں نے نظام دین کو پہچان لیا۔ اس دوران نظام دین کا خاندان ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"مولوی امام علی بڑی مہربانی کہ آپ نے ہماری روحوں کے لئے ایصال ثواب کیا لیکن آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے آپ کو یہاں بٹھایا ہے ان سے ہماری دشمنی پکی ہے، یہ دشمنی ختم نہیں ہوگی، دوسری بات یہ کہ انہیں بتادینا کہ ان زمینوں پر اب کبھی فصل نہیں ہوگی۔ کتنی ہی کوشش کرلیں وہ۔ ان کے مقدر میں جو لکھا ہے وہ ہوکر رہے گا۔"

یہ پیغام مولوی امام علی کے ذریعے چوہدری سردار علی کو ملا اور چوہدری سردار علی مزید خوفزدہ ہوگیا۔

"تم پنیری لگواؤ حیدر علی، اپنی سی کوشش تو کریں گے ہی۔"

حیدر علی زندگی سے عاجز ہورہا تھا، ادھر صفدر علی کے فون پر فون آرہے تھے کہ یہاں کاروباری خرابیاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ فوراً واپس آؤ لیکن یہاں چوہدری سردار علی کا غصہ تھا۔

بادل نخواستہ جوانوں کو تیار کیا گیا، بہت سے جوان ایسے تھے جو یہاں چارے کی پنیری لگاتے ہوئے رو رہے تھے۔ انہوں نے یہاں خود نظام دین اور اس کے پڑھے لکھے بیٹے احمد دین کو فصلیں اگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ صحیح معنوں میں نظام دین اپنی زمینوں کو باپ کی حیثیت سے ہی دیکھتا تھا۔ پنیری لگ گئی لیکن اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ بھی بستی والوں کے لئے باعث عبرت تھا۔

دوسرے دن انہوں نے دیکھا کہ پوری زمین پر لمبے لمبے کانٹوں والی ناگ پھنی کے پودے ابھر آئے ہیں، چاروں طرف کانٹے ہی کانٹے بکھر گئے تھے اور ماحول اتنا بھیانک لگ رہا تھا کہ لوگوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

حیدر علی نے باپ سے کہا۔ "ابا! گھر واپس چلو کیوں یہاں سب کے سامنے مذاق اڑوا رہے ہو۔ کچھ نہیں کرپائیں گے ہم، کچھ بھی نہیں کرپائیں گے۔"

"چلو بھائی چلو، دیکھو کیا لکھا ہے تقدیر میں؟" چوہدری سردار علی نے مایوسی سے کہا اور گڑھی حیدر بیگ سے خاصا عرصے رہنے کے بعد واپس پلٹ پڑے۔

☆......☆......☆

فردوس جہاں کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ ذرا سی نیند آتی تو خواب میں حسینہ کا چہرہ ابھر آتا۔ بچے کی انگلی پکڑے سامنے آجاتی تھی اور پھر اس کی ہولناک باتیں بڑی خوفزدہ کرنے والی ہوتی تھیں۔

اس دن بھی شام کو وہ اپنے گھر میں موجود تھی، اس کے کہنے پر ماں نے اسے اوپر کی منزل پر کمرہ دیا تھا۔ بھائیوں نے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے اپنے کمروں میں سونے کے بجائے باہر صحن میں سوئیں گے اسے ڈرنا نہیں چاہئے۔ ہر بھائی راتوں کو آکر کمرے میں اسے جھانک کر دیکھتا تھا اسے دلاسے دیتا تھا۔ وہ سب کے سب بری طرح بگڑے ہوئے تھے اور چوہدری سردار علی کو گالیاں دیتے تھے۔ بڑے بھائی نے تو یہ بھی کہا تھا کہ وہ حیدر علی سے طلاق لے لے۔ لعنت بھیجے اس گھر پر جہاں روحوں کا بسیرا ہے۔ انہوں نے کیا ہے وہی بھریں، دوسرے کیوں مصیبت کا شکار ہوں۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن نجانے کیوں فردوس جہاں کے دل ودماغ پر ایک گہرا اثر تھا اور اس اثر سے نکل نہیں پارہی تھی۔

بات بالکل درست تھی۔ اس کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا لیکن گیہوں کے ساتھ تو گھن بھی پستا ہے اور وہ گھن ہی کی حیثیت رکھتی تھی، تو اس شام وہ اپنے کمرے کے باہر بیٹھی ہوئی ڈوبتے سورج کا منظر دیکھ رہی تھی کہ اس نے دور سے ایک عورت کو آتے دیکھا۔ چھوٹے سے بچے کی انگلی پکڑے چلی آرہی تھی، پہلے تو اس نے کچھ نہ سوچا لیکن پھر اچانک ہی اس کی نگاہوں میں حسینہ کا چہرہ گھوم گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھنے لگی۔ عورت نے اس کی طرف دیکھا، پھر اپنا داہنا ہاتھ فضا میں بلند کیا، دانت نکالے اور داہنا ہاتھ اس کی جانب ہلانے لگی۔ فردوس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔

سو فیصد وہ حسینہ ہی تھی اور اس نے فردوس جہاں ہی کو اشارہ کیا تھا۔ فردوس کی چیخ سن کر نیچے سے لوگ بھاگے اور آن کی آن میں اس کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اس سے پوچھ رہے تھے لیکن فردوس جہاں کی آواز بند ہوگئی تھی۔ وہ بس خوفزدہ نگاہوں سے اس طرف دیکھے جارہی تھی جہاں اب حسینہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ سب نے دلاسے دیئے اور سمجھایا اور کہا کہ یہ وہم ہے جو اسے خوفزدہ کر رہا ہے، بڑے بھائی نے بتایا کہ اس نے سب سے چھوٹے بھائی کو ایک جگہ بھیجا ہے، وہاں ایک بہت بڑے عالم ہیں جو گنڈے اور تعویذ کرتے ہیں۔ انہیں بلایا گیا ہے اور وہ آئیں گے تو گھر کو محفوظ کردیں گے اور پڑھی ہوئی کیلیں ٹھونک کر حصار بندی کردیں گے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ جب تک چوہدری سردار علی کے خاندان کا تصفیہ نہ ہوجائے وہ فردوس جہاں کو واپس نہیں جانے دیں گے۔

اور پھر وہی ہوا، اسی دن کی صبح جبکہ رات کو آخری بار کوئی دو بجے کے قریب فردوس جہاں کے بھائی فردوس جہاں کا جائزہ لے کر گئے تھے اور وہ سکون کی گہری نیند سو رہی تھی لیکن جب صبح کو اس کی ماں اس کے کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ فردوس جہاں کے ہاتھ پاؤں مسہری سے بندھے ہوئے ہیں اور اس کی گردن ایک طرف جھول رہی ہے۔ آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں۔ منہ کھلا ہوا ہے لیکن خون کا ایک قطرہ بھی آس پاس نہیں ہے۔

ماں کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور دوسرے لمحے وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔ فردوس جہاں بھی نور جہاں ہی کی طرح ماری گئی تھی۔ بھائی دیوانے ہوگئے، غصے سے آگ بگولا ہوکر بڑے بھائی نے فیصلہ کیا کہ چوہدری سردار علی کے گھرانے کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔

"حیدر علی کو بھی تو اطلاع دے دو، بعد میں تو جو ہوگا ہم دیکھ لیں گے۔" دوسرے بھائی نے مشورہ دیا۔

☆......☆......☆

صفدر علی بہت پریشان تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے جو کچھ ہو رہا تھا اس کے اثرات کاروبار پر بھی پڑ رہے تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے بڑی محنت سے کاروبار جمایا تھا اور ترقی کر رہے تھے، زمینوں وغیرہ سے ان کی دلچسپی ختم ہوگئی تھی لیکن پچھلے کئی مہینوں سے وہ مشکل کا شکار تھے۔ چوہدری سردار علی بیمار ہوکر اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد چوہدری صاحب زمینوں پر گئے تھے اور وہاں سے مصیبتیں گلے پڑ گئی تھیں، یہاں تک کہ چہیتی بہن جدا ہوگئی تھی، کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا، بڑی مشکل سے دل ودماغ پر قابو پایا تھا۔ اس وقت ایک اہم کاروباری معاملے میں حیدر علی کی ضرورت تھی لیکن وہ گڑھی حیدر بیگ جا کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک اہم شخص بیرون ملک سے آرہا تھا، جس کے ساتھ میٹنگ کرکے بہت سے کاروباری امور طے کرنے تھے۔ اس نے حیدر علی کو فون کیا۔

"بھائی کیا پروگرام ہے۔ الیاس بیگ دبئی سے آرہا ہے اس سے بات کرنی ہے۔"

"میں کیا کروں صفدر تم ہی بتاؤ۔ ابا جی گڑھی حیدر بیگ میں جمے ہوئے ہیں اور یہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لے رہے۔ کیا انہیں چھوڑ کر چلا آؤں۔"

"آخر اب وہ وہاں کر کیا رہے ہیں؟" صفدر علی نے جھلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بھوت بھوت کھیل رہے ہیں بلکہ بھوتوں کو خوش کرنے کی کوشش میں طرح طرح کے کام کر رہے ہیں جو ہو نہیں پارہے۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں صفدر علی نور جہاں تو اس دنیا سے چلی ہی گئی ہے اور جیسے وہ گئی ہے، تمہیں معلوم ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ہمارے باپ کی ضدوں نے ہم سے ہماری بہن چھین لی ہے اور صفدر علی ایک اور بات بتادوں تمہیں۔ لکھ لواسے، ہم سب بھی ایک ایک کرکے جانے والے ہیں۔ بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلینے سے بلی بھاگ نہیں جاتی، جو نور جہاں کے ساتھ ہوا ہے، وہی اب ہمارے ساتھ ہوگا۔"

"بابا ہو جائے، کم ازکم جان تو چھوٹے۔ ارے کوئی کام کی بات ہو تو بندہ غور بھی کرے۔ تم ذرا دیکھو کسی کی زمینوں کو ہتھیانے کے لئے کیا ظلم ڈھائے گئے اب جو کیا ہے وہ تو بھرنا ہی پڑے گا، مگر یہ عجیب بات ہے، حیدر علی کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی، یار میں کیا کروں تم بتاؤ؟"

فی الحال تم الیاس بیگ سے مل لو، تم اس کے ساتھ میٹنگ رکھ لو۔ میرا خیال ہے اسے تم آسانی سے مطمئن کرسکو گے، اس کے بعد اس سے ایک مہینے کا ٹائم لے لو، زیادہ سے زیادہ ہمیں تھوڑا سا نقصان ہوجائے گا۔ برداشت کرلیں گے۔ ابا جی یہاں جو کچھ کر رہے ہیں اس کے نتائج الٹے ہی نکل رہے ہیں، کہیں کچھ کامیابی نہیں ہورہی۔ اب میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ واپس چلیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں جتنا میں پریشان ہوں اتنے تم نہیں ہو صفدر علی، کچھ اس طرح کے واقعات یہاں ہوئے ہیں جو انتہائی ہولناک ہیں۔"

"تم کچھ بھی کہہ لو، میں ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور پھر اگر کچھ ہے بھی تو جو ہوگا دیکھا جائے گا، جس چیز کا ہم تدارک نہیں کرسکتے اس سے خوفزدہ ہوکر بھاگتے پھرنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"تم اس سے ملاقات کرلو۔" صفدر علی نے گہری سانس لے کر موبائل فون بند کردیا اور پریشانی سے گردن ہلانے لگا۔

☆......☆......☆

اسی شام تقریباً پانچ بجے اسے اپنے بزنس پارٹنر الیاس بیگ کا ٹیلیفون موصول ہوا۔

"صفدر علی، میں آگیا ہوں۔"

"کیا تم کب آگئے؟"

"بس سمجھ لو آج ہی آیا ہوں۔"

"مگر یار تم تو کل رات کو آنے والے تھے؟"

"کمال کرتے ہو اگر میں ایک دن پہلے آگیا تو کونسی مصیبت آگئی؟"

"نہیں مصیبت تو نہیں آئی، میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔"

"جو کام ہمیں کل کرنا ہے وہ کل کرلیں گے، لیکن آج میرے ساتھ میٹنگ تو کرلو۔"

"ہاں بالکل، بولو کب اور کہاں؟"

"ساڑھے آٹھ بجے میں تمہاری رہائش گاہ پر آجاتا ہوں۔"

"آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا، کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔"

"نہیں آج کل میں رات کا کھانا نہیں کھا رہا۔"

"ٹھیک ہے پھر تم آجاؤ، باقی ساری باتیں بعد میں کرلیں گے۔" صفدر علی نے کہا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

رات کو ساڑھے آٹھ بجے صفدر علی، الیاس بیگ کا انتظار کر رہا تھا کہ ملازم نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ صفدر علی ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا اور صفدر علی نے کھڑے ہوکر اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھا دیا تو الیاس بیگ ہنس پڑا۔

"آج کل میں کسی سے ہاتھ بھی نہیں ملاتا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"بیٹھو بیٹھو، مطلب بھی بتادوں گا۔" الیاس بیگ نے کہا اور صفدر علی تعجب سے اسے دیکھنے لگا، پھر وہ بیٹھ گیا۔

"ہاں...... تو سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟"

"یار بس آج کل ہم لوگ ایک عجیب سی مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ خیر چھوڑو تم سناؤ، کیا رہا، وہ جو سیمپل بھیجے گئے تھے وہ منظور ہوگئے۔"

"ان کا تو پتہ نہیں لیکن اور بہت سی منظوریاں مل گئی ہیں۔"

"کوئی نیا بزنس مل گیا ہے کیا؟"

"میں سرے سے بزنس مین ہوں ہی نہیں اور اگر تم مجھے الیاس بیگ سمجھ رہے ہو تو میں وہ بھی نہیں ہوں۔ تمہیں یاد ہے ایک بار کرسمس کی رات تھی، تمہارا دوست الیاس بیگ کہیں باہر سے آیا تھا اور اس نے تمہیں ایک ہوٹل میں دعوت دی تھی، وہاں تمہاری ملاقات ایک بندے سے ہوئی تھی، نام یاد ہے تمہیں اس کا؟"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو الیاس بیگ، تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"شکل بھی نہیں یاد ہوگی تمہیں اس کی۔ اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ بستی حیدر بیگ کا رہنے والا ہے اور یہاں لاہور میں زرعی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔"

"میری یادداشت ان دنوں بہت متاثر ہے الیاس بیگ، مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"یہ شکل بھی تمہیں یاد نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر الیاس بیگ نے اپنے بال پکڑے اور ایک ماسک اتار کر ایک طرف رکھ دیا، صفدر علی بری طرح اچھل پڑا تھا۔

"تت...... تم تم تم الیاس بیگ نہیں ہو؟"

"صورت یاد نہیں آئی تمہیں میری۔ میرا نام احمد دین ہے۔ نظام الدین کا بیٹا، وہ جسے تمہارے بہت بڑے خاندان نے موت کی سزا دلوائی تھی۔ صرف اس لئے کہ تم اس کی زمینوں کے چھوٹے سے ٹکڑے پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔"

صفدر علی کے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن منہ سے کچھ نہ نکلا۔

احمد دین نے پھر کہا۔ "اور اب ہماری روحیں بھٹک رہی ہیں۔ ہم سب انتقام میں سرگرداں ہیں۔ حیدر علی کی اور تمہاری ذمہ داری میری ہے۔ مجھے تم دونوں کو ہلاکت تک پہنچانا ہے لیکن طریقہ ذرا مختلف اختیار کیا جائے گا۔ بابا یعنی میرے والد کا کہنا ہے کہ کسی کو موت کا مزہ چکھاؤ تو بالکل اس طرح جیسے کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لئے جاتے ہیں۔ اس طرح کافی کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے، میں الیاس بیگ نہیں احمد دین ہوں اور صفدر علی تمہیں تمہاری موت کی سزا دینے آیا ہوں۔ بیکار کاروباری امور میں سر کھپا رہے ہو، موت بہت دلکش ہوتی ہے، اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے، بس یہ اطلاع دینے کے لئے آیا تھا تمہیں، چلتا ہوں۔"

صفدر علی کی جیسے پورے بدن کی جان نکل گئی تھی، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے الیاس بیگ یا احمد دین کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تو اسے ہوش آیا۔ اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دروازے سے باہر آگیا لیکن دور دور تک وہاں کسی کا پتہ نہیں تھا، خوف ودہشت کا ایسا غلبہ طاری ہوا اس پر کہ وہ پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچنے لگا۔ پھر دوسرے دن صبح وہ اپنی گاڑی کے ذریعے شاد پور چل پڑا تھا۔

☆......☆......☆

ہر طرف سے ناکامیاں ہی ناکامیاں ہورہی تھیں۔ حیدر علی الگ جھلایا ہوا تھا۔ سارے کام کاج چھوڑ کر یہاں گڑھی حیدر بیگ میں بیکار وقت ضائع ہو رہا تھا، نظام الدین اور اس کے اہل خاندان کی روحوں کو منانے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تھی۔

قبرستان سے مزدور بھاگ گئے تھے، کھیت میں ناگ پھنی کے پودے اگ آئے تھے اور بستی والے الگ تھوتھو کر رہے تھے۔ جدھر سے بھی ان کا گزر ہوتا لوگ نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ اب تو انہوں نے کھلم کھلا باتیں کرنا شروع کردی تھیں۔

حیدر علی نے باپ سے کہا تھا کہ واپس شاد پور چلیں، بیکار ہے کچھ نہیں ہوسکتا، لیکن سردار علی نے اب بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا، اس وقت بھی وہ ایک ڈرائیور کے ساتھ بستی کا چکر لگا رہا تھا شام کے جھٹپٹے فضاؤں میں اترتے چلے آرہے تھے۔

وہ دو تین بار نظام الدین کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا، دروازے پر تالا پڑا ہوتا تھا لیکن اس وقت پہلی بار اس نے دروازے کا تالا کھلا ہوا دیکھا تھا بلکہ دروازے کے دونوں پٹ بھی کھلے ہوئے تھے۔

اس نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "ذرا رکنا۔"

ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور اس کے بعد چوہدری سردار علی نیچے اتر آیا۔ وہ ڈرے ڈرے سے انداز میں آگے بڑھا۔ دروازے کے پٹ کھلے ہوئے تھے لیکن بائیں طرف کے احاطے کے قریب کوئی چارپائی پر سفید چادر اوڑھے ہوئے بیٹھا تھا۔ سردار علی کے قدم رک گئے، وہ بیٹھے ہوئے آدمی کو غور سے دیکھنے لگا لیکن چادر اس طرح چہرے پر پڑی ہوئی تھی کہ چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ سردار علی ہمت کرکے ایک ایک قدم آگے بڑھا اور اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔

"بھائی یہ نظام الدین کے گھر کا دروازہ آج کھلا ہوا ہے، کوئی اندر ہے کیا؟"

چارپائی پر بیٹھے ہوئے شخص نے چہرے سے چادر ہٹا دی اور دوسرے لمحے سردار علی کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ خود نظام الدین ہی تھا۔

(جاری ہے)

چوہدری سردار علی کے اعضا مفلوج ہوگئے۔ نظام الدین معصوم نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آیئے چوہدری سردار علی! بڑی خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر، بڑا ملنے کو

خوف

ایم اے راحت

قسط : 5

دل چاہ رہا تھا آپ سے، سوچ رہا تھا کسی وقت جاؤں گا آپ کے پاس، چلیں اچھا ہوا آپ خود ہی آ گئے۔''

چوہدری سردار علی نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔

نظام الدین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کہو چوہدری، کیسا رہا غرور کا انجام..... پر ابھی انجام کہاں ہوا ہے، پورا گھر پڑا ہے تمہارا، ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر ہمارے بے گناہ بیٹے کو موت کی سزا ہوئی تو ہم سب بھی زندہ نہیں رہیں گے، حرام موت مرنا پڑا چوہدری تمہاری وجہ سے، ارے یہ زمین کس کی ہوئی ہے، دو گز ٹکڑے کے لئے کیسے کیسے خوفناک کھیل کھیل لئے جاتے ہیں، پر سوچ کا فرق ہوتا ہے چوہدری صاحب! سوچ کا فرق ہوتا ہے، اسی اندھے پن سے تو دین منع کرتا ہے، اسی اندھے پن سے تو سب کچھ ہو جاتا ہے چوہدری صاحب.....!''

بمشکل تمام چوہدری سردار علی نے اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''معاف کر دو نظام الدین! معاف کر دو، غلطی ہوگئی ہم سے، معاف کر دو۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو چوہدری جی! اب مانگ رہے ہو معافی! سرکشی چوہدری سردار علی کبھی کسی کو راس نہیں آئی، ابھی کیا ہوا ہے، ایک بیٹی ہی گئی ہے، ایک ایک کو چن کر ماریں گے ہم چوہدری اور اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تم!''

''دیکھو نظام دین! تم جو کہو، ہم وہ کرنے کے لئے تیار ہیں، اگر کوئی جرمانہ ہے تو بتاؤ، ہم وہ جرمانہ ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔''

''ادا نہیں کر سکو گے چوہدری وہ جرمانہ تم!''

''تم کہہ کر تو دیکھو۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، ہماری زمینیں تو پھر کبھی آباد نہیں ہوں گی، اب تم ایسا کرو ہماری ان زمینوں کے بیچوں بیچ اپنے پورے گھر والوں کی قبریں کھدواؤ، ان سے کہو ان قبروں میں لیٹ جائیں اور چوہدری ان سب کو اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دو، جب تم ان کے اوپر مٹی ڈال کر ان کا آخری سانس بھی بند کر دو گے تو معاف کریں گے ہم تمہیں..... بس یہی ایک جرمانہ ہے اور کچھ نہیں۔''

نظام الدین فوراً ہی کھڑا ہوگیا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مکان کے اندر داخل ہوگیا تھا۔ اتنی دیر میں چوہدری سردار علی کا ڈرائیور پیچھے سے آ گیا۔

''سر جی! کوئی بات ہے؟'' اس نے سوال کیا اور چوہدری سردار علی خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا پھر اس کی نظریں نظام الدین کے گھر کے اندرونی حصے کی جانب اٹھ گئیں۔ دروازے کے باہر تالا پڑا ہوا تھا اور نظام الدین کا آس پاس کہیں پتہ نہیں تھا۔

چوہدری سردار علی خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''چلو میرا ہاتھ پکڑلو ذرا۔'' اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ڈرائیور کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر کانپتا ہوا ہی گاڑی تک پہنچ گیا۔

''ڈیرے چلو۔'' اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور ڈرائیور نے اسے گاڑی میں بٹھانے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆......☆......☆

حیدر علی سخت پریشان تھا۔ ایسی پریشانی بھلا کب کسی کو لاحق ہوئی ہوگی، موت کی آہٹیں اسے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھیں، سارے گھر کی ہی بری حالت تھی، اب اس وقت وہ کفارہ ادا کرنے کے لئے سرگرداں تھے اور کہیں شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی تو حیدر علی کے اندر بڑی جھلاہٹ پیدا ہو جاتی اور اس کا دل چاہتا کہ گڑھی حیدر بیگ کے قبرستان میں جائے اور چیخ چیخ کر نظام دین کے اہل خاندان سے کہے کہ میں بے گناہ ہوں، سزا دینی ہے تو چوہدری سردار علی کو دو اور اگر میری سزا بھی ضروری ہے تو پھر بیس مجھے بھی ختم کر دو، عاجز آ گیا ہوں، زندگی بچانے کے لئے اف کیا کیا جتن کروں۔

ڈیرے پر ہی تھا کہ موبائل پر فون موصول ہوا۔ اس نے نمبر دیکھے اور چونک پڑا۔ یہ نمبر فردوس جہاں کے بڑے بھائی اختر علی کا تھا۔ اختر علی بڑا بدمزاج آدمی تھا جبکہ چھوٹا بھائی ذرا نرم مزاج تھا۔ اس نے بہرحال فون ریسیو کیا۔

''ہیلو میں حیدر علی بول رہا ہوں۔''

''حیدر علی صاحب! آپ کے باپ کا بویا ہوا ہمارے سامنے آ گیا ہے، سنئے آپ، خوشخبری سن لیجئے، ہماری بہن فردوس جہاں اب اس دنیا میں نہیں ہے، آپ کے باپ کی بوئی ہوئی فصل ہمیں کاٹنی پڑ گئی ہے سمجھے، آپ آنا چاہیں تو آ جائیں ورنہ ہم شام تک اس کی تدفین کر دیں گے۔''

فون بند ہوگیا لیکن حیدر علی کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک بار پھر فون کا نمبر دیکھا، اپنے ذہن میں ان الفاظ کو دہرایا اور دوسرے لمحے اس کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ فردوس جہاں نے اپنی دانست میں جان بچانے کے لئے اپنے گھر کا رخ کیا تھا لیکن موت نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

اختر علی نے کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی، سخت غصے میں تھا۔ حیدر علی رو ہی رہا تھا کہ چوہدری سردار علی کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ ڈرائیور یہاں بھی انہیں سہارا دے کر ہی اندر لایا تھا کیونکہ چوہدری سردار علی کے قدم ڈگمگا رہے تھے لیکن حیدر علی کو اس طرح روتے دیکھ کر چوہدری سردار علی نے خود کو سنبھالا اور ڈرائیور کو باہر جانے کے لئے کہا۔ حیدر علی اپنی جگہ بیٹھا مسلسل رو رہا تھا۔

''کک..... کیا ہوا حیدر علی.....؟''

''وہی ہوگیا ابا جی! جو ہونا تھا، میری بیوی کو ہلاک کر دیا گیا ابا جی! فردوس جہاں اب اس دنیا میں نہیں ہے، اس کے گھر سے فون آیا تھا۔''

''کک..... کیا کہہ رہا ہے تو؟'' چوہدری سردار علی کی گلوگیر آواز ابھری۔

''مروا دیا ابا جی! آپ نے سب کو..... کاش ہم آپ کے ہاں نہ پیدا ہوئے ہوتے، ہم اس قدر لالچی نہیں تھے ابا جی! کیا کہیں آپ سے، باپ ہیں ہمارے۔''

''ارے بہت کچھ کہہ لیا بیٹا تم نے، سن لیا میں نے، یہیں گڑھی حیدر بیگ میں کچھ کرنا چاہو تو کر لو میرے ساتھ، کھودو نظام دین کی زمین پر ایک قبر، لٹا دو مجھے اس میں اور اوپر سے ڈال دو مٹی، کہہ دو گڑھی حیدر بیگ والوں سے کہ چوہدری سردار علی نے جو کچھ کیا، اس کی سزا پائی، کچھ بتا تو سہی مجھے روئے جا رہا ہے۔''

''فون آیا تھا فردوس جہاں کے گھر سے، اس کے بھائی اختر علی نے فون کیا تھا کہ تمہارے باپ کی بوئی ہوئی فصل ہمارے ہاں کٹ گئی ہے، ابا جی! جلدی کرو، میں جانا چاہتا ہوں۔''

''چلو چلو۔''

اور پھر باقی سب کچھ چھوڑ کر چوہدری سردار علی گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا۔ حیدر علی مسلسل روئے جا رہا تھا اور سردار علی اسے دلاسا بھی نہیں دے پا رہا تھا۔ دونوں لٹے پٹے گڑھی حیدر بیگ سے باہر نکلے تھے۔ ڈرائیور بیچارے کو کچھ علم نہیں تھا۔ حیدر علی اس سے گاڑی تیز چلانے کو کہہ رہا تھا اور ڈرائیور اس کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ اس طرح وہ لوگ شاد پور پہنچ گئے۔ شاد پور میں صفدر علی بھی آ گیا تھا اور فردوس جہاں کی موت کی اطلاع شاد پور پہنچ گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد صفدر علی، حیدر علی اور صفدر علی کی بیوی چل پڑے۔ فیروزہ خاصی پڑھی لکھی عورت تھی، اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا ورنہ خوف تو اس کے دل میں بھی تھا کہ جب فردوس جہاں اس انتقام کا شکار ہوگئی تو وہ بھی تو اسی گھرانے کی بہو ہے۔ ساری باتیں اس کے علم میں بھی تھیں، سسر نے سب کے لئے موت کا بیج بو دیا تھا۔ راستے میں فیروزہ نے صفدر علی سے کہا۔ ''میرے بارے میں کیا سوچا ہے صفدر علی!''

''ایں.....!'' صفدر علی نے چونک کر کہا۔

''میری زندگی بچانے کے لئے کچھ کر سکتے ہو؟'' فیروزہ نے پتھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

صفدر علی تھوڑے دن پہلے تک ان ساری باتوں کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اگرچہ نور جہاں کی موت نے اسے بہت متاثر کیا تھا لیکن مکمل طور پر وہ ان باتوں سے متفق نہیں ہو سکا تھا۔ اب پے در پے دو دھماکے ہوئے تھے، پہلا تو الیاس بیگ والا معاملہ جس میں اب کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی، اس طرح کے واقعات کو ذہن بڑی مشکل سے قبول کرتا ہے لیکن جب قبول کر لیتا ہے تو پھر نفی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ صفدر علی بری طرح خوف زدہ ہو کر شاد پور واپس آیا تھا، کسی کو دل کا حال بتا بھی نہیں سکا تھا کہ فردوس جہاں کے سانحے کی خبر ملی اور وہ مزید بوکھلاہٹ میں گرفتار ہوگیا۔ فیروزہ کے اس سوال نے اسے کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ واقعی فیروزہ تو اس خاندان کی فرد بھی نہیں تھی لیکن فردوس جہاں بھی تو اس خاندان کی فرد نہیں تھی پھر بھی اسے اس بھیانک موت کا مزہ چکھنا پڑا۔

فیروزہ نے پھر کہا۔ ''انوکھی سزا مل رہی ہے ہمیں صفدر علی! تمہارے گھر میں جو ہوا ہے، وہ سارے جہاں سے انوکھا ہے، آخر ہمارا کیا قصور ہے؟''

''قصور تو میرا بھی نہیں ہے فیروزہ! مجھ پر بھی تو عذاب نازل ہوا ہے۔'' حیدر علی جو فیروزہ اور صفدر علی کی باتیں سن رہا تھا اور فردوس جہاں کے غم میں ڈوبا ہوا تھا، چونک کر صفدر علی کو دیکھنے لگا۔

صفدر علی نے کہا۔ ''ہاں حیدر علی! کیا کہیں ہم اپنے باپ کے بارے میں اور کیا کہیں نظام دین کے بارے میں..... سزا دینی تھی چوہدری سردار علی کو لیکن لپیٹ میں ہم سب آ گئے، کم از کم میں تو ان سارے معاملات میں بری الذمہ تھا، مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ تم باپ، بیٹے بستی حیدر بیگ میں کیا کرتے پھر رہے ہو، مصیبت ہم سب کی آ گئی، میری پیاری بہن سب سے پہلے اپنے باپ کے گناہ کا شکار ہوئی اور اس کے بعد بیچاری بھابھی..... کیا کہوں، کیا نہ کہوں، الیاس بیگ میرے پاس آیا تھا لیکن کھیل ہی بدل گیا۔'' صفدر علی نے وہ کہانی سنائی جس نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ پھر بولا۔ ''شاد پور آیا تو تم اور ابا جی موجود نہیں تھے۔ کسی کو بتا بھی نہیں سکا کہ فردوس جہاں بھابھی کے المناک حادثے کی اطلاع ملی۔''

حیدر علی پھٹی پھٹی آنکھوں سے صفدر کو دیکھ رہا تھا، پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم تو مان ہی نہیں رہے تھے صفدر!''

''اب تو مان لیا میں نے، خدا کے واسطے مجھے بتاؤ، میں اپنے آپ کو اور اپنی بیوی کو کیسے بچاؤں؟''

حیدر علی نے غمزدہ ہو کر گردن جھکالی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے لیکن سب نفسا نفسی کا شکار تھے۔ فیروزہ نے کہا۔ ''اصولی طور پر کم از کم مجھے تو نہیں مرنا چاہئے کیونکہ میں اس خاندان کی فرد نہیں ہوں، آہ بیچاری فردوس بھابھی..... جان بچانے کے لئے گئی تھیں، مگر نہ بچ سکیں اور اب ہم نشانہ بننے والے ہیں، میں تمہیں ایک بات بتاؤں صفدر علی! میں فردوس جہاں بھابھی کے گھر سے واپس شاد پور نہیں آؤں گی، مجھے میرے گھر چھوڑ دینا، جو کچھ ہونا ہے وہیں جا کر ہو تو زیادہ اچھا ہے۔'' فیروزہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

صفدر علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حیدر علی بھی خاموش تھا۔ ایک ایسی ناگہانی پڑی تھی ان پر کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

آخر کار یہ لوگ فردوس جہاں کے گھر پہنچ گئے۔ یہاں کہرام مچا ہوا تھا، گھر کے باہر شامیانہ لگا ہوا تھا، لوگ جمع ہوگئے تھے، ان لوگوں کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا گیا، سب کو سب کچھ پتہ چل سکا تھا، کچھ لوگ تو لعنت ملامت بھی کرنے لگے، فیروزہ گھر کے اندر چلی گئی، حیدر علی روتا ہوا اپنے سالوں کے پاس پہنچ گیا۔ اختر علی اور افسر علی نے نفرت بھری نگاہوں سے دونوں بھائیوں کو دیکھا۔

''کہاں ہے فردوس جہاں، میں اسے دیکھ تو لوں۔''

''لعنت بھیجی جانی چاہئے تم لوگوں پر، وہ تمہارا باپ شیطان صفت آدمی اس نے خود ذلالت کا ثبوت دیا اور نشانہ بن گئی ہماری بہن...... اس بے غیرت شخص سے پوچھو کہ حرکت تو اس نے کی، بھگتنا ہم لوگوں کو کیوں پڑا؟'' اختر علی بدزبان بھی تھا اور تیز مزاج بھی..... خونخوار لہجے میں بولا۔

حیدر علی تو بیوی کے غم میں بہت زیادہ ڈوبا ہوا تھا لیکن صفدر علی کو طیش آ گیا۔

''تمہیں غیرت نہیں آتی، ایک بزرگ آدمی کے لئے اس طرح کے الفاظ ادا کرتے ہوئے۔''

''بے غیرت تو تم ہو، تمہارا پورا خاندان ہے جو دوسروں کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے چکر میں قتل و غارت گری پر اتر آیا تھا، سارا کیس پتہ چل چکا ہے ہمیں، تمہارے باپ نے سازش کی، ایک بندہ مروا دیا اور سزائے موت دلوا دی اس معصوم کو جس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا، ایک ایک بندہ تمہارا اسی طرح سے مرے گا، میری بہن تو اس دنیا سے چلی گئی صفدر علی! لیکن تمہارا پورا خاندان کتے کی موت مرے گا، کتے کی موت!''

صفدر علی کو جوش آیا تو اس نے ایک تھپڑ اختر علی کے منہ پر مار دیا لیکن اختر علی جو بہن کے غم میں دیوانہ ہو رہا تھا، یہ تھپڑ برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے فوراً ہی اپنے لباس سے ریوالور نکالا اور صفدر علی پر دھائیں دھائیں کر کے تین فائر کر دیئے۔

گولیاں صفدر علی کے سینے اور سر میں لگی تھیں۔ وہ آواز بھی نہ نکال سکا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔ حیدر علی جو تھوڑے فاصلے پر تھا اور کچھ کہنا سننا چاہتا تھا، بھائی کی شکل دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے اختر علی کی طرف دیکھا لیکن اس وقت اس نے اور جو کچھ دیکھا، وہ صرف نظر کا واہمہ نہیں تھا۔ جسم اختر علی کا تھا لیکن چہرہ احمد دین کا تھا اور احمد دین نے مسکراتے ہوئے اسے آنکھ ماری تھی۔

''نمبر تو تمہارا بھی آئے گا حیدر علی لیکن ذرا وقفے کے بعد..... یہ کام تو مجھے سرانجام دینا ہی تھا۔'' احمد دین کے یہ الفاظ بالکل صاف حیدر علی کے کانوں میں پڑے تھے۔

ادھر فائرنگ کی آواز سن کر باہر جمع لوگ اندر دوڑ پڑے تھے اور پھر انہوں نے یہ بھیانک منظر دیکھا تھا۔ صفدر علی لمحوں کے اندر موت کا شکار ہوگیا تھا۔ ایک بار پھر کہرام مچ گیا اور پھر زبردست لے دے ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس آ گئی اور اس نے اختر علی کو گرفتار کر لیا۔

فیروزہ پچھاڑیں کھا رہی تھی اور بین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''ہائے میں نے تو غصے میں کہا تھا کہ میں اپنے گھر چلی جاؤں گی، مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ آسمان کا نقش بن جائیں گے، ہائے میں بیوہ ہوگئی۔''

حیدر علی پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ بیوی کے غم میں شریک ہونے کے لئے آیا تھا کہ بھائی کا غم بھی مل گیا اور پھر خوب ہنگامہ آرائی ہونے لگی۔ پولیس اختر علی کو گرفتار کر کے لے گئی تھی، افسر علی بہن کی تدفین کی تیاریاں کرنے لگا تھا، خاندان کے دوسرے لوگ بھی شریک تھے۔ حیدر علی، فردوس جہاں کی صورت بھی نہ دیکھ سکا۔

بھائی کی لاش پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی تھی اور ایک نیا کھیل شروع ہوگیا تھا جس میں وہ الجھ کر رہ گیا۔ اختر علی کی نسبت افسر علی تھوڑا سا متحمل مزاج تھا۔ سارے معاملات کچھ اس طرح الجھ گئے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

حیدر علی کو گھر بھی اطلاع دینی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ باپ کا کیا حال ہوگا، بہو اور جوان بیٹا ایک ساتھ چلے گئے تھے۔ حیدر علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باپ کو اس موت کی اطلاع کیسے دے لیکن بہرحال اس نے آسیہ کے شوہر رحمان خان کو فون کر کے ساری خبریں پہنچائیں اور رحمان خان سے کہا کہ وہ یہاں آنے کے بجائے شاد پور پہنچ جائے۔

چوہدری سردار علی کو اطلاع دینا ضروری تھا۔ یہ اطلاع رحمان کے ذریعے ہی پہنچائی گئی۔ بہرحال تمام تر ضروری کارروائیوں کے بعد لاش حیدر علی کو حاصل ہوئی اور وہ اسے لے کر شاد پور چل پڑا جہاں چوہدری سردار علی کو بیٹے کی موت کی اطلاع پہنچا دی گئی تھی اور چوہدری سردار علی کی حالت خراب تھی۔ خاندان شدید بربادی کا شکار ہوگیا تھا۔

چوہدری سردار علی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''نظام دین، احمد دین پہلے مجھے زندگی سے محروم کر دو..... مجھے مار دو اس کے بعد تمہارا جو دل چاہے کرتے رہنا، مجھ سے یہ غم اب دیکھے نہیں جاتے۔''

لوگ شریک ضرور ہوئے تھے لیکن اب صورتحال کا سبھی کو پتہ تھا۔ سردار علی سے کسی کو کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ چوہدری سردار علی پر ایک طرح کی ہیجانی کیفیت طاری تھی، نہ سوتا تھا، نہ کھاتا پیتا تھا، صحت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ آسیہ جو چوہدری سردار علی کی بیٹی تھی، باپ کو دلاسے دے رہی تھی۔ شوہر رحمان خان کا انداز ذرا مختلف تھا۔ اس کا موقف تھا کہ باپ کا گناہ رنگ لا رہا ہے، فیروزہ اپنے گھر چلی گئی تھی، حالانکہ اس سے کہا گیا تھا کہ عدت کے لئے سسرال میں ہی رہ جائے لیکن اس نے لعنت بھیجتے ہوئے کہا تھا کہ اس سسرال نے اسے صرف موت دی ہے، شوہر تو مر گیا لیکن سسر کا گناہ اسے بھی نہیں چھوڑے گا۔

☆......☆......☆

کوئی بات چھپنے کا اب سوال ہی نہیں تھا۔ ایک واقعہ تو تھا نہیں، نور جہاں کی موت پھر صفدر علی اور فردوس جہاں کی موت..... اختر علی کا کیس، بلکہ اختر علی کے وکیل نے چوہدری سردار علی کے واقعے کو باقاعدہ بنیاد بنایا تھا اور اختر علی کے جنون کو پراسرار قوتوں کا عمل بتایا تھا۔ اس بات کی گواہی حیدر علی بھی دے سکتا تھا لیکن اس کے بھائی کا قتل ہوا تھا، وہ اپنے بھائی کے قاتل کی مدد کیوں کرتا۔

اخبارات کو ایسی دلچسپ کہانیاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں، چنانچہ وہ اپنی طرف سے بھی ان واقعات میں مرچ مسالا ڈال رہے تھے۔ بعض اخبارات نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ جب بے گناہ خاندان کے چشم و چراغ احمد دین نے رب شاہ کو قتل نہیں کیا تھا تو پھر کس نے رجب شاہ کو قتل کیا، پولیس اس سلسلے میں چوہدری سردار علی سے تفتیش کیوں نہیں کرتی، رجب شاہ کے اصل قاتل کون ہیں؟

حیدر علی بھی ان اخباری بیانات کو پڑھ رہا تھا۔ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ چوہدری سردار علی کو حویلی شاد پور سے ہٹا کر شہر منتقل کر دیا۔ اس سلسلے میں اس نے شہر میں ایک شناسا کا گھر استعمال کیا تھا، چوہدری کو اس وقت تفصیل نہیں بتائی گئی تھی لیکن پھر حیدر علی نے اسے اس خدشے سے آگاہ کیا تھا۔

''میں خود بھی سوچ رہا تھا، میری ایک بات مانو گے حیدر علی.....؟'' چوہدری سردار نے کہا۔

''کیا ابا جی.....!''

''میں پولیس کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کئے لیتا ہوں، میں کہے دیتا ہوں کہ رجب شاہ کو میں نے قتل کیا تھا اور الزام احمد دین پر ڈلوا دیا تھا، اصل قاتل میں ہوں، مجھے گرفتار کر لیا جائے، مجھے موت کی سزا دے دی جائے، اس بات کی امید کی جا سکتی ہے حیدر علی کہ اگر مجھے میرے جرم کی سزا مل جائے تو شاید نظام دین کی روح کو سکون مل جائے، اس کا اصل دشمن تو میں ہی ہوں نا؟''

حیدر علی کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے رجب شاہ کو قتل کیا تھا ابا جی.....؟''

''م..... میرا مطلب یہ ہے کہ قتل تو میں نے ہی کرایا تھا اسے۔''

''ابا جی! ہمیں تھوڑا سا تو سکون لے لینے دیں، میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمیں زندہ رہنے دیں، ایک ایک کر کے سب دنیا سے جا رہے ہیں، اب ہم کیا بچیں گے لیکن زندگی کی کوشش تو کر لینے دیں، آپ پولیس کے سامنے یہ اقرار کریں گے تو وہ بھی مارے جائیں گے جن سے آپ نے یہ کام کرایا ہے، آپ یہ دیکھیں کہ روحوں کو جب باقی سب کچھ معلوم ہے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ رجب شاہ کو قتل کرنے والے کون تھے لیکن انہوں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ ابا جی! روحوں نے انہیں نشانہ نہیں بنایا، آپ خدا کے واسطے یہاں خاموشی سے رہیں، میں نہیں چاہتا کہ پولیس یا اخباری رپورٹر آپ تک پہنچیں، ہمیں کوشش کر لینے دیں ابا جی! اب تو میں اکیلا ہی رہ گیا، میرا بھائی چلا گیا، بس میں اور کیا کہوں آپ سے؟'' حیدر علی رونے لگا۔

چوہدری سردار علی نے گردن جھکالی پھر بولا۔ ''کچھ بھی نہیں ہو سکتا، کوئی بھی ایسی ترکیب نہیں ہے جس سے ان روحوں کو باقی لوگوں سے انتقام لینے سے روکا جائے، میں نے تم سے کہا تھا کہ کسی عامل کو پکڑو، حصار بنا دے ہمارے لئے، عامل تو بچا سکتا ہے نا.....؟''

''وہ بھی کوشش کروں گا میں حالانکہ ایسے سچے عامل کہاں ملتے ہیں، ہاں ایسے بے شمار عامل مل جائیں گے جو اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا عامل کہیں گے لیکن اصل میں کچھ بھی نہیں ہوں گے۔''

خاندان جس کے ہاں حیدر علی نے چوہدری سردار علی کو منتقل کیا تھا، دو افراد پر مشتمل تھا۔ حاجی حمید خان اور ان کی بیگم..... حاجی صاحب کے بیٹے وحید خان کو حیدر علی نے ملک سے باہر بھجوایا تھا اور اسے وہیں ملازمت دلوا دی تھی۔ حمید خان اور ان کی بیگم جو بیچارے خاصے معمر لوگ تھے، یہیں رہتے تھے بہرحال حیدر علی کا خیال بالکل درست تھا، پریس رپورٹر تفصیلات معلوم کرنے کے لئے شاد پور پہنچ گئے، انہوں نے حیدر علی سے ملاقات کی۔ ''ہم کچھ تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی فرمایئے!''

''چوہدری سردار علی صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''نہیں!''

''کیوں.....؟''

''بس پے درپے حادثات نے ان کا ذہنی توازن خراب کر دیا ہے، بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہیں، صحت بھی خراب ہے، اس لئے انہیں کسی سے ملنے سے روک دیا گیا ہے۔''

''مگر وہ بہت سے اہم انکشافات کر سکتے ہیں مثلاً یہ کہ اگر چوہدری نظام دین کا خاندان آپ لوگوں سے انتقام لینے پر تل گیا ہے تو اس کا مقصد ہے کہ وہ خاندان بے گناہ ہے اور جس قتل کا الزام اس خاندان کے نوجوان احمد دین پر ڈالا گیا تھا، وہ قتل احمد دین نے نہیں کیا ورنہ ان کی روحیں اس طرح انتقام کی دیوانی نہ ہو جاتیں۔''

''محترم! اگر روحوں کے بارے میں آپ کی معلومات بہت زیادہ ہیں تو براہ کرم ہماری بھی ان سے ملاقات کرا دیجئے۔''

''دیکھئے آپ بات کو دوسرا رخ دینے کی کوشش نہ کریں، یہ خیال تو ذہن میں آتا ہی ہے کہ آخر کچھ پراسرار روحیں ایک خاص بات کا انتقام لینے کے لئے آپ کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں۔''

''اللہ سے دعا ہے کہ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی کوئی واقعہ ہو جائے، پھر آپ بتایئے کہ روحوں کو کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے یا نہیں!''

بہرحال خاصی تلخ جملے بازی ہوئی اور حیدر علی نے آخر کار ان لوگوں کو رخصت کر دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اسے یہ تشویش بھی ہو گئی تھی کہ یہ اخباری نمائندے کسی کو معاف نہیں کرتے۔ پولیس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی جائے گی، اس کے لئے حیدر علی نے ایک وکیل صاحب سے رابطہ کیا۔ بہت ہی قابل وکیل تھے۔ اس نے اپنے اس خدشے کا اظہار وکیل صاحب سے کیا تو وکیل صاحب نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں حیدر علی صاحب! ایسا ہو تو سکتا ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں چوہدری صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری کرا لی جائے۔''

''مناسب نہیں ہوگا، اس خدشے کا احساس ایک طرح کا ثبوت بن جائے گا کہ آپ کو چوہدری صاحب کے کسی جرم کا احساس ہے یا شبہ ہے، آپ ضمانت قبل از گرفتاری نہ کرائیں بلکہ اس طرف توجہ ہی نہ دیں، میں وکالت نامہ سائن کئے دیتا ہوں، اگر اس طرح کی کوئی بات ہو تو فوراً مجھ سے رجوع کریں، اول تو چوہدری صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ پولیس ان پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرے گی اور پھر روحیں اس طرح کا عمل تو کر سکتی ہیں لیکن کوئی روح اپنی بے گناہی کا ثبوت نہیں دے سکتی چنانچہ یہ معاملہ اس حد تک جائے گا نہیں پھر بھی میں حاضر ہوں، آپ اطمینان رکھئے گا۔''

بیچارہ حیدر علی ایک طرف تو موت کے خوف کا شکار تھا، دوسری طرف بیوی، بھائی اور بہن کی موت کا غم تھا۔ عجیب وغریب کیفیت ہو گئی تھی اس خاندان کی بستی شاد پور کے ایک ایک شخص کو ساری تفصیل معلوم ہو چکی تھی، لوگ باتیں کرتے تھے اور اکثر شاد پور کی چوپالوں میں اس بات کا تذکرہ ہوتا تھا۔

کچھ لوگ کہتے تھے۔ ''ساری باتیں اپنی جگہ لیکن بیچارے سردار علی کی بہوئیں صرف اس لئے اس مصیبت کا شکار ہوئیں کہ وہ اس خاندان میں شامل تھیں۔''

''بھائی کون کیا کہہ سکتا ہے، سنا ہے چوہدری سردار علی بستی سے بھاگ گیا ہے۔''

''ان روحوں سے بھاگ کر جائے گا کہاں، آخر ظلم کی سزا تو ملتی ہی ہے، اب بندہ چاہے بھاگے یا کچھ بھی کرے۔''

''یہ سب چوہدری سردار علی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔'' جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔

کاروبار تقریباً چوپٹ ہو گیا تھا۔ اب اس خاندان کے ہر فرد کو یہ احساس تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ پاتال کی گہرائیوں میں بھی چھپیں، نظام دین کے خاندان کی بے چین روحیں انہیں کہیں نہیں چھوڑیں گی، اس کا ثبوت فردوس جہاں کی موت تھا۔

صفدر علی کی بیوی فیروزہ اپنے گھر چلی گئی تھی، لیکن کیفیت وہی تھی، سوکھ کر کانٹا ہوئی جا رہی تھی۔ اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ جب فردوس جہاں اپنے گھر میں محفوظ نہ رہی تو وہ بھی نہیں بچے گی۔ اس کے اہل خاندان اسے تسلی دیتے تھے، گھر میں پتہ نہیں کیا کیا جتن کئے جا رہے تھے۔

فیروزہ کے ماں، باپ کہتے تھے۔ ''بیٹا! بے شک تو اس خاندان کی بہو تھی مگر تو نے تو کسی پر ظلم نہیں کیا، تو نے کوئی ایسا عمل تو نہیں کیا جو نظام دین کے خاندان کو نقصان پہنچاتا، پھر وہ روحیں تجھ سے انتقام کیوں لیں گی؟''

''بابا! فردوس جہاں نے بھی ایسا کوئی عمل نہیں کیا تھا لیکن وہ ماری گئی، نہ صرف وہ ماری گئی بلکہ اس کا بیچارہ بھائی بھی عذاب میں گرفتار ہو گیا، اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے، آپ دیکھ لیجئے آخر کار ایک دن وہ روحیں میرے پاس بھی پہنچ جائیں گی۔''

سب دلاسے دیتے تھے لیکن فیروزہ ایک طرح سے ذہنی مریضہ بن کر رہ گئی تھی۔ ماں، باپ اسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے اور بھی بہنیں تھیں جو اپنی بہن کے لئے انتہائی پریشان اور غمزدہ تھیں۔

فیروزہ کے خاندان میں ایک تقریب تھی۔ وہ لوگ اس تقریب میں گئیں۔ فیروزہ کو بھی زبردستی لے جایا گیا تھا۔ تقریب جاری تھی، اس میں مرد اور عورتیں شامل تھیں کہ اچانک فیروزہ نے ایک شخص کو دیکھا اور اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس نوجوان کو دیکھنے لگی جو سو فیصد صفدر علی کا ہمشکل تھا۔ یہ ایک ناقابل یقین سی بات تھی۔ ہمشکل بے شک ہوا کرتے ہیں لیکن ایسا ہمشکل اور پھر فیروزہ نے اس لباس پر بھی غور کیا جو اس ہمشکل نے پہنا ہوا تھا، وہ لباس فیروزہ اچھی طرح پہچانتی تھی بلکہ یہ سوٹ اسی نے صفدر علی کو سلوا کر دیا تھا۔ وہ بے اختیار ہو گئی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی صفدر علی کے ہمشکل کے پاس پہنچ گئی۔ صفدر علی کے ہمشکل نے اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔ ''میں تمہاری ہی تلاش میں یہاں آیا تھا فیروزہ! مجھے پتہ تھا کہ تم یہاں آئی ہوئی ہو۔''

''صف...... صف...... صفدر، صفدر!'' فیروزہ نے کہا اور اس کا دماغ چکرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر صفدر علی کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن صفدر علی پیچھے ہٹ گیا اور فیروزہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گئی۔ بہنوں کے ساتھ آئی تھی، بہنیں دوڑ پڑیں اور پھر ہنگامی حالات میں فیروزہ کو اٹھا کر گھر لایا گیا۔

ڈاکٹر کو بلایا گیا تو ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد کہا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے بس ایسے ہی چکر آ گیا ہوگا۔ خاصی لے دے ہونے لگی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے دو تین بار صفدر علی کو آوازیں بھی دیں تھیں۔

''فیروزہ! ہوش میں آؤ، کسے آواز دے رہی ہو؟''

''وہ صفدر، وہ وہاں تھا، وہ صفدر ہی تھا، میں قسم کھا کر کہتی ہوں، وہ صفدر ہی تھا۔''

''کہاں......؟''

''وہیں اس تقریب میں وہی لباس پہنے ہوئے تھا، مجھے دیکھ کر مجھ سے بات بھی کی تھی، خدا کی قسم وہ صفدر ہی تھا۔''

فیروزہ کا باپ ہمدردی کی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا لیکن کچھ ہی دیر کے بعد وہ خود بھی دنگ رہ گیا۔ ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی تھی۔

''صاحب! داماد جی آئے ہیں، ڈرائنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم......؟'' فیروزہ کے والد نے کہا اور ڈرائنگ روم کی جانب چل پڑا۔ ڈرائنگ روم میں واقعی صفدر علی موجود تھا، وہ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

''صفدر! تم تم......؟'' فیروزہ کے والد کی پھٹی پھٹی آواز ابھری۔

''جی بابا! یہ میں ہی ہوں لیکن کچھ مشکلات کا شکار ہو گیا ہوں، آپ کو میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔''

''صفدر علی تم تو......!''

''یہی کہیں گے نا کہ میں تو مر چکا تھا، میری تدفین بھی ہو گئی تھی؟''

''ہاں...... ہاں!''

''بابا ہمارے خاندان سے ایک بہت بڑی غلطی ہوئی ہے، بہت ہی بڑی غلطی...... یہ سن ہی لیا ہوگا آپ نے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ کا گناہ اولاد کو برباد کر دیتا ہے، ہمارا خاندان تباہ ہو رہا ہے، میں بہت ہی پراسرار حالات کا شکار ہوا ہوں، ابھی کچھ بھی نہیں کر سکتا میں، آپ ذرا فیروزہ کو دلاسا دیں، اسے سنبھال کر رکھیں، میں کوشش کر رہا ہوں کہ حالات ٹھیک ہو جائیں۔''

''مگر بیٹے! تم زندہ ہو؟ تم نے فیروزہ کو دیکھا، کیا حال ہو گیا ہے اس کا، زندہ درگور ہو گئی ہے وہ، یہ کیسا انصاف ہے؟''

''سب کچھ مکافات عمل ہے بابا! گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے، یہ تو پرانی کہاوت ہے، دیکھیں تقدیر ہمارے لئے کیا فیصلہ کرتی ہے؟''

''اور تمہارے قتل کے الزام میں بیچارہ فردوس جہاں کا بھائی گرفتار ہے۔''

''میں بھی اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں، آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔''

''ہاں بولو مگر ایک کام کرو فیروزہ نے تمہیں تقریب میں دیکھا تھا، اس کی جو کیفیت ہوئی، تمہیں اندازہ تھا؟''

''میں بھی فیروزہ کو تسلی دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں بس، ہم دونوں ایک بار پھر یکجا ہو جائیں گے۔''

''مگر بیٹا! ایک بات کا جواب دو، گولی لگی تھی تمہیں؟''

''جی بابا......!''

''اور ڈاکٹروں نے تمہاری موت کی تصدیق بھی کر دی تھی؟''

''جی بابا......!''

''پھر تمہاری باقاعدہ تدفین ہوئی تھی؟''

''بس یہیں سے کھیل بدل گیا تھا، اصل میں مرنے کے بعد روحوں کو کیا حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، نہ میں جانتا ہوں نہ آپ...... وہ کیا کر سکتی ہیں اور کیا نہیں کر سکتیں...... یہ بھی کسی کے علم میں نہیں ہے، ساری باتیں اپنی جگہ ہیں، آپ ایک کام کیجئے بیچارے اختر علی پر مقدمہ قائم ہے، اس کی پیشیاں چل رہی ہیں، ادھر بھائی حیدر علی اس سلسلے میں بھرپور کارروائی کر رہے ہیں، آپ اختر علی کے وکیل کو بتایئے کہ میں زندہ ہوں اور مجھے عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے بابا! آپ یہ ماحول پیدا کر لیجئے بلکہ آپ یوں کریں کہ افسر علی سے ملاقات کریں اور انہیں ساری تفصیل بتائیں۔''

''مگر ایک بات بتاؤ صفدر علی! تم خود کیوں نہیں چلے جاتے، اپنے بھائی سے بات کرو۔''

''یہی تو ایک افسوسناک عمل ہے، میں نے کہا نا آپ سے یہ روحوں کا کھیل ہے اور روحیں جس طرح کام کرتی ہیں، وہ میں یا آپ کیسے جان سکتے ہیں۔''

''فیروزہ کو تسلی تو دے دو بیٹے!''

''آپ آیئے میرے ساتھ میں فیروزہ سے ملاقات کئے لیتا ہوں۔''

صفدر علی ایک بار پھر فیروزہ کے سامنے پہنچ گیا اور فیروزہ اسے دیکھ کر بے اختیار ہو گئی۔

''صفدر آپ، آپ......؟''

''ہاں فیروزہ! یہ میں ہی ہوں۔''

''صفدر! مگر آپ، آپ......!''

''بابا کو میں نے ساری تفصیل بتا دی ہے فیروزہ! تمہارے علم میں یہ بات ہے کہ نور جہاں اور فردوس جہاں اس دنیا سے چلی گئیں، ہم سب کے لئے نظام دین کا عہد ہے کہ وہ ہمیں فنا کئے بغیر دم نہیں لے گا۔ فیروزہ! ہم بھی جدوجہد کر رہے ہیں، دیکھیں وقت کیا کہتا ہے، بس ایک درخواست ہے تم سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھو، میں بہت سی کوششوں میں مصروف ہوں، میں نے بابا سے وعدہ کیا ہے کہ آخر کار ہم یکجا ہو جائیں گے اور اس مشکل سے نکل جائیں گے۔ فیروزہ! اس وقت تک اپنے آپ کو سنبھالے رکھو، بس یہی کہنے آیا تھا میں تم سے!''

''صفدر! آپ کہیں نہ جائیں، آپ یہیں ہمارے ساتھ رہیں، وہ منحوس حویلی ہمارے لئے عذاب گھر بن گئی ہے، اس سے نجات حاصل کر لیں، میں تو اب وہاں قدم بھی نہیں رکھوں گی۔''

''ہم دیکھیں گے کہ ہم کہاں رہ سکتے ہیں فیروزہ! تم بس اپنے آپ کو سنبھالے رکھو ٹھیک ہے؟''

فیروزہ نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔ باپ سامنے موجود تھا اس لئے زیادہ جذباتی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے صفدر علی کو دیکھا اور بولی۔ ''تھوڑی دیر کے لئے میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں صفدر علی!''

''فیروزہ! ابھی نہیں، اگر ہم جذباتی ہو گئے تو زندگی کا کھیل اس طرح بگڑ جائے گا کہ سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔''

فیروزہ نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی تھی پھر اس نے کہا۔ ''میرے لئے یہی بہت بڑی بات ہے کہ آپ زندہ ہیں، دیکھیں جو اللہ کا حکم ہوگا، وہی ہوگا، ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔''

''چلتا ہوں فیروزہ!'' صفدر علی نے کہا اور اس کے بعد وہ فیروزہ کے والد کے ساتھ باہر نکل آیا۔

''بابا! آپ فوری طور پر اختر علی کے گھر جایئے، ان سے بات کیجئے، غالباً ستائیس تاریخ کو اختر علی کی عدالت میں پیشی ہے، افسر علی کو ساتھ لے کر آپ ان کے وکیل سے ملیں اور ان سے کہیں کہ صفدر علی زندہ ہے اور اختر علی پر قتل کا الزام نہیں بنتا، اس نے بے شک صفدر علی پر گولی چلائی ہے لیکن صفدر علی اس کی چلائی ہوئی گولی سے مرا نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹے! لیکن اس بات پر مجھے تعجب ہے۔''

''بابا! میں نے آپ سے کہا نا یہ روحوں کا کھیل ہے، ظالم اور مظلوم کا کھیل ہے، اس کھیل کو مکمل طور پر ختم کرنا خاصا مشکل ہوگا دنیا کے لئے لیکن کبھی کبھی انسانی زندگی میں کچھ ایسی کہانیاں بھی شامل ہو جاتی ہیں جنہیں ناقابل یقین ہی قرار دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا ہے، آپ کوشش کریں، میں چلتا ہوں۔''

''صفدر علی...... تھوڑا سا تو رکو۔''

''نہیں بابا! مجبوری ہے۔'' صفدر علی نے کہا اور اس کے بعد واپس مڑتے ہوئے بولا۔ ''براہ کرم میرا پیچھا نہ کیجئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔

فیروزہ کے والد غلام احمد خاموشی سے دروازے کو دیکھتے رہ گئے لیکن بہرحال اس کے بعد گھر میں ایک دم خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، فیروزہ بھی سنبھل گئی تھی، اس نے اپنی بہنوں کو ساری تفصیل بتائی اور سارا گھر خوشی میں ڈوب گیا لیکن فیروزہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اب بھی حالات پر اعتماد نہیں ہے، بے شک صفدر زندہ ہیں لیکن کیا کہا جا سکتا ہے کہ کب نظام دین کے گھر کی روحیں ادھر کا رخ کریں اور ہم دونوں کو بھی موت کی نیند سلا دیں۔''

ادھر غلام احمد سرگرم عمل ہو گئے تھے۔

چوہدری سردار علی کے حوالے سے ان کے بھی اختر علی گھرانے سے تعلقات تھے۔ فردوس جہاں اور ان کی بیٹی ایک ہی گھر کی بہوئیں تھیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اب تو اس گھرانے سے کسی قسم کی شناسائی کا اظہار بھی خوف کا باعث بن جاتا تھا کہ کہیں نظام دین کے خاندان کی روحیں اس شناسائی اور رابطے پر دشمن نہ بن جائیں لیکن بہرحال یہ ایک انسانی زندگی کا سوال تھا حالانکہ بات ناقابل یقین تھی۔ وہ خود بھی صفدر علی کی تدفین میں شریک تھے اور ان کے سامنے ہی صفدر علی کی میت کو لحد میں اتارا گیا تھا لیکن پھر بعد کی کہانی کیا ہوئی...... یہ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا۔ اپنے طور پر خیالی گھوڑے دوڑاتے ہوئے آخر کار وہ فردوس جہاں کے گھر پہنچ گئے۔

یہ گھرانہ سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چوہدری سردار علی کے تھوڑے سے لالچ نے نجانے کہاں کہاں غم پہنچا دیا تھا۔ افسر علی اس وقت اپنے گھر میں ہی موجود تھا۔ اس نے نڈھال سے انداز میں غلام احمد کا استقبال کیا۔

''آیئے انکل۔ فیروزہ کا کیا حال ہے، یقیناً آپ لوگ بھی اس لالچی انسان کے لالچ کا شکار ہو گئے، فیروزہ بہن تو خیریت سے ہے؟''

''افسر علی! ایک بہت اہم بات کرنی ہے تم سے۔'' غلام احمد نے رازداری سے کہا۔

''جی انکل! فرمایئے۔'' اس وقت کمرے میں افسر علی اور غلام احمد تنہا ہی تھے۔

''تم نے اختر علی کیس کی پیروی کے لئے وکیل صاحب کا انتخاب تو کر ہی لیا ہوگا؟''

''ہاں میرے وکیل صاحب کا نام نبیل احمد ہے۔''

''مشہور ایڈووکیٹ ہیں، تو نبیل احمد کیا کہتے ہیں؟''

''ان کا کہنا ہے کہ بھائی صاحب کو سزا سے تو نہیں بچا سکیں گے لیکن ہو سکتا ہے یہ سزا، سزائے موت نہ ہو۔'' افسر علی نے افسردگی سے کہا۔

''میں تمہارے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔''

''خوشخبری......؟ وہ بھی ہمارے لئے، کیسی باتیں کر رہے ہیں انکل! بہن بے بسی کی موت مر گئی، بھائی موت کے شکنجے میں ہے اس کے بعد بھی کوئی خوشخبری ہو سکتی ہے ہمارے گھر کے لئے......؟'' افسر علی بولا۔

''فردوس جہاں کی موت کے سانحے کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے لیکن اختر علی کے لئے اب کوئی خطرہ نہیں۔''

''وہ کیسے......؟''

''اس لئے کہ صفدر علی زندہ ہے۔''

افسر علی عجیب سی نظروں سے غلام احمد کو دیکھنے لگا۔ اسے غلام احمد کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔ غلام احمد نے اس کی کیفیت محسوس کر کے کہا۔ ''تمہیں اس بات پر یقین نہیں آیا؟''

''ہم اس کی تدفین میں شریک نہیں تھے انکل! لیکن ہمیں اس کی موت کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔''

''میں اس کی تدفین میں شریک تھا اور اسے میری آنکھوں کے سامنے قبر میں اتارا گیا تھا لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ میں اپنے داماد کے بارے میں کوئی افواہ نہیں اڑا سکتا۔''

''انکل! یہ بات آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟''

''اس بنیاد پر کہ میں خود اس سے مل چکا ہوں۔''

''کب......؟ کہاں......؟'' افسر علی نے بے چینی سے پوچھا۔

غلام احمد نے اسے پوری تفصیل بتا دی اور افسر علی سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے انکل!''

''سردار علی کا خاندان اپنی بداعمالی کے نتائج بھگت رہا ہے، بے شک نہ صرف دنیا کے لئے بلکہ خود ہمارے لئے بھی یہ سب کچھ ناقابل یقین ہے لیکن دنیا کی تاریخ میں مکافات عمل کا تصور ایک ٹھوس حقیقت ہے، انسانوں کی بداعمالی طوفان نوح کو روک سکتی ہے تو یہ تو ایک معمولی سا واقعہ ہے، قدرت اسی طرح معجزہ نمائی کر کے انسانوں کو احساس دلاتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں انکل! لیکن ہم اس بات کو ثابت کیسے کریں گے کہ صفدر علی زندہ ہے؟''

''ستائیس تاریخ کو اختر علی کی پیشی ہے۔''

''جی...... انکل!''

''یہ بات مجھے صفدر علی نے ہی بتائی تھی۔''

''اوہ...... اور کیا کہا تھا؟''

''اور تو کچھ نہیں کہا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور عدالت میں پیش ہوگا۔''

''اس نے کہا تھا؟''

''کہا تو نہیں تھا لیکن یہ ضرور کہا تھا کہ میں تم سے مل کر کہوں کہ تم اختر علی کے وکیل کو یہ بات بتاؤ۔''

''بڑی عجیب سی بات ہے کیا کریں......!'' افسر علی سوچ میں ڈوب گیا پھر چونک کر بولا۔ ''ایک کام کرتے ہیں، شاد پور جا کر حیدر علی سے ملتے ہیں، اسے اپنے بھائی کی زندگی کے بارے میں ضرور معلوم ہوگا۔''

''کوئی حرج نہیں ہے لیکن یہ کام میں کرتا ہوں، تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا، میں خود چلا جاتا ہوں۔''

''سب کچھ اللہ بہتر جانتا ہے انکل! ہم تو دہرے غم کا شکار ہوئے ہیں، ہمارا تو قصور بھی نہیں تھا، جوان بہن چلی گئی اور اب بھائی بھی مصیبت میں گرفتار ہے، کاش کچھ ہو جائے۔''

''اللہ بہتر کرے گا، ہم دوسروں کے عذاب کا شکار ہوئے ہیں، دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' غلام احمد نے کہا۔

☆......☆......☆

حویلی سردار علی اچانک ویران ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس کے سامنے سے گزرنے والے یہاں کی رونقوں کا نظارہ کرتے تھے، اس پر رشک کرتے تھے، وہ دن رات روشن رہتی تھی لیکن اب وہاں دن میں بھی بے رونقی اور نحوست کا راج تھا۔

ہاں اخبارات کے نمائندے ہر وقت وہاں منڈلاتے رہتے تھے۔ ان دنوں یہ پراسرار واقعات کا شکار حویلی اخبارات کے لئے گرم خبروں کا مرکز بنی ہوئی تھی اور اب تو یہ واقعات ملک گیر شہرت اختیار کر گئے تھے۔ لوگوں کو چوہدری سردار علی کے حوالے سے عبرت کا سبق دیا جاتا تھا، اس سے زیادہ بے عزتی اور کیا ہو سکتی تھی، حویلی کے ملازم تک لوگوں سے منہ چھپانے لگے تھے۔

رات کے کوئی دو بجے کا وقت ہوگا۔ حویلی کا ایک بہت قدیم نوکر رمضانی اپنے کوارٹر میں سو رہا تھا کہ کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ رمضانی بوڑھا آدمی تھا، کوارٹر میں تنہا رہتا تھا، پہلی ہی دستک پر اس کی آنکھ کھل گئی۔

''کون......؟'' اس نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو رمضانی بابا!'' آواز آئی آواز جانی پہچانی تھی لیکن رمضانی کی سمجھ میں نہیں آئی، تاہم اس نے لائٹ جلائی پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر جو کوئی بھی تھا، اس کے نقوش واضح نہیں تھے۔

''میں اندر آنا چاہتا ہوں رمضانی بابا......!'' باہر کھڑے ہوئے شخص نے کہا اور رمضانی کا سانس حلق میں گھٹ گیا۔ اس بار اس نے آواز پہچان لی تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور گرتے گرتے بچا۔ دروازے پر کھڑے شخص نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ''اگر مجھے پہچان گئے ہو تو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''چھوٹے سرکار! آپ...... آپ......؟''

''ہاں رمضانی بابا! میں ہی ہوں، آپ الٹی سیدھی باتیں کرنے کے بجائے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنیں، سن رہے ہیں آپ......؟''

''جج...... جی!''

''میں اختر علی کی چلائی ہوئی گولی سے مرا نہیں تھا، آپ لوگوں نے مجھے زندہ قبر میں دفن کر دیا تھا، خیر کسی نہ کسی طرح میں قبر سے نکل آیا لیکن ابھی میں باقاعدہ دنیا کے سامنے نہیں آ سکتا، اخبارات والے نہ جانے کیا لکھیں گے، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، آپ اسے غور سے سنیں، حیدر علی کو آپ میرے آنے کے بارے میں بتا دیں اور ان سے کہیں کہ اپنے برادر نسبتی اختر علی کو بے گناہ نہ مرنے دیں، ہمیں یہ نیک کام کرنا ہے، میں مناسب وقت پر ان سے ملوں گا جلدی ملنا ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا، آپ نے میری باتیں سن لیں؟''

''جج...... جی چھوٹے سرکار! ایک بات ہم بھی کہیں؟''

''بولو...... جلدی بولو۔''

''اگر آپ اجازت دو تو ہم ابھی سب کو بتا دیں، ہم سے رات بھر کا انتظار برداشت نہیں ہوگا۔''

''صبح کو بتا دینا رمضانی بابا! تمہاری مہربانی ہوگی، میں چلتا ہوں۔'' صفدر علی نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور کوارٹر سے باہر نکل گیا لیکن رمضانی کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ صبح تک وہ جاگتا ہی رہا تھا۔

حیدر علی پہلے تو صبح خیزی کا عادی نہیں تھا لیکن ان دنوں نیند یا سکون بس ایک نام کی شکل میں رہ گیا تھا۔ غم اور خوف، زندگی میں اب بس دو ہی چیزیں رہ گئی تھیں، تھوڑے ہی دن پہلے کی بات تھی، انہوں نے شہر میں کاروبار شروع کیا تھا اور خلاف توقع دونوں بھائیوں کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی حالانکہ وہ زمیندار تھے اور کاروبار کا انہیں کوئی خاص تجربہ نہیں تھا لیکن انہوں نے کاروبار جما لیا تھا۔

شہر میں انہوں نے ایک اچھا گھر خرید لیا تھا لیکن حویلی کی روایات کو پامال نہیں کیا تھا، بیویوں کو انہوں نے حویلی میں ہی رکھا تھا، بس فرصت ملنے پر خود آ جایا کرتے تھے۔ چوہدری سردار علی بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گئے تھے اور پھر صحت یاب ہوئے تو ان کی خواہش پر انہیں ان کی آبائی زمینوں پر لے جایا گیا، بس وہیں سے بربادی کا آغاز ہو گیا۔

ہمیشہ کے لالچی تھے اور دوسروں کی کامیابی پر حسد کرتے تھے لیکن اس بار ان کا حسد رنگ لے آیا تھا۔ سب کچھ ہونے کے باوجود نظام دین کی زمینوں کی فصل دیکھ کر جل مرے تھے اور بات وہیں تک نہیں رہی تھی، شاد پور کے اطراف میں بھی کئی ایکڑ زمینیں تھیں ان کی، جن پر سبزیوں کی کاشت ہوتی تھی۔ شاد پور کا شمار علاقے کی سب سے بڑی سبزی منڈی میں ہوتا تھا اور یہاں سب سے شاندار فصل چوہدری سردار علی کی ہی ہوتی تھی اس لئے وہ مطمئن تھے اور اب سب کچھ تباہی کی آغوش میں چلا گیا تھا، ذرا سے لالچ اور حسد نے برباد کر کے رکھ دیا تھا، خود دربدر ہو گئے تھے۔ بیٹی، بیٹا اور بہو جوانی میں ہی ختم ہو گئے تھے اور موت کے خوف نے سب کے دلوں میں گھر کر رکھا تھا چنانچہ حیدر علی بھی اب سکون کی نیند نہیں سو سکتا تھا، خود زندہ تھا لیکن ساری امنگیں مر چکی تھیں، موت کے خوف نے نڈھال کر رکھا تھا، مرنے والوں کے غم نے دل کو مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

رمضانی نے اسے پائیں باغ میں ٹہلتے دیکھا تو اس کی طرف چل پڑا۔ حیدر علی نے پرانے ملازم کو دیکھ کر سلام کیا تو رمضانی نے کہا۔

''جیتے رہیں بڑے سرکار! اللہ عمر دراز کرے۔''

''ہونہہ......! جیتے رہیں، کیسے جیتے رہیں رمضانی بابا......؟''

''مولا کرم کرے بڑے سرکار! ایک مشکل بات کرنی ہے آپ سے۔''

''تم بھی مشکل بات ہی کرو گے رمضانی بابا! چلو، بولو کیا مشکل بات ہے؟''

''بڑے سرکار! رات کو چھوٹے سرکار میرے پاس کوارٹر میں آئے تھے۔''

''صفدر علی......؟''

''ہاں! ماں قسم جھوٹ نہیں بول رہا۔''

''خواب میں آئے تھے، بابا رمضانی......؟''

''نہیں سرکار! جیتے جاگتے انہوں نے مجھے سوتے سے جگایا تھا۔'' رمضانی نے جواب دیا اور حیدر علی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''آپ کی قسم کھاتے ہیں مالک! سب کچھ ہوش میں ہوا تھا۔'' رمضانی رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

(جاری ہے)

خوف

ایم اے راحت

قسط : 6

حیدر علی کچھ دیر تک افسوس بھری نگاہوں سے رمضانی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”حالات ہی ایسے

ہیں رمضانی بابا۔ آپ گھر کے پرانے نمک خوار ہیں آپ نے اس حویلی کا عروج دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں آپ ہم سب سے بہت ہمدردی رکھتے ہیں۔ آپ پر اگر یہ کیفیت بیت رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔“

”آپ سمجھ رہے ہو بڑے سرکار کہ ہمارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ہم حالات سے گھبرا کر اس طرح کی باتیں کررہے ہیں، نہیں سرکار قسم کھاتے ہیں اسی نمک کی جس کے بارے میں ابھی ابھی آپ نے کہا ہے، قسم کھاتے ہیں اس حویلی کی چھتوں کی جن کے سائے میں ہم نے پوری زندگی گزار دی ہے، نہ ہمارا دماغ خراب ہے، نہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ نہ ہی آپ کو بہلانے کی کوشش کررہے ہیں، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل سچ ہے اور ہمیں ہدایت کی ہے چھوٹے سرکار نے کہ آپ سے بات کریں۔“ رمضانی نے ایسے لہجے میں کہا کہ حیدر علی کو حیرت ہونے لگی۔

”آپ کو پتہ ہے بابا رمضانی کہ صفدر علی کو میں نے ہی نہیں آپ نے بھی اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا ہے اور اس پر مٹی ڈالی ہے۔“

”اس بات پر ہمارا دماغ اگر خراب بھی ہوجائے تو غلط نہیں ہوگا بڑے سرکار، پر کیا کریں جو انہوں نے کہا تھا وہ ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔ انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے ہم نے کہا کہ چھوٹے سرکار آپ آپ! تو وہ بولے کہ ہاں رمضانی بابا میں ہی ہوں۔ آپ میری بات غور سے سنیں۔ میں اختر علی کی چلائی ہوئی گولی سے مرا نہیں تھا۔ آپ لوگوں نے مجھے زندہ ہی قبر میں دفن کردیا تھا۔ خیر کسی نہ کسی طرح میں قبر سے نکل آیا لیکن ابھی میں باقاعدہ دنیا کے سامنے آ نہیں سکتا۔ اخبارات والے نجانے کیا کیا لکھیں گے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں آپ اسے غور سے سنیں۔ حیدر علی کو آپ میرے آنے کے بارے میں بتا دیں اور ان سے کہیں کہ اپنے برادر نسبتی کو بے گناہ نہ مرنے دیں۔ ہمیں یہ نیک کام کرنا ہے۔ میں مناسب وقت پر ان لوگوں سے ملوں گا۔ جلدی ملنا ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ آپ یہ بات صبح کو بتا دیں، یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے بڑے سرکار، ہمارے ہوش وحواس بالکل ٹھیک ہیں، بالکل ٹھیک ہیں ہمارے ہوش وحواس، آپ یقین کرلو ہماری بات پر۔“

حیدر علی کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ رمضانی بابا پورے ہوش وحواس میں نظر آرہا تھا لیکن وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ بالکل سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ البتہ یہ احساس حیدر علی کو ضرور ہوا تھا کہ رمضانی بابا نے جو الفاظ ادا کئے ہیں وہ اس کے اپنے الفاظ نہیں ہیں۔ وہ اتنی مہارت کے ساتھ کوئی غلط بات نہیں کہہ سکتا، کافی دیر تک وہ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”لیکن رمضانی بابا بات عقل میں آتی ہے کہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو رمضانی بابا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، چلو کسی زندہ شخص کو بھی اگر قبر میں اس طرح دفن کردیا جائے تو وہ تھوڑی دیر کے بعد مرجائے گا، قبر سے باہر نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔“

”بڑے سرکار ہماری عقل چھوٹی سی ہے، اب آپ بتاؤ ہم کیا کریں؟“

”اچھا آؤ ذرا میرے ساتھ۔“

حیدر علی رمضانی کو ساتھ لے کر سامنے والے حصے میں آگیا جہاں دوسری طرف بغلی حصے میں ملازموں کے کوارٹر تھے۔

”میں ذرا دیکھتا ہوں۔“ ابھی حیدر علی نے یہ الفاظ ادا کئے ہی تھے کہ ایک کار حویلی کے بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ حیدر علی تعجب بھری نگاہوں سے اس کار کو دیکھتا رہا۔ کار پورچ میں جاکر رک گئی تھی لیکن اس سے غلام احمد کو نیچے اترتے دیکھ کر حیدر علی سخت حیران ہوا۔

غلام احمد فیروزہ کے والد تھے۔ حیدر علی کا دل تڑپ اٹھا۔ فیروزہ اپنے گھر چلی گئی تھی لیکن گھر تو فردوس جہاں بھی چلی گئی تھی۔ کیا فیروزہ بھی موت کا شکار ہوگئی لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو غلام احمد کا سیدھا یہاں آجانا تعجب خیز تھا۔ فون پر بھی اطلاع مل سکتی تھی۔ بہرحال وہ ملازم کو وہیں چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پورچ کی جانب بڑھ گیا۔ غلام احمد نے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ وہیں رک گئے تھے۔ حیدر علی نے قریب پہنچ کر بے صبری سے کہا۔ ”خیریت چچا جان، خیریت بتائیے جلدی سے مجھے۔“

”ہاں اللہ کا شکر ہے، تمہاری پریشانی برحق ہے۔ ذرا آؤ گے میرے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔“ غلام احمد نے کہا۔

”آئیے آئیے۔“ پھر حیدر علی، غلام احمد کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

”تم یہ بتاؤ حیدر علی کیا تمہیں صفدر علی کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟“

حیدر علی نے چونک کر غلام احمد کی صورت دیکھی اور بولا۔ ”کیسی اطلاع چچا جان؟“

”اگر میں تم سے ایک احمقانہ بات کہوں کہ صفدر علی زندہ ہے تو کیا تم اس بات پر یقین کرلوگے۔“

حیدر علی نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے چکر سا آگیا تھا۔ غلام احمد غور سے اس کی صورت دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے کہا۔ ”تمہیں یقیناً میری صحت دماغی پر شبہ ہوا ہوگا لیکن بیٹے، خدا کرے یہ خوشخبری ہماری تقدیر میں لکھی ہو، صفدر علی زندہ ہے۔“

”چچا جان آپ......“

”خدا کی قسم، وہ میرے پاس گھر آیا تھا۔ اس نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اختر علی کی گولی سے مرا نہیں ہے۔ اس کی موت کی غلط تصدیق کردی گئی تھی، وہ زندہ ہے اور بمشکل تمام قبر سے باہر نکل سکا ہے۔ بیٹے میں تمہیں قسم کھا کر یہ یقین دلاتا ہوں کہ میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔“

حیدر علی کی آنکھیں بھر آئیں اور پھر اس کے رخسار پر آنسو بہنے لگے، اس نے کہا۔ ”چچا غلام احمد، کیا واقعی میرا بھائی زندہ ہے۔ کیا واقعی ہم پر سے یہ موت کی نحوست ٹل سکتی ہے۔ رمضانی بابا نے بھی اسے دیکھا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیے میں کیا کروں؟“

”جیسا تم پسند کرو۔“

”میں چاہتا ہوں کہ اگر میرا بھائی زندہ ہے تو اختر علی کو بھی کچھ نہ ہوا سے بچانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ فردوس جہاں تو اب اس دنیا میں نہیں ہے اس بات کی تصدیق ہوچکی ہے۔ اصل میں صفدر علی کے بارے میں ایک بات مجھے تقویت دیتی ہے کہ وہ دوجگہ پہنچا ہے۔ چچا جان اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جن ہوشربا واقعات سے ہمارا سابقہ پڑ رہا ہے وہ اس دور میں خاص طور سے اس جدید زندگی میں بڑے حیران کن ہیں لیکن میری آنکھوں نے جو جو مناظر دیکھے ہیں، آپ کو بتاؤں تو آپ خود حیران ہوجائیں گے۔ گڑھی حیدر بیگ میں بچے بچے سے جاکر پوچھ لیجئے، پوری آبادی شدید تجسس کا شکار ہے۔ گڑھی حیدر بیگ میں ان زمینوں پر جن پر میرے باپ کی بری نگاہ پڑی تھی۔ اچانک ہی دو دن کے اندر ناگ پھنی کے بے شمار پودے ابھر آئے۔ ہم نے وہاں بہت سے ایسے کام کرنے کی کوشش کی تھی جن سے روحوں کو سکون ملے، لیکن ہمیں ہر جگہ فیل کردیا گیا۔ حقیقت تو یہی ہے چچا غلام احمد کہ احمد دین اس خاندان کا واحد نوجوان تھا۔ ماں، باپ، بہن، بیوی اور بچے سے جو سکون چھینا گیا وہ درحقیقت ایک غیر انسانی عمل تھا۔ چچا جان، کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا، خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، آپ بزرگ ہیں میری تو ذہنی قوتیں کام نہیں کررہیں، مجھے مشورہ دیجئے کہ میں کیا کروں۔“

”اگر اجازت دو تو افسر علی کو اور بلالیا جائے۔ میں اس وقت تک یہیں قیام کروں گا جب تک ہم اس سلسلے میں کوئی ٹھوس لائحہ عمل مقرر نہ کرلیں۔ تین ہی افراد ہیں جو کوئی کام کرسکتے ہیں، میں، تم اور افسر علی کیونکہ افسر علی کا بھائی مشکل میں گرفتار ہوا ہے اور بہن دنیا چھوڑ چکی ہے۔“

”جی آپ ضرور بلا لیجئے افسر کو۔ ہماری اس دکھ بھری کہانی میں بیچارہ وہ بھی تو برابر کا شریک ہے۔“

”میں اسے فون کئے دیتا ہوں۔ اور اس سے کہتا ہوں کہ وہ جلد سے جلد یہاں پہنچ جائے۔“

”بہت بہتر چچا جان، کاش میرا بھائی واقعی زندہ ہو۔ کاش ہم لوگوں کو زندگی مل سکے، جو نقصان ہوگیا ہے میری نوجوان بہن اور میری بیوی جس طرح اس دنیا سے چلے گئے ہیں وہ زخم کبھی نہیں بھر سکتے لیکن جو باقی بچ گئے ہیں کاش وہ زندگی پاجائیں۔ ہم تو کسی روحانی عمل سے بھی اپنی مشکل دور نہیں کرپارہے ہیں۔“

غلام احمد کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے ناگواری کی ایک شکن نمودار ہوئی۔ اس کے دل میں یہ احساس ابھرا تھا کہ غاصبانہ طور پر دوسروں کے مال پر نگاہ ڈالنا کبھی کبھی اس طرح قدرت کی طرف سے فوری ردعمل کا مظہر بن جاتا ہے کہ انسان ہی نہیں خاندان کے خاندان نشان عبرت بن جاتے ہیں۔

”ایک سوال میں اور پوچھنا چاہتا تھا آپ سے چچا جان۔“ حیدر علی بولا۔

”ہاں۔“ غلام احمد نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”کیا اباجی کو اس بارے میں اطلاع دے دی جائے؟“

”میرا خیال ہے بالکل نہیں کیونکہ وہ اپنی سوچ کے حامل ہیں، ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی نئی سوچ یا نیا حکم مسلط کرنے کی کوشش کریں جو ہم لوگوں کے لئے عذاب بن جائے۔“ غلام احمد کے لہجے میں ایک تنفر سا تھا جسے حیدر علی نے محسوس کیا، لیکن اس سے زیادہ تنفر خود اس کے دل میں پیدا ہوچکا تھا کیونکہ اس کا بھی گھر ختم ہوگیا تھا۔ بہرحال غلام احمد موبائل فون پر افسر علی کا نمبر ملانے لگے۔

☆.....☆.....☆

ساتویں جمعرات تھی۔ بدرالدین گڑھی حیدر بیگ اسٹیشن پر اتر گیا۔ خوب صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھا۔ خوشبو بھی لگائی ہوئی تھی۔ بال بھی سنوارے ہوئے تھے، پوری سج دھج سے بالکل اسی طرح آیا تھا جیسے کوئی اپنے محبوب سے ملنے آتا ہے۔

شام ہونے میں ابھی وقت تھا۔ ٹرینوں کے اوقات کی وجہ سے اسے جلدی آنا پڑتا تھا۔ مغرب تک وہ گڑھی حیدر بیگ میں گھومتا رہتا تھا۔ اس نے یہاں سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ نظام دین کا گھر، وہ زمین جو نظام دین کی تھی۔ زمین کے گرد لاکھوں روپے خرچ کرکے خاردار تار لگوادیئے تھے۔ یہ کام بھی چوہدری سردار علی کی طرف سے ہوا تھا تاکہ جانور وغیرہ اس زمین پر غلاظت نہ کرسکیں۔ اپنی طرف سے یہ لوگ کفارہ ادا کرنے کی ہر کوشش کررہے تھے لیکن کوئی کام نہیں بن رہا تھا۔

بدرالدین پر عجیب بیتی تھی۔ اس رات کی کہانی صحیح معنوں میں زندگی گزارنے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی، ورنہ ماں کی موت کے بعد زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہ گئی تھی، لیکن اب صورتحال بدل گئی تھی۔ اس نے باقاعدہ گڑھی حیدر بیگ آنا شروع کردیا تھا۔ پہلی جمعرات کو وہ آیا اور جمیلہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کرکے وہیں بیٹھا آیات تلاوت کرتا رہا۔ کوئی عمل نہیں ہوا تھا۔ دوسری اور تیسری جمعرات کو بھی یہی ہوا لیکن چوتھی جمعرات کو اسے اس وقت جب وہ آنکھیں بند کئے آیات پڑھ رہا تھا۔ اسے اپنے عقب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی، اس کے ساتھ انتہائی نفیس خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ اتنی نفیس خوشبو تھی کہ روح تک معطر ہوجائے، خوشبو کا مرکز نہیں نظر نہیں آیا تھا لیکن بدرالدین کو ایک دم احساس ہوا کہ یہ سرسراہٹ اور خوشبو بے معنی نہیں ہے۔ اس نے اپنا عمل جاری رکھا۔ خوشبو تھوڑی دیر تک اس کے اطراف میں مرکوز رہی اور اس کے بعد یوں لگا جیسے وہ فضا میں تحلیل ہوگئی۔ بدرالدین نے اپنے کام سے کام رکھا۔ اس نے کچھ بھی منہ سے نہ کہا اور وقت مقررہ پر اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹیشن پہنچ گیا، جہاں وقت کے مطابق شاہ پور جانے والی ٹرین اسے مل گئی۔

اب یہ بات سب کو معلوم ہوچکی تھی کہ چوہدری سردار علی نے کیا کچھ کیا ہے۔ قلیوں کو بھی اس بات کا پتہ چل گیا تھا لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی کہ بدرالدین ہر جمعرات کو اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر کیوں رہتا ہے اور پھر بن سنور کر کہاں جاتا ہے۔ کچھ نوجوان قلی جو بدرالدین سے بے تکلف تھے مسکرا کر کہتے تھے۔ ”یار بدرو بھائی ہمیں بھی بتا دو۔ ہماری بھابھی کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔ یار اکیلے اکیلے شادی تو نہیں کرلوگے۔ ہم لوگوں کو تو بارات میں لے جانا ہی ہوگا۔ بتا دو تو ہم بھی خوش ہولیں گے۔“

لیکن بدرالدین ایسے موقع پر مسکرا کر خاموش ہوجاتا تھا۔ وہ اس بھابھی کے بارے میں کیا بتاتا جو ایک جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگئی تھی اور جس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہرحال آج بھی وہ پوری طرح تیار ہوکر آیا تھا اگربتیوں کے پیکٹ، پھولوں کے دونے، ایک تھیلے میں رکھے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک وہ گڑھی حیدر بیگ کے بازاروں میں گھومتا رہا۔ پھر جب مغرب کا وقت ہوا تو قبرستان کی جانب چل پڑا، ساری تیاریاں کرکے آیا تھا۔ چوہدری نظام الدین کے اہل خاندان کی قبروں کی تعداد سات تھی اور ان سات قبروں کے لئے وہ پھولوں کی کافی مقدار لاتا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر نلکا لگا ہوا تھا جس کے پیچھے ٹین کے ڈبے بھی رکھے رہا کرتے تھے۔ دن کی روشنی میں گورکن کے بچے قبرستان کی مختلف قبروں پر پانی ڈال کر دو چار روپے کما لیا کرتے تھے لیکن مغرب کے بعد یہ بچے موجود نہیں ہوا کرتے تھے۔ البتہ باقی چیزیں مل جاتی تھیں۔

بدرالدین کو یوں لگتا تھا جیسے یہ ساری قبریں اس کے اہل خاندان کی ہوں اور وہ اس خاندان کا کوئی فرد ہو، ایک ایک قبر کو بڑے پیار سے صاف کرتا، پانی ڈالتا، پھول ڈالتا اگربتیاں جلاتا اور اس کے بعد بیٹھ کر فاتحہ خوانی کرنے لگتا۔ آج بھی اس نے بڑی تندہی سے اپنا کام جاری رکھا۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ جب بھی وہ یہاں آکر محبت سے یہ کام کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کچھ نامعلوم وجود جو نہ انسانی جسم رکھتے ہیں، نہ کوئی اور شکل، اس کے اردگرد آجاتے ہیں۔ پچھلی بار ایک عجیب واقعہ ہوا تھا جس سے اس کا دل اور شاد ہوگیا تھا۔

وہ چھٹی جمعرات تھی، اپنے کام سے فارغ ہوکر وہ فاتحہ خوانی کرنے کے لئے بیٹھا تھا کہ اچانک اسے پروں کی پھڑپھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ آس پاس بے شک درخت تھے، ان درختوں پر پرندے بھی نظر آتے تھے لیکن وہ خوبصورت چڑیا اتنی انوکھی تھی کہ چشم انسانی نے کبھی اتنا حسین پرندہ نہیں دیکھا ہوگا۔ نجانے کہاں سے اڑتی ہوئی آئی تھی اور بدرالدین کے شانے پر بیٹھ گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو بدرالدین کے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔

ایک عجیب سا احساس اس کے دل میں جاگزیں ہوگیا تھا۔ چڑیا اس طرح اس کے کندھے پر آبیٹھی تھی جیسے وہ بدرالدین کی پالتو ہو۔ بدرالدین نے اپنے بدن کو کوئی جنبش نہیں دی تھی، چڑیا خاموشی سے بیٹھی رہی۔ بدرالدین اسے کوئی بہت عجیب بات نہ سمجھتا، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں ایسا ایسا حسن ڈال دیا ہے کہ انسان کے تصور میں بھی نہ آسکے، یہ حسین چڑیا بھی ہوسکتا ہے کہیں سے اس قبرستان میں آگئی ہو، حیرانی اسے اس بات پر ہوئی تھی کہ کچھ دیر کے بعد جب چڑیا اس کے کندھوں سے اڑی تو اس کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔ کوئی دس بارہ گز دور اڑنے کے بعد ہی اچانک وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

تاریکی اتنی بھی نہیں پھیلی تھی کہ بدرالدین اس چڑیا کو دیکھ نہ پاتا، جس سمت میں اڑی تھی ادھر کوئی درخت بھی نہیں تھا۔ بس سیدھا سادا راستہ تھا۔ ایک بار پھر بدرالدین کے دل پر ایک عجیب سا اثر پیدا ہوا لیکن، اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ جو چیز سمجھ میں نہ آئے اس کے بارے میں صرف ذہنی قیاس حماقت ہی ہوتا ہے۔ اگر تقدیر اس پر کوئی راز منکشف کرنا چاہتی ہے تو پھر اس کا ساتھ دے، اسے سمجھا دے کہ وہ کیا راز ہے لیکن پورا ہفتہ ہی اس کے دل پر یہ احساس رہا تھا کہ چڑیا کا آکر اس کے کندھے پر بیٹھ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ آج بھی اس کے دل میں یہی خواہش تھی کہ کاش وہ حسین پرندہ پھر نظر آئے۔ آج وہ اس سے کچھ سوالات کرنا چاہتا تھا، ایک ایک قبر کو پوری محنت سے صاف کرکے اس نے تھلے سے پانی کے چھینٹے منہ پر ڈالے، کلی کی اور پھر جمیلہ کی قبر کے پاس آبیٹھا۔ اس دوران اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا۔

آج بھی وہ خاموشی سے بیٹھا فاتحہ خوانی کرتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ پھر اچانک اسے وہی سرسراہٹ محسوس ہوئی جو چوتھی جمعرات کو اس نے محسوس کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہوا کا ایک جھونکا اس کے قریب سے گزرا اور پھر اسے یوں لگا جیسے جمیلہ کی قبر پر کوئی ہیولا سا لہرایا ہو، اسے بھی وہ اپنا وہم سمجھتا لیکن اس وقت اسے اپنے دماغ میں ایک آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس آواز کا سماعت سے کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ اس کا تعلق براہ راست ذہن سے تھا۔

”بدرالدین، تم مجھے کب تک شرمندہ کئے جاؤ گے۔ کب تک میرے اوپر بوجھ لادے جاؤ گے۔“

بدرالدین کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی لیکن اس نے دل کی زبان سے اس کا جواب دیا۔ ”اس وقت تک جمیلہ جب تک کہ زندگی کی آخری سانس بھی مکمل نہ ہوجائے۔“

”کیا ملے گا تمہیں؟“

”جو ملنا تھا وہ تو مل چکا ہے جمیلہ۔“

”کیا؟“

”اس کائنات میں محبتوں کی بے شمار کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں بلیاوطلب ہے، ہر انسان اپنے محبوب کو پالینا چاہتا ہے، میں نے تو جمیلہ تمہارے تصور سے محبت کی ہے، میں نے تو ایک ہوا کے جھونکے سے پیار کیا ہے۔ جمیلہ اس وقت مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ تمہارا وجود اس دنیا سے جاچکا ہے۔ جب تم مجھے پہلی بار ملی تھیں، میں نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا تمہارے بارے میں۔ بس تمہاری آنکھوں نے مجھے تمہارا شیدائی بنا دیا تھا۔ جمیلہ! تم اگر مجھے مل بھی جاؤ تو یقین کرو کہ شاید میں تم سے وہ پیار نہ کرسکوں جو کسی کے مل جانے سے ہوتا ہے، تمہارا تصور میرے لئے زندگی بن چکا ہے، بات یہ ہے جمیلہ کہ اس کائنات میں میرے لئے ایک محبت تھی اور وہ تھی میری ماں۔ کیا تم اس بات پر یقین کروگی کہ ریلوے اسٹیشن کی بینچ پر لیٹ کر میرا بہترین مشغلہ اپنی ماں کے تصور کے ساتھ وقت گزارنا ہوتا تھا اور آج بھی وہ مشغلہ جاری ہے۔ میں نے درجنوں بار اپنی ماں کی انگلیوں کے لمس کو اپنے بالوں میں محسوس کیا ہے۔ مجھے آج بھی ماں کی مامتا سے محرومی نہیں ہے۔ جمیلہ شاید ایک میرے جیسے انسان کی زندگی میں کچھ ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ پہلا تصور ماں، اگر کچھ اور خاندان کے لوگ بھی ہوتے تو شاید ان سے بھی میرا کوئی لگاؤ ہوتا لیکن چونکہ کوئی تھا ہی نہیں اس لئے ماں اور صرف ماں رہ گئی تھی اور جمیلہ اب تم بھی شریک ہو اور میرا وجود مکمل ہوگیا ہے۔ ماں کی مامتا اور محبوبہ کا پیار جو بے شک میرے دل میں ہے۔ میرا سرمایہ ہے، تم جنت میں رہو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے اور نہ ہی میں یہ چاہوں گا کہ تم تک پہنچ جاؤں۔ بس جمیلہ میں یہاں آتا ہوں، اپنا چھوٹا سا فرض ادا کرتا ہوں اور مجھے وہ روحانی سکون مل جاتا ہے جس کی مجھے طلب ہے۔ اس سے زیادہ بھلا میں کیا چاہوں گا تم سے۔“

”بدرالدین کاش اس کے جواب میں تمہیں میں بھی کچھ دے سکتی۔“

”مجھے تم سے جو چاہئے تھا جمیلہ وہ مجھے مل گیا ہے، میں خوش ہوں، مجھے کچھ اور نہیں چاہئے۔“

”مگر میں خوش نہیں ہوں بدرالدین۔“ جمیلہ کی اداس آواز ابھری۔

”کیوں؟“

”میں نے کبھی تم سے کچھ مانگا تھا نا، اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے، کچھ دے نہیں سکتے؟“

”کیا مانگا ہے تم نے مجھ سے جمیلہ؟“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ بدرالدین تم ایک پڑھے لکھے نوجوان ہو، قلی کے روپ میں مجھے اچھے نہیں لگتے، میں چاہتی ہوں کہ تم کچھ کرو۔“

”میں بھی تم سے ایک سوال کروں جمیلہ؟“

”ہاں پوچھو۔“

”میں اگر کچھ کروں تو کس کے لئے کروں، کوئی ہے میرا اس دنیا میں؟“

”میرے لئے بدرالدین، تم جانتے ہو میں صرف ایک روح ہوں لیکن روح کے اندر بھی خوشیوں کی طلب کا احساس ہوتا ہے۔ میرے اندر پیار بھی ہے، میں تمہارے یہاں اس طرح آنے سے بہت متاثر ہوتی ہوں، تم نے جس طرح ایک خاندان کو اپنا لیا ہے، بے شک وہ خاندان زندہ نہیں ہے لیکن ہماری روحیں تمہاری شکر گزار ہیں۔ میرے

باپ، میرا بھائی، میری بھابھی، میرا بھتیجا، میری ماں، ہم سب تمہارے ممنون ہیں اور تمہارا احساس کرتے ہیں بلکہ اب تو تمہارے منتظر بھی رہتے ہیں۔ بدرالدین دیکھو، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو یہ دنیا دی ہے اور اس دنیا میں زندگی گزارنے کے طریقے بتادیئے ہیں۔ بدرالدین یہ اس کا حکم ہے اس کی حکم عدولی مت کرو، دنیا میں رہو، دنیا کو دیکھو، دنیاداری کرو، اگر تم ایسا کروگے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔‘‘

بدرالدین کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ سارے سوال و جواب اس نے بے خودی کے عالم میں کئے تھے لیکن اب جیسے اسے ہوش سا آگیا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ اب قبر پر کوئی ہیولا نہیں ہے۔ اس نے کوئی آواز نہیں سنی تھی، پھر اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ اسے اسٹیشن پہنچنا چاہئے تھا۔ آج کا وقت بڑی عجیب سی کیفیت میں گزر گیا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوسکا تھا کہ کس طرح گھڑی کی سوئیاں آگے آگے بڑھ گئیں، البتہ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’میں نہیں جانتا، میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ جو آواز میرے ذہن میں ابھری ہے اس کا کیا وجود ہے۔ ہوسکتا ہے یہ صرف میرا خیال ہو، بہرحال میں چاہوں گا کہ تم اسی طرح مجھ سے باتیں کرتی رہو، میری یہ چاہت اگر کسی طرح تم پر بوجھ بنے جیلہ تو اب کے جمعرات کو میں آؤں تو مجھے سمجھا دینا میں اس کی طلب بھی نہیں کروں گا، کیونکہ میں تمہاری روح پر کوئی بوجھ نہیں چاہتا، چلتا ہوں، خدا حافظ۔‘‘

اور پھر وہ پُراستقلال قدموں سے چلتا ہوا اسٹیشن کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

افسر علی بہرحال اختر علی کا بھائی تھا، تباہی کا آغاز کہیں سے ہوا تھا اور پہنچ کہیں گیا تھا، بہن دنیا سے جاچکی تھی، چنانچہ چوہدری سردار علی کے گھر سے رشتے تو ختم ہوگئے تھے لیکن بات اپنے بھائی کی زندگی کی تھی، چنانچہ غلام احمد کی طلبی پر وہ فوراً ہی شادپور پہنچ گیا۔ سردار علی کی حویلی میں اس کا انتظار ہو رہا تھا۔

غلام احمد بھی یہیں موجود تھے۔ بہنوئی سے بڑی سرسری سی ملاقات ہوئی۔ دل میں کدورت تھی لیکن بہرحال غلام احمد نے جن الفاظ میں طلب کیا تھا، فوراً پہنچ گیا اور روا روی سے کام بھی لیا۔

رسمی گفتگو کے بعد بات آگے شروع ہوئی تو غلام احمد نے کہا۔ ’’اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے افسر علی کہ صورتحال کیا ہے لیکن یہاں آکر مزید اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ صفدر علی زندہ ہے۔‘‘

’’آ خدا کرے ایسی ہی کوئی معجزہ نمائی ہوجائے، میرے بھائی کی زندگی بچ جائے۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہماری جوڑی قائم رہے، ہم بالکل بے قصور تھے لیکن آپ مجھے ذرا تفصیل بتایئے۔‘‘

اور جواب میں غلام احمد نے ملازم رمضانی سے صفدر علی کی ملاقات اور اس سے ہونے والی باتوں کے بارے میں بتایا تو افسر علی حیرت کی تصویر بن گیا۔

’’بس یہ خیال ہے کہ کہیں یہ کوئی اور ہی کھیل نہ ہو اور ہمیں مزید شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے بلکہ اگر یہ کوئی سازشی کھیل ہی ہے جو یہاں اس حویلی سے کھیلا گیا ہے اور جس کی وجہ نامعلوم ہے تو پھر صورتحال مزید بگڑ جائے گی، ہم پر بھی الزام آسکتا ہے کہ یہ سازش ہم نے کی ہے۔‘‘

’’افسر علی ہم پر اتنے بدترین الزام مت لگاؤ، میں نے تمہاری بات کا ذرا بھی برا نہیں مانا۔ یقین کرو جو ہوا ہے اس میں ہماری مرضی کا دخل نہیں تھا لیکن کبھی کبھی بزرگوں کا حکم مانتے ہوئے ایسے حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ فردوس جہاں کی موت کے بعد میری زندگی میں کبھی کوئی خوشی آئے گی تو خدا تمہیں زندہ رکھے، دیکھ لینا میں دوسری شادی کبھی نہیں کروں گا، سب کچھ تو لٹ چکا ہے اور پھر کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ بھی اس مظلوم خاندان کے عتاب سے بچتے ہیں یا نہیں۔ کم از کم میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ خاندان ہمارے خاندان سے انتقام لینے میں حق بجانب ہے، فردوس جہاں تو لپیٹ میں آگئی۔ فیروزہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، غلام احمد صاحب مجھے معاف فرمایئے، میں یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے شرمندہ ہوں لیکن کوئی حل آپ لوگوں کے پاس ہے تو مجھے بتا دیجئے، ہاں یہ تصور میرے لئے بھی بڑا جذباتی سا ہے کہ میرا بھائی زندہ ہے۔ اختر علی بھی میرا بھائی ہی ہے اس کے جذبات بھڑک کے۔ میں اسے بالکل قصوروار نہیں سمجھتا۔ خدا کرے صفدر علی عدالت میں پیش ہوجائے اور اختر علی کو گلوخلاصی مل جائے۔‘‘

حیدر علی کا انداز نہایت مفاہمتی تھا جس نے افسر علی کو بھی متاثر کیا اور وہ خاموشی سے آنسو بہانے لگا۔ بہرحال اب اس سلسلے میں غور کیا جانے لگا کہ یہ بات نبیل احمد ایڈووکیٹ کو کس انداز میں بتائی جائے۔

’’میری ایک تجویز اور ہے اگر مان لی جائے تو ذرا سا اطمینان ہوجائے گا۔‘‘

’’بے دھڑک کہو، ہم یہاں دوستوں کی طرح جمع ہوئے ہیں، کسی بات پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔‘‘

’’میں چاہتا ہوں کہ ایک بار صفدر علی کی قبر کشائی کر کے اور دیکھ لیا جائے کہ اس کی لاش قبر میں موجود ہے یا نہیں کم از کم اس طرح سے اطمینان ہوجائے گا کہ جو کچھ ہم نے سوچا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔‘‘

غلام احمد اور حیدر علی سوچ میں ڈوب گئے، پھر حیدر علی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے اعتراض نہیں ہے کیونکہ آگ میرے سینے میں بھی وہی ہے، ذرا سا مزید اطمینان ہوجائے گا کہ تدفین جو کی گئی تھی اس میں کوئی سقم رہ گیا تھا کیونکہ بات واقعی ذرا تعجب خیز ہے، کفن میں لپٹا ہوا ایک مردہ یا نیم زخمی آدمی کس طرح قبر توڑ کر باہر آسکتا ہے، اندازہ ہوجائے گا۔‘‘

’’تو پھر یہ کام ہمیں خود ہی کرنا پڑے گا یا اس کے لئے ہمیں کسی اور کو بھی رازدار بنانا پڑے گا۔‘‘

’’میں دو ایسے آدمیوں کا انتظام کرلوں گا جو ہماری خواہش پر قبر کشائی کرلیں، یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔‘‘

اس کا اپنا علاقہ تھا بے شمار افراد اس کے لئے کام کرتے تھے، ایسے دو باہمت نوجوان اکٹھے کرنا اس کے لئے مشکل نہیں ثابت ہوا۔ یہ بھی اس کے سبزیوں کے کھیتوں پر کام کرنے والے دو قوی ہیکل بہادر اور مضبوط جوان تھے۔

گیس کے لیمپ کا انتظام کیا گیا اور رات کو ایک بجے کے بعد یہ لوگ ان دو جوانوں کے ساتھ قبرستان پہنچ گئے جنہیں مختصر صورت حال بتادی گئی تھی اور نوٹوں کی ایک ایک گڈی نے ان کے دلوں سے ہر طرح کا خوف نکال دیا تھا۔ گیس کے لیمپوں کی روشنی میں قبر کا جائزہ لیا گیا تو صاف محسوس ہوگیا کہ وہ اوپر سے ٹوٹی ہے اور بالکل ویسی نہیں ہے جیسی ہونی چاہئے تھی۔ اس بات نے انہیں تقویت بخشی اور اس کے بعد وہ دونوں افراد کدال سے قبر کھود کر مٹی ہٹانے لگے۔ پتھر کی سلیں نظر آئیں، یہ سلیں البتہ اپنی جگہ جوں کی توں جمی ہوئی تھیں، انہیں ہٹا کر اندر جھانکا گیا۔ گیس لیمپوں کی روشنی میں قبر خالی نظر آئی، سب کے دل کھل گئے تھے، انہوں نے قبر کو اسی طرح بند کروادیا اور مٹی وغیرہ ڈال دی گئی، تمام کام مکمل ہونے کے بعد وہ حویلی واپس چل پڑے۔

نیند بھلا کس کو آئی تھی، رات بھر اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی، صبح کو غسل وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے ناشتہ کیا گیا اور اس کے بعد تینوں شہر چل پڑے، جہاں انہوں نے وکیل نبیل احمد سے ملاقات کرنی تھی۔ نبیل احمد سے وقت لیا گیا اور اس کے بعد تینوں ہی ان کے آفس پہنچ گئے۔

نبیل احمد نے پوچھا۔ ’’غالباً پیشی ستائیس تاریخ کو ہے۔ آپ لوگوں کے چہروں سے جو تجسس نمایاں ہے اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں کوئی خاص بات ہے۔‘‘

’’ہاں نبیل احمد صاحب، بات بہت انوکھی ہے لیکن مکمل طور پر مستند۔‘‘

’’فرمایئے کیا بات ہے؟‘‘

’’صفدر علی کے قتل کے الزام میں اختر علی پر مقدمہ چل رہا ہے لیکن صفدر علی زندہ ہے۔‘‘ یہ الفاظ افسر علی نے کہے تھے۔

نبیل احمد چونک کر افسر علی کو دیکھنے لگا، پھر تحمل سے بولا۔ ’’آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہیں اور کیا آپ لوگ بھی ان کے ساتھ اسی سلسلے میں آئے ہیں؟‘‘ نبیل احمد کے انداز سے یہ پتہ چلتا تھا جیسے اس نے افسر علی کو فاترالعقل سمجھا ہو۔

غلام احمد نے کہا۔ ’’جی، اور میں اس سلسلے میں سب سے پہلا گواہ ہوں وکیل صاحب کہ صفدر علی نے پہلی ملاقات مجھ سے ہی کی تھی، اس کے علاوہ جس شخص سے اس نے دوسری ملاقات کی وہ ہمارے ساتھ نہیں آیا لیکن وہ بھی ایک مستند آدمی ہے۔ حویلی سردار علی کا ایک ملازم رمضانی جس نے پوری عمر ہی حویلی سردار علی میں گزاری ہے۔‘‘

’’غلام احمد صاحب، آپ صفدر علی کے سسر ہیں نا؟‘‘

’’ہاں اور صفدر علی سے ملاقات کی گواہ میری بیٹی بھی ہے۔ وہ میرے پاس آیا تھا۔‘‘ پھر غلام احمد نے پوری تفصیل نبیل احمد ایڈووکیٹ کو بتادی اور نبیل احمد کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نمودار ہوگئے۔

’’ایک مردہ جو قبر کے اندر دفن ہوچکا ہے خود قبر کھول کر باہر نکلتا ہے اور اپنی زندگی کی تصدیق کرتا ہے، کیا یہ حیران کن بات نہیں ہے اور کیا آپ یہ جانتے ہیں غلام احمد صاحب کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔‘‘

’’نہیں، بس یہی ایک کمزور پہلو ہے، لیکن وہ یہ کہہ کر میرے پاس سے گیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ ہمارے پاس پہنچے گا۔‘‘

’’اپنے رابطے کے لئے کچھ کہہ کر گیا ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’پھر آپ کیسے یہ سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ مجھے ایک ایسی فرضی کہانی میں شامل کرنا چاہتے ہیں جس کے سر پاؤں کا مجھے کوئی علم نہیں ہے، بے شک آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، میں اسے تسلیم کرلوں گا لیکن عدالت ہنسی مذاق نہیں ہوتی۔ ہم کسی ٹھوس بنیاد کے بغیر کمرہ عدالت میں یہ مضحکہ خیز کہانی نہیں سنا سکتے۔‘‘

’’وکیل صاحب آپ نے ہماری ان باتوں کو مضحکہ خیز کہا ہے، آپ بے شک کہہ سکتے ہیں کیونکہ آپ کا اس سلسلے سے کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے۔‘‘

’’دیکھئے، میں نے وہی الفاظ ادا کئے ہیں جو کل باہر کی دنیا میں ادا کئے جائیں گے، آپ فرمایئے میں کیا کروں مجھے کیا کرنا چاہئے؟‘‘

’’وکیل صاحب، بات واقعی آپ کے کہنے کے مطابق تھوڑی سی غیر حقیقی لگتی ہے لیکن میں بڑے یقین کے ساتھ آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ میں نے اپنے داماد سے بات کی ہے، میری بیٹی نے اس سے باتیں کی ہیں اور پھر وہ ملازم رمضانی اس بات کی تصدیق کرتا ہے جبکہ دونوں جگہ کا خاصا فاصلہ ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، دیکھئے میں آپ کا وکیل ہوں، بھائی کی زندگی بچانے کے لئے بڑے سے بڑا کھیل کھیلا جاسکتا ہے۔ میں نے عرض کیا نا میں آپ کا وکیل ہوں۔ آپ کے فیور کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجئے ہم یہ تفصیل عدالت میں پیش کرتے ہیں اور وکیل سرکار ہم سے یہ سوال کرتا ہے کہ کیا ٹھوس ثبوت ہے کہ صفدر علی ہمارے پاس آیا تھا۔‘‘

’’لیکن وہ کہہ کر گیا ہے......‘‘

’’فرض کیجئے عدالت میں ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ صفدر علی آکر اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرے گا اور فرض کیجئے اگر وہ نہ آیا تو آپ میں سے کون یہ شکایت کرے گا۔‘‘

حیدر علی پُرخیال انداز میں گردن ہلا رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ’’تو آپ بتایئے وکیل صاحب کوئی ایسی ترکیب ہے۔ جس سے ہم عدالت میں اپنا موقف پیش کرسکیں۔‘‘

نبیل احمد سوچ میں ڈوب گیا تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ’’ہاں ہوسکتا ہے۔ آپ سب لوگ معزز ہیں۔ میں آپ کی تردید نہیں کرنا چاہتا، لیکن یہ بات عدالت میں کہی جاسکتی ہے کہ افسر علی صاحب نے اپنے بھائی اختر علی کی زندگی بچانے کے لئے ایک لمبا کھیل کھیلا ہو، قبر سے لاش غائب کرائی ہو، کسی کو صفدر علی کا ہمشکل بنا کر دونوں جگہ بھیجا گیا ہو اور اس طرح اپنے بھائی کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔‘‘

’’لیکن اگر وہ عدالت میں پیش ہوجائے تو؟‘‘

’’یہی اگر تو سب سے بڑی مشکل کا باعث ہے۔ آپ ایک تکلیف کریں افسر علی یہ کام آپ کا ہے۔ آپ باقاعدہ ان معزز لوگوں کی گواہی میں ایک درخواست کورٹ کو پیش کریں اور اس میں یہ تمام تفصیل لکھیں۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ عدالت آپ کی بات تسلیم کرلے اور خوش قسمتی سے اگر صفدر علی کہنے کے مطابق عدالت میں پیش ہوجائے تو ہم سب کے سروں کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے کیا کہتے ہیں آپ؟‘‘

’’ہم آپ کے پاس آئے ہی اس لئے ہیں وکیل صاحب۔‘‘

’’اچھا تو پھر سنئے میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں ایس پی ضیاء الدین صاحب میرے ہم زلف ہیں، اگرچہ ایس پی ضیاء الدین صاحب کا براہ راست اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میری درخواست پر وہ آپ سے تعاون کرسکتے ہیں۔‘‘

’’صرف ایک درخواست ہے آپ سے وکیل صاحب، اس سلسلے میں جو کچھ کرسکتے ہیں کیجئے۔ کیس کو اس شکل میں تو آپ نے کنٹرول کرہی لیا ہے کہ وہ موت کی سزا سے بچ جائے۔ باقی اس کی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ ہوگا لیکن ایک مفروضہ ہے جس پر اگر ہم عمل کرلیں۔‘‘

’’میں تیار ہوں، میرا کام آپ سے تعاون کرنا ہے، پھر ایسا کرتے ہیں کہ آج ہی میں ضیاء الدین صاحب سے وقت لے لیتا ہوں، آپ لوگ رات کا کھانا میرے ساتھ کھایئے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اور پھر اسی رات ایڈووکیٹ نبیل احمد کے گھر پر یہ میٹنگ ہوئی۔ ضیاء الدین نے بھی بے یقینی کے انداز میں ان دونوں کو دیکھا تھا پھر انہوں نے کہا۔ ’’دیکھئے درخواست بے شک عدالت میں پیش کردیجئے، میں متعلقہ افراد کو ہدایت کردوں گا کہ آپ سے بھرپور تعاون کیا جائے۔ تصدیق ہوگی قبر کشائی کا مسئلہ بھی سامنے آئے گا۔ آپ یہ نہ کہیں کہ آپ قبر کھول کر دیکھ چکے ہیں۔ پولیس ایک مرتبہ خود اپنی نگرانی میں قبر کشائی کرائے گی۔ تمام واقعات کا تجزیہ کیا جائے گا، میرا خیال ہے ستائیس تاریخ کو پیشی کے دوران یہ ساری باتیں عدالت کے علم میں لے آئی جائیں گی اور ہمیں عدالتی اجازت مل جائے گی لیکن معافی چاہتا ہوں یہ سارے معاملات بے شک ایک حیرت ناک حیثیت رکھتے ہیں جبکہ قانون حیرتوں کو قبول نہیں کرتا، وہ ٹھوس حقائق مانگتا ہے۔‘‘

’’ہم اپنی جیسی کوشش کئے لیتے ہیں جناب، اگر تقدیر میں کچھ لکھا ہے تو شاید کام ہوجائے، ورنہ جو اللہ تعالیٰ کی مرضی۔‘‘

☆......☆......☆

ایس پی ضیاء الدین نے واقعی کافی مدد کی۔ نبیل احمد نے ایک درخواست تیار کی اور ستائیس تاریخ کو تمام لوگ عدالت میں پیش ہوئے اور یہ درخواست پیش کردی گئی۔ پھر اس وقت ایک شدید سنسنی پھیل گئی جب کمرۂ عدالت میں جبکہ اس درخواست پر بحث ہو رہی تھی، ایک شخص اندر داخل ہوا سب سے پہلے اسے افسر علی نے دیکھا تھا اور افسر علی کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

’’صفدر علی۔‘‘

پورا کمرہ بھنبھناہٹ سے گونج اٹھا تھا۔ صفدر علی آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آگے آرہا تھا۔ حیدر علی بے اختیار ہوگیا اور صفدر علی کی طرف بڑھا تو صفدر علی نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’کوئی جذباتی عمل نہ کیا جائے، بھائی حیدر علی آپ کو علم ہے کہ میں زخمی ہوں، میرے بدن میں کئی گولیاں لگی تھیں۔‘‘

حیدر علی رک گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، صفدر علی نے پھر کہا۔ ’’میں کٹہرے میں آکر اپنا بیان دینا چاہتا ہوں۔‘‘

عدالت میں شدید حیرت اور سنسنی پھیل گئی تھی۔ صفدر علی کو کٹہرے میں آنے کی اجازت دیدی گئی تو اس نے کٹہرے میں آکر کہا۔ ’’جناب والا، میں زندہ ہوں۔ ہمارا خاندان ایک بدنصیبی کا شکار ہوگیا ہے۔ کچھ واقعات اس طرح کے ہوجاتے ہیں کہ انسان ان کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ ہماری دشمنی روحوں سے ہوگئی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اسرار

وتجسس کی اس دنیا میں بے شمار مناظر ایسے آتے ہیں جب انسانی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے، واقعات کیا ہوئے یہ ایک الگ کہانی ہے لیکن میری بھاوج فردوس جہاں کا ان حالات میں انتقال ہوگیا اور بھائی اختر علی اور افسر علی غصے سے بے قابو ہوگئے۔ میں بے گناہ تھا لیکن مجھ پر حملہ کیا گیا میں زخمی ہوگیا اور شاید کچھ اس طرح کے عوامل ہوئے کہ مجھے مردہ سمجھ لیا گیا۔ قبر میں جو لمحے میں نے گزارے ہیں انہیں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا کیونکہ داستان گو نہیں ہوں۔ جس طرح میں باہر نکلا بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس میں بھی قدرت کی مدد حاصل تھی کہ وہ ایک انسان کو زندہ درگور نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے بعد جناب والا کچھ ایسے سنسنی خیز لمحات آئے کہ میری زبان انہیں بیان کرنے کے قابل نہیں ہے۔‘‘

’’آپ کو وہ لمحات بیان کرنے چاہئیں۔‘‘

’’مجھے اجازت نہیں ہے۔‘‘ صفدر علی نے جواب دیا۔

’’کس کی اجازت نہیں ہے آپ کو؟‘‘

’’ان پُراسرار قوتوں کی جنہوں نے مجھے صرف اس لئے مہلت دی ہے کہ میں ایک بے گناہ انسان کو یعنی اختر علی کو سزا سے بچاسکوں۔ یہ انہی روحوں کی عنایت ہے جو میرے خاندان کے درپے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اختر علی کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے وہ مجھے مہلت دے رہے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا انتقامی عمل برقرار رہے گا مجھے اپنے اہل خاندان کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر آپ لوگ میرے بیان کو تسلیم کرتے ہیں تو تسلیم کرلیں، میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔ مجھ پر جس طرح کا اعتبار چاہیں کرلیا جائے لیکن مزید تفصیل نہ پوچھی جائے۔ میں عدالت کے سامنے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ یہ دیکھئے، یہ وہ زخم ہیں جو اختر علی کے کئے ہوئے فائر سے لگے۔‘‘ صفدر علی نے کہا اور اپنا اوپری لباس اتار کر وہ زخم دکھائے۔

کمرۂ عدالت حیرتوں میں ڈوبا ہوا تھا، غلام احمد، حیدر علی اور افسر علی ششدر تھے۔

صفدر علی نے کہا۔ ’’جناب والا! ان زخموں کا تجزیہ کرالیا جائے۔ ماہر سے ماہر ڈاکٹر سے پوچھ لیا جائے کہ یہ زخم نقلی نہیں ہیں، بہرحال میرا فرض تھا اور روحوں کی یہی ہدایت تھی۔ میں نے اپنا عمل کیا اور کمرۂ عدالت میں پیش ہوگیا۔ اب باقی ذمہ داریاں آپ کی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سلسلے میں قانون کیا کہتا ہے، جس طرح میں اپنی مرضی سے آیا ہوں اسی طرح واپسی کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ میرے اوپر کوئی فردِ جرم نہیں ہے جہاں تک اختر علی کا معاملہ ہے وہ میرے بھائی کا سالا ہے اور مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ میں اپنی طرف سے اسے خلوص دل سے معاف کرتا ہوں، اس سلسلے میں جو بھی کارروائی ہو مجھے اس کی اطلاع دے دی جائے، میں حاضری دوں گا۔‘‘

’’تمہیں اس کے بارے میں کہاں اطلاع دی جاسکتی ہے؟‘‘

’’میں خود رابطہ قائم کروں گا مجھے یہی ہدایت ہے۔‘‘ صفدر علی نے کہا اور اس کے بعد کٹہرے سے باہر نکل آیا۔

کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ اسے روکے، حیدر علی بھی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ صفدر علی نے جو بیان دیا تھا وہ بڑی خصوصی حیثیت کا حامل تھا۔

اس بیان کے بعد اس کیس کی نوعیت بدل گئی تھی اور عدالت نے اس کے لئے ایک اور تاریخ مقرر کردی تھی۔ صفدر علی صلح نامے کے لئے کہہ کر گیا تھا اور اس سے اس بات کے امکانات بھی پیدا ہوگئے تھے کہ اختر علی باعزت بری ہوجائے۔

صفدر علی کو روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چونکہ مقدمے کی کارروائی جاری تھی اس لئے کوئی صفدر علی کے پیچھے بھی نہیں جاسکا، جج صاحب نے نئی تاریخ کے بارے میں بتادیا اور اس کے بعد یہ لوگ باہر آئے۔

نبیل احمد نے کہا۔ ’’آپ لوگ میرے آفس چل کر میرے ساتھ ایک ایک کپ چائے پئیں تو مجھے خوشی ہوگی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ غلام احمد نے کہا۔

نبیل احمد ایڈووکیٹ کے آفس میں چائے کا اہتمام ہوا اور چائے ہی کے دوران نبیل احمد نے کہا۔ ’’میری زندگی میں بھی ایسے واقعات رونما نہیں ہوئے۔ یوں تو یہ پوری کہانی ہی سخت حیران کن ہے لیکن یہ تازہ واقعہ...... میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں حیدر علی صاحب۔‘‘

’’جی وکیل صاحب۔‘‘

’’اس بات کے تو اب پورے پورے امکانات پیدا ہوگئے ہیں کہ اختر علی سزا سے بچ جائے کیونکہ صفدر علی نے بات صاف کردی ہے اور عدالت کو بس فیصلہ سنانا باقی ہے لیکن حیدر علی صاحب پتہ نہیں میری چھٹی حس مجھے کچھ اشارے کر رہی ہے۔‘‘

’’کیسے اشارے وکیل صاحب۔‘‘

نبیل احمد سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولے۔ ’’خدا کرے یہ سب بالکل ٹھیک ہو اور آخری مرحلہ بھی سرانجام پاجائے۔‘‘

’’آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟‘‘ حیدر علی نے پوچھا۔

’’کیا آپ کو یہ سب کچھ ایک حقیقی عمل معلوم ہوتا ہے؟‘‘ نبیل احمد نے الجھے ہوئے سے انداز میں سوال کیا اور سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

’’جو واقعات پیش آرہے ہیں نبیل صاحب ان میں حقیقی عمل کونسا لگتا ہے۔ سب کچھ انتہائی سنسنی خیز ہے۔ ہم تو خیر ان واقعات کے کردار ہیں، ہمیں تو نقصانات اٹھانے پڑ رہے ہیں، لیکن جو لوگ یہ واقعات صرف سن رہے ہیں وہ بھی شدید سنسنی کا شکار ہیں۔ اب دیکھیں کل کے اخبارات کیا کیا کہانیاں سناتے ہیں۔‘‘ غلام احمد نے کہا۔

’’یہ ساری باتیں تو ٹھیک ہیں، میں کسی اور سے کوئی سوال نہیں کروں گا، بے شک آپ سب ایک دوسرے کے عزیز ہیں۔ حیدر علی صاحب میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا کمرۂ عدالت میں پیش ہونے والا شخص صفدر علی ہی تھا؟‘‘ نبیل احمد کے سوال نے ان سب کو چونکا دیا اور وہ سب عجیب سی نگاہوں سے نبیل احمد کو دیکھنے لگے۔

افسر علی نے پوچھا۔ ’’آپ کا کیا خیال ہے نبیل احمد صاحب؟‘‘

’’بس، کچھ الجھا الجھا سا ہوں۔ ہم چند افراد یہاں موجود ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا ان واقعات سے گہرا تعلق نہ ہو، چنانچہ یہ بات یہیں شروع ہوکر یہیں ختم کردی جائے گی۔ ہم کسی کو اس کا حوالہ نہیں دیں گے، بس یہ سب کچھ مجھے بہت پُراسرار لگ رہا ہے اور خدا کرے باقی معاملات ٹھیک ہوں۔‘‘

اور پھر اس موضوع پر تھوڑی سی بات چیت اور ہوئی۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کرلیا گیا کہ چوہدری سردار علی کو کسی بات کی کانوں کان خبر نہیں ہونے دی جائے گی۔

پھر وہ تاریخ آگئی جس میں اختر علی کی تقدیر کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ صفدر علی سے کسی کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور ان سب کا وقت شدید ہیجان کے عالم میں گزر رہا تھا لیکن جب کمرۂ عدالت میں اختر علی کو پیش کیا گیا تو کچھ ہی لمحوں کے بعد دروازے سے صفدر علی اندر داخل ہوگیا اور ان لوگوں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

عدالتی کارروائی شروع ہوئی، صفدر علی نے کٹہرے میں کھڑے ہوکر کہا کہ میں زندہ ہوں اور اختر علی کو مکمل طور پر معافی دیتا ہوں، میرا اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے چنانچہ اس کے اوپر سے یہ مقدمہ ختم کردیا جائے اور عدالت نے اپنا فیصلہ سنادیا۔ اختر علی کو رہائی دے دی گئی تھی، کمرۂ عدالت میں اختر علی اور افسر علی کے ملنے کا مرحلہ بڑا دلگداز تھا۔

صفدر علی اپنا بیان دینے کے بعد باہر جانے لگا تو حیدر علی اور غلام احمد اس کے پیچھے لپکے۔ ’’اب تم کہاں جارہے ہو صفدر علی، آؤ میرے بھائی گھر چلو، ہم سب جس طرح تمہارے لئے مضطرب ہیں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔‘‘

’’میں جانتا ہوں لیکن بھائی حیدر علی آپ کو معلوم ہے کہ ہم کن حالات کا شکار ہیں۔ پرسوں جمعرات کو شام کو چھ بجے میں شادپور کی کوٹھی میں آؤں گا۔ وہاں آگے کے معاملات کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا، اس وقت میرا جانا ضروری ہے۔‘‘

’’ہمیں کچھ نہیں بتاؤ گے صفدر علی کہ کہاں رہ رہے ہو اور تمہارے اس طرح ہم سب سے روپوش رہنے کی وجہ کیا ہے؟‘‘

’’پرسوں چھ بجے میں آپ لوگوں کو سب کچھ بتادوں گا۔ خدا کے لئے میرا تعاقب نہ کیا جائے، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں ورنہ حالات خراب ہوجائیں گے۔‘‘ یہ کہہ کر کے صفدر علی آگے بڑھ گیا اور سب اسے بے بس نگاہوں سے دیکھتے لگے۔ (جاری ہے)

خوف

قسط: 7

ایم اے راحت

کچھ لمحوں کے بعد نبیل احمد نے کہا۔
''آپ لوگ کچھ بھی کہیں، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا، کوئی ایسا نکتہ ضرور ہے جو ذہن میں چبھ رہا ہے۔''

کسی نے نبیل احمد کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر افسر علی بولا۔ ''آپ پہلے بھی اس الجھن کا تذکرہ کرتے رہے ہیں نبیل صاحب، بھائی اختر علی کو ہم سب کی کوششوں اور خصوصاً آپ کی کوششوں سے زندگی اور آزادی مل گئی ہے، لیکن یہ الجھن اب کیا حیثیت رکھتی ہے۔''

نبیل احمد نے کہا۔ ''افسر علی صاحب! اب حالات جو رخ اختیار کر چکے ہیں وہ میرے سنبھالے نہ سنبھل سکیں گے، خداوند عالم آپ سب پر رحم کرے۔''

''کیا آپ کے خیال میں اختر علی کو ملنے والی آزادی میں ابھی کوئی سقم ہے؟''

''نہیں اختر علی کی آزادی میں کوئی سقم نہیں ہے، لیکن صفدر علی کا پراسرار رویہ ناقابل فہم ہے۔''

''اس سلسلے میں ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے وکیل صاحب کیا کریں اور کیا نہ کریں۔'' اس بار حیدر علی بولا تھا۔

''مجھے اگر کسی لائق سمجھیں آپ تو میں حاضر ہوں، لیکن روحوں سے مذاکرات کی نہ تو مجھ میں صلاحیت ہے اور نہ علمیت تاہم جب بھی آپ مجھے طلب کریں گے حاضر ہو جاؤں گا۔''

''جمعرات کو آپ شاد پور آ سکتے ہیں؟''

''آ جاؤں گا۔ دن میں آپ مجھے یاد دلا دیجئے یا اس سلسلے میں کوئی اور پیش رفت ہو تو مجھے بتا دیجئے گا۔'' نبیل احمد نے کہا اور اس کے بعد انہوں نے واپسی کی اجازت مانگی۔ اختر علی کی رہائی کے باوجود خوشدلی کسی میں بھی نہیں تھی۔

☆......☆......☆

بدرالدین کے اندر بھی نے ایک خوشگوار کیفیت کو محسوس کیا تھا۔ پہلے وہ ایک بجھا بجھا اور زندگی سے بیزار قلی تھا، لیکن اب اس کے اندر ایک تمکنت پیدا ہو گئی تھی۔ عام طور سے قلی کے لباس میں بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اچھے صاف ستھرے کپڑے پہننے لگا تھا اور تھوڑا بہت کام کر لیتا تھا رحمت چچا نے ایک دن اس سے کہا۔ ''بیٹا تو پڑھا لکھا آدمی ہے، یہ قلی گیری تجھے اچھی بھی نہیں لگتی۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب سے مل کر ریلوے میں ہی کلرکی کر لے، جب تو قلی کا کوٹ پہنتا ہے نا تو میرا دل بڑا دکھتا ہے تجھے دیکھ کر۔''

بدرالدین ہنس کر خاموش ہو گیا۔

پچھلے کچھ دنوں سے الیکشن کے سلسلے میں ہنگامہ آرائی چل رہی تھی۔ قلیوں کی یونین کا مقامی صدر رحیم الدین نامی ایک آدمی تھا۔ رحیم الدین بھی بدرالدین کا بہت اچھا دوست بن چکا تھا۔ مدمقابل کوئی بھی نہیں تھا، لیکن اس وقت خود بدرالدین حیران رہ گیا۔ جب رحیم الدین نے کہا۔ ''بدرالدین! اس بار میں تمہیں اپنی جگہ کھڑا کر رہا ہوں۔ تمہیں یہ الیکشن لڑنا ہے۔''

''ارے...... رحیم بھائی کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے کیا؟''

''نہیں تم مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہو اور پھر کوئی دس آدمیوں نے مجھ سے کہا ہے کہ رحیم الدین تھک گئے ہو گے، تھوڑے دن آرام کر لو، کسی اور کو موقع دو۔ میں نے ہنس کر کہا کہ بھائیو! تم سچ کہتے ہو تھک تو میں گیا ہوں، پر تم ہی کسی کا انتخاب کر لو اور حیرت کی بات ہے کہ ان دس کے دس آدمیوں نے تمہارا نام لیا اور سچ لیا، بات یہ ہے کہ تم پڑھے لکھے بھی ہو اور شکل و صورت سے بھی قلی نہیں لگتے۔ جنرل سیکرٹری کے عہدے کے لئے تم سے اچھا اور کوئی نہیں ہے۔''

بدرالدین نے بہت رسیاں تڑائیں لیکن قلی مان کر نہ دیئے اور پھر بدرالدین کو جمیلہ کی بات بھی یاد آ گئی۔

''تم اپنے لئے بھی کچھ سوچو، کچھ کرو۔''

قلیوں کی یونین کا جنرل سیکرٹری بننا بہت بڑا اعزاز تھا۔ قلی گیری بھی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ یونین کا باقاعدہ آفس تھا۔ بدرالدین جب بھی رحیم الدین سے ملنے گیا اسے یہ جگہ بہت اچھی لگی۔ پھر رحیم الدین نے خود ہی اسے پیشکش کی تھی۔ الیکشن ہونے میں چند ہی روز باقی رہ گئے تھے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ بدرالدین کے علاوہ اور کون ہے جو الیکشن جیت سکے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ الیکشن ہوتا تو ضرور تھا، سرکاری اور قانونی کارروائی ہوتی تھی۔ کافی عرصے سے رحیم الدین صدر اور جنرل سیکرٹری دونوں عہدوں کو سنبھالے ہوئے تھا لیکن اس بار رحیم الدین نے اپنی جگہ بدرالدین کے لئے خالی کر دی تھی اور بدرالدین بھی اس لئے تیار ہو گیا تھا کہ جمیلہ نے اس سے کچھ کرنے کا قول لیا تھا۔ بلا مقابلہ الیکشن ہوا اور بدرالدین کو ان دونوں عہدوں کا حامل قرار دے دیا گیا اور اسے آفس میں بٹھا دیا گیا۔ رحیم الدین اسے صدر اور سیکرٹری کے فرائض سمجھانے لگا۔

پھر جمعرات کا دن آ گیا۔ بدرالدین زندگی کا ہر لمحہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں صرف کر سکتا تھا، لیکن جمعرات اس کی اپنی نہیں ہوتی تھی۔ تیار ہو کر باہر نکلا۔ گڑھی حیدر بیگ جانے والی ٹرین تھوڑی ہی دیر کے بعد آنے والی تھی۔

ایک بے تکلف دوست نے کہا۔ ''ہم لوگ یہی باتیں کر رہے تھے بدرو بھائی کہ بدرالدین صاحب بہادر تو بن گئے ہیں، لیکن جمعرات کے دن انہیں کوئی کام بھی نہ دیا جائے۔ یہ دن بھابھی سے ملنے کا ہوتا ہے، پر بھیا ساری باتیں ایک طرف بھابھی سے ابھی تک ہمیں نہیں ملایا گیا اور یہ تک نہیں بتایا گیا کہ بات کہاں تک پہنچی ہے۔''

بدرالدین نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دیکھو فرید خاں، وہ تمہاری بھابھی نہیں ہے کسی ایسے وجود کو بھابھی کہنا مناسب نہیں ہے جس سے میرا نکاح ہوا ہے اور نہ ہی کوئی ایسا عہد و پیمان ہے۔ چنانچہ میرے بھائی خیال رکھا کرو، کسی کی ذات پر کیچڑ اچھالنا اچھی بات نہیں ہوتی۔''

''معافی چاہتے ہیں بھائی، سچ سچ ہمیں نہیں معلوم تھا لیکن تم جس طرح محبت اور چاہت سے ان سے ملنے جاتے ہو اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تم دونوں کے درمیان محبت ہے۔''

بدرالدین کی آنکھوں میں نمی آ گئی، اس نے کہا۔ ''ہاں اس سے میں انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔'' پھر اس کے بعد وہ ٹرین میں بیٹھ کر گڑھی حیدر بیگ چل پڑا۔

مقررہ وقت پر وہاں اترا۔ پھول والے سے پھول اور اگربتیاں خریدیں اور پھر قبرستان چل پڑا۔ آج وقت سے کچھ پہلے آ گیا تھا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف پہنچ گیا جہاں جمیلہ اور اس کے اہل خاندان کی قبریں تھیں۔

اس نے اپنی لائی ہوئی چیزیں ایک طرف رکھ دیں اور بڑی چاہت سے ایک ایک قبر کی صفائی کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ہمیشہ یہی محسوس ہوا تھا جیسے کچھ محبت بھری نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی ہوں۔ اس کی ممنون کرم ہوں، قبروں پر پانی ڈال کر اس نے ان پر پھول ڈالے۔ اگربتیاں جلا کر سلگائیں اور پھر آخر میں جمیلہ کی قبر کے پاس آ بیٹھا۔

اگربتیوں اور پھولوں کی خوشبو اپنی جگہ تھی، لیکن کچھ ہی لمحوں میں اسے وہی مسحور کن بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوئی جسے محسوس کر کے اب اسے پتہ چل جاتا تھا کہ جمیلہ کی روح اس کے آس پاس موجود ہے۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

''میں نے مقررہ وقت سے پہلے تمہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ تمہاری طرف سے ہر وقت آنے کی اجازت نہیں ہے۔ جمیلہ! تمہاری ہدایت کا ایک پہلو پورا ہو چکا ہے۔ میں قلی گیری چھوڑ کر قلیوں کے یونین آفس میں جا بیٹھا ہوں اور بہت سی ذمے داریاں میرے کندھوں پر آ پڑی ہیں، جمیلہ میں اور بھی کوشش کروں گا۔ بس تم مجھے اسی طرح اپنی قربت سے نوازتی رہو مجھے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے۔''

اچانک ہی اس نے اپنے عقب سے نکل کر آنے والی ایک انتہائی خوبصورت سی تتلی کو دیکھا جو غیر معمولی طور پر بڑی تھی اور اس قدر خوش رنگ اور حسین تھی کہ انسان اسے دیکھ کر مسحور ہو جائے۔ تتلی اس کی کلائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے تک تو وہ کچھ نہ سمجھا، لیکن پھر اس کے کانوں میں جمیلہ کی آواز ابھری۔

''مجھے چھونا نہیں، میری طرف سے اپنی کامیابی پر مبارکباد قبول کرو۔ جب تم آفس میں پہلی بار بیٹھے تھے تو تمہیں دیکھ کر میں خوشی سے جھوم گئی تھی۔ میں وہاں موجود تھی بدرالدین۔''

بدرالدین نے محبت بھری نگاہوں سے اس تتلی کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ تتلی کے روپ میں جمیلہ ہے، روحوں کے بارے میں بہت سی باتیں سنی جاتی تھیں۔ سانپ، چھپکلی، پرندے، مگر تتلی کی شکل میں وہ پہلی بار ایک روح کو دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ نے اسے نہ چھونے کی ہدایت کر دی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں محبت کا ایک سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

پھر اس نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا۔ ''ایک دن تم برقع میں ملبوس شاہ پور کے اسٹیشن پر اتری تھیں اور تم نے حویلی سردار علی جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، جمیلہ اس وقت تم مجسم ہو کر سامنے آئی تھیں تو ایک بار پھر میرا دیدار کرنے کے لئے وہی روپ کیوں نہ اختیار کیا۔''

اس کے ذہن میں جمیلہ کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی تتلی نے اس کی کلائی پر رخ تبدیل کیا۔ جمیلہ کی سرگوشی نما آواز سنائی دی کہ ہمیں صرف اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی اجازت ملی ہے۔ اس کے علاوہ ہم اپنی کسی اور غرض کے لئے بھی انسانی جسم کو اختیار کریں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ورنہ میں تمہاری خوشی پوری کر کے بہت خوش ہوتی۔

بدرالدین نے یہ الفاظ اپنے ذہن میں صاف سنے تھے، پھر اس کی آواز گلوگیر ہو گئی، اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، نجانے کیوں میرے منہ سے یہ احمقانہ الفاظ نکل گئے، اس کے لئے بہت شرمندہ ہوں جمیلہ، آئندہ اس کا بھی خیال رکھوں گا۔''

''اپنی لگن میں لگے رہو بدرالدین۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم یہاں نہ آؤ اور مجھے بھول جاؤ۔ میں خود بھی تمہیں نہیں بھول سکتی، لیکن ایک زندہ انسان کا ایک روح سے محبت کرنا بس اسی حد تک ممکن ہے، جس حد تک ہم ایک دوسرے کے قریب ہو چکے ہیں۔ خدا تمہیں صدیوں زندہ رکھے لیکن تم خود جانتے ہو کہ ہماری محبت کا کوئی عملی پہلو ممکن نہیں ہے۔''

''مجھے ضرورت بھی نہیں ہے جمیلہ میں جب تک زندہ ہوں تمہارے پاس آتا رہوں گا۔''

تتلی نے پھر پہلو بدلا اور اس کی کلائی سے اڑ گئی، بدرالدین یاس بھری نگاہوں سے اسے فضا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

شاید ہی انسانوں کی زندگی میں ایسے ناقابل یقین لمحات آئے ہوں جن لمحات سے یہ خاندان گزر رہا تھا۔ اختر علی بہت خوش تھا کہ اسے زندگی مل گئی تھی۔ اس کا بھائی افسر علی بھی اپنے بھائی کی زندگی سے بہت خوش تھا، جہاں تک فردوس جہاں کا تعلق تھا اس کا غم بھلا دل سے کیسے جاتا، لیکن جو جا چکا ہوتا ہے اس کے لئے صبر ہی کرنا پڑتا ہے۔

جمعرات کا دن ان لوگوں کے لئے بڑا سنسنی خیز تھا، ان میں سب سے زیادہ سنسنی کا شکار غلام احمد تھے۔ فیروزہ کے دن رات حرام ہو چکے تھے۔ باپ سے یہی سوال کرتی کہ ابو آخر ایسی کونسی مجبوری ہو سکتی ہے صفدر علی کو کہ وہ میرے پاس بھی نہیں آئے، انہیں اندازہ ہے کہ خود میری زندگی بھی کس طرح خطرے میں ہے۔

''کیا کہوں بیٹا انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ اگر بیٹیوں کے باپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ آنے والا وقت بیٹیوں پر کتنا کٹھن گزرنے والا ہے تو وہ شاید ان کی شادی ہی نہ کریں۔ اپنی بچیوں پر ہونے والے مظالم پر انہیں جس طرح اپنی شخصیت کو ریزہ ریزہ کرنا پڑتا ہے وہی جانتے ہیں۔ دیکھو میری بچی، اللہ تعالیٰ نے ہم سب کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔''

''جو کچھ آپ نے بتایا ہے ابو، اسے دیکھتے ہوئے میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے بھی حویلی سردار علی لے چلیں، ہو سکتا ہے صفدر ہمارے ساتھ ہی واپس آ جائیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا وہ تیری سسرال ہے اور خدا کرے ہمیشہ رہے، تم میرے ساتھ چلنا۔''

☆......☆......☆

نبیل احمد کا موقف وہی تھا۔ اختر علی اور افسر علی ان کے ساتھ ہی حویلی سردار علی چل پڑے تھے، انہوں نے اختر علی سے کہا۔ ''میں تمہیں ایک بات بتاؤں اختر علی، وکیل ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بے شمار مقدمے جیت چکا ہوں۔ اللہ نے ایک نام دیا ہے وکیل کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے۔ کبھی کبھی میری چھٹی حس مجھے بڑے بڑے معاملات سے آگاہ کر دیتی ہے۔ روز اول سے میں کہہ رہا ہوں کہ کہانی میں کہیں کوئی ایسی گرہ ہے جو بہرحال کھل تو جائے گی لیکن ہے بڑی عجیب، چلیں دیکھیں کیا ہوتا ہے۔''

غلام احمد، فیروزہ، اختر علی، افسر علی اور نبیل احمد یہ سب کے سب حویلی سردار علی پہنچ گئے اور ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ حیدر علی نے بہترین نشستوں کا بندوبست کیا تھا، لیکن ایک ایسی جگہ جو ذرا الگ تھلگ تھی، یہ سب پہنچ گئے اور صفدر علی کی آمد کا انتظار ہونے لگا۔

سبھی کی نگاہیں بار بار گیٹ کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ شام کے جھٹپٹے رات کی سیاہی میں تبدیل ہونے لگے اور ان کی بے چینی عروج پر پہنچنے لگی۔

''میرا خیال ہے صفدر علی......'' ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ عقب سے ایک آواز ابھری۔

''معافی چاہتا ہوں ذرا دیر ہو گئی۔''

وہ اچھل پڑے، صفدر علی گیٹ سے نہیں آیا تھا بلکہ عقب سے نمودار ہوا تھا۔ حیدر علی ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی فیروزہ بھی ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ اٹھ گئی تھی۔

''صفدر میرے بھائی ہم تو مایوس ہو گئے تھے، آخر تم......''

''بھائی جان بیٹھ جایئے۔ براہ کرم بیٹھ جایئے۔ فیروزہ تم بھی......''

صفدر علی نے کہا اور وہ سب ٹھٹھک سے گئے۔ حیدر علی تو بیٹھ گیا تھا لیکن فیروزہ اسی طرح کھڑی پیاس بھری نگاہوں سے صفدر علی کو دیکھ رہی تھی۔

''صفدر علی! آپ بھی بیٹھئے، ہمیں بتایئے کہ آخر آپ کون سے ایسے پراسرار واقعات کا شکار ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ابھی تک روپوش ہیں حالانکہ آپ نے بڑے مشکل وقت میں اختر علی کی مدد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزا دے لیکن اللہ کی عطا کی ہوئی نئی زندگی کے ساتھ ساتھ آپ جن الجھنوں کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ ہمارے لئے ناقابل فہم ہیں۔''

صفدر علی نے آنکھیں بند کر کے گردن جھکا لی۔ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر گردن اٹھا کر بولا۔

''فیروزہ آپ براہ کرم بیٹھ جایئے، میں اس مظلوم خاندان کے بارے میں پھر کچھ کہنا چاہتا ہوں جسے آپ لوگوں اور حیدر علی نے موت کی آغوش میں دھکیل دیا۔ کیا آپ کو ایسا کرنا چاہئے تھا۔ انسان کسی کے خلاف کوئی عمل کرتے ہوئے یہ غور نہیں کرتا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے اور جب وہ برستی ہے تو پھر ظالم کو کہیں پناہ نہیں ملتی۔ آپ کو اپنے ظلم کا احساس ہے، خداوند عالم زمین سے انسان کی تخلیق کرتا ہے۔ پھر اسی زمین سے اسے غذا عطا کرتا ہے جو کچھ ہوتا ہے اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ آپ نے وہ فصلیں جلوائی تھیں نا؟''

''صفدر! کیوں ان باتوں کو دہرا رہے ہو؟''

''میں صفدر علی نہیں ہوں، میں احمد دین ہوں۔'' یہ کہہ کر صفدر علی نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو اچانک احمد دین کا چہرہ نمودار ہوا۔ خوبصورت، خوشنما، لیکن غم و اندوہ سے لبریز، یہ دیکھ کر کون تھا جسے اپنے حواس پر قابو رہتا، نبیل احمد بھی بدن میں کپکپی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

صفدر علی کہہ رہا تھا۔ ''اپیل کی تھی ہم لوگوں نے آپ سے۔ کہا تھا کہ خدا کے واسطے ہمیں زندہ رہنے کا موقع دیں۔ صاحب اختیار تھے آپ۔ کیا مل جاتا آپ کو زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے سے۔ اللہ نے آپ کو کتنی بڑی حویلی دی ہوئی ہے، یہاں شاد پور میں بھی آپ کے سبزیوں کے اتنے بڑے کھیت ہیں کہ لاکھوں روپے سالانہ کی آمدنی آپ کو ان سے ہوتی ہو گی، لیکن ہماری زمین کا وہ ٹکڑا آپ کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گیا تھا۔ آپ نے ہمیں موت دے دی، لیکن دیکھ لیجئے قدرت کے کھیل کہ ہم خود اپنا انتقام لے کر اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کریں گے۔ حیدر علی صاحب آپ تحت الثریٰ میں بھی پناہ لینا چاہیں تو آپ کو پناہ نہیں ملے گی۔ ہمارا مظلوم خاندان جو آپ کی وجہ سے زندگی سے محروم ہوا آپ لوگوں کو کہیں نہیں چھوڑے گا، چوہدری سردار علی کی باری سب سے آخر میں آئے گی۔ یہ بیچارہ اختر علی جس نے صرف اپنی محبت سے مغلوب ہو کر صفدر علی کو ہلاک کیا، ہمارے خاندان سے دور کی چیز ہے، اس نے جو کچھ کیا وہ ہمارے ہی کئے ہوئے کا ردعمل تھا، اس لئے ہم اسے وہ اعزاز نہیں دینا چاہتے تھے جو اسے مل گیا۔ صفدر علی کو ہمیں ہی قتل کرنا تھا۔ فردوس جہاں کو میری بیوی حسینہ نے قتل کیا کیونکہ وہ ہمارے خاندان کی بہو تھی اور فردوس جہاں سردار علی کے خاندان کی بہو۔ اصل میں ذمے داریاں تقسیم ہو گئی ہیں۔ ہم سب اپنے اپنے کام کر رہے ہیں۔ فیروزہ بھی اسی خاندان کی بہو ہے جب ایک بہو کو زندگی نہ مل سکی تو پھر بھلا باقیوں کا کیا سوال ہے؟ ہاں اختر علی کو بے موت نہیں مرنا تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ اس کی مدد کی جائے۔ آپ لوگوں نے صفدر علی کی قبر کھول کر دیکھی۔ آپ کی بینائی سلب ہو گئی تھی، ورنہ صفدر علی کی لاش تو اس کی قبر میں موجود تھی اور آپ کی بینائی کو سلب ہونا ہی تھا کیونکہ اس طرح اختر علی کو رہائی نہ ملتی۔ میں نے صفدر علی کے روپ میں وکیل صاحب اور عدالت کے سامنے پیش ہو کر اختر علی کی گلوخلاصی کرا دی۔ آپ لوگ کوشش کرتے رہیں صفدر علی کی موت کو بھی ثابت نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہماری ذمے داری ہے، بہرحال اختر علی تم نے برا کیا کہ ہمارے منہ سے ہمارا شکار چھین لیا۔ خبردار کوئی اور یہ کوشش نہ کرے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔ میں صفدر علی نہیں احمد دین ہوں اور کہہ دینا چوہدری سردار علی سے وہ اپنی موت کا انتظار کرے۔ بس یہی اطلاع دینی تھی مجھے آپ لوگوں کو اور اسی لئے میں آج یہاں آیا تھا، چلتا ہوں، خدا حافظ نہیں کہوں گا کیونکہ میں آپ کو خدا کی حفاظت میں نہیں دینا چاہتا۔ آپ لوگ ظالم ہیں اور ظالموں کا خدا کبھی محافظ نہیں ہوتا۔''

احمد دین بیٹھے بیٹھے کرسی سے غائب ہو گیا۔ فیروزہ کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئی۔ غلام احمد رونے لگے۔ حیدر علی نے پشیمانی سے گردن جھکا لی۔

نبیل احمد خاموش نگاہوں سے بے ہوش فیروزہ کو دیکھ رہے تھے، کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔ ''تم لوگ میرے ساتھ چلو گے؟'' مخاطب اختر علی اور افسر علی تھے۔

''جی وکیل صاحب ہمیں چلنا ہے اور یہی بات یہ ہے کہ ہمیں اس خاندان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اب کیا رہ گیا ہمارے پاس۔ بہن ہی چلی گئی تو رشتے تو سب ختم ہو گئے، چلئے چلتے ہیں۔''

غلام احمد اب بھی زار و قطار رو رہے تھے، انہوں نے فیروزہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ارے میری بچی کو تو دیکھو۔ کیا کہوں؟ تمہیں تو کوسنے کو بھی دل نہیں چاہتا، وہ ظالم چھپ کر بیٹھ گیا ہے جس نے اتنے سارے زندہ انسانوں کو موت دے دی ہے، خدا اسے ایسی موت نصیب کرے کہ دنیا اس پر عبرت کرے۔ حیدر علی میری بیٹی کو میرے گھر تک پہنچانے کا بندوبست کر دو، اب تو مجھے یہی لگ رہا ہے جیسے میں کسی لاش کو لے جا رہا ہوں۔''

حیدر علی نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی، غلام احمد نے کہا۔ ''کرو گے میری مدد؟''

''جی جی۔'' حیدر علی کے منہ سے بمشکل تمام نکلا۔

☆......☆......☆

فیروزہ درحقیقت زندہ لاش بنی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ شوہر کو زندہ دیکھ کر اس کے دل میں نجانے کیا کیا خیالات بیدار ہو گئے تھے۔ حقیقت یہی تھی کہ گیہوں کے ساتھ گھن پس رہا تھا، کرے کوئی اور بھرے کوئی...... اس کی اس سے بڑی مثال ملنا ممکن نہیں تھی۔

راستے میں غلام احمد نے فیروزہ سے کہا۔ ''بیٹا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے ہم سے کیا غلطی ہوئی تھی جو ہمیں یہ مشکل جھیلنا پڑی۔''

اچانک ہی فیروزہ نے غلام احمد کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں بیٹا کہو۔''

''یہ بات طے ہے کہ موت اسی طرح میرا مقدر ہے جس طرح فردوس جہاں دنیا سے گئی۔ میں خوش ہوئی تھی کہ شاید ان کے اندر کوئی نرمی آئی ہو، صفدر علی کی زندگی سے میرے اندر زندہ رہنے کی لگن بیدار ہوئی تھی لیکن آپ نے اپنے کانوں سے سن لیا۔ نظام الدین کا خاندان اس خاندان کے ایک ایک فرد کو زندگی سے محروم کر دے گا۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے۔ بس میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے جو کچھ بھی ہو حویلی سردار علی میں ہو، آپ مجھے واپس وہیں چھوڑ آئیے، میں وہیں رہوں گی۔''

غلام احمد نے عجیب سی نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا اور بولے۔

''بے شک بیٹا میں نے آپ کی شادی کر دی تھی، والدین کے لئے اس سے زیادہ خوشی کا مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان کی بچی سسرال میں خوش رہے، مگر بیٹا سسرال سے آپ کو کیا ملا۔ موت؟ میں یہ نہیں کہتا کہ میں کسی کو موت سے بچا سکتا ہوں، لیکن بیٹا، بات کریں گے، دنیا کے سامنے دہائی دیں گے، اللہ سے مدد مانگیں گے کہ ہم بے گناہوں کو مشکل سے نکال لے۔ بیٹا، اب وہاں کیا رکھا ہے، تم نے یہ بات کیوں سوچی؟''

''بس، میں نہیں چاہتی کہ آپ لوگ میری وجہ سے سولی پر لٹکے رہیں۔ یہ سوچتے رہیں کہ موت کب آ کر میرا گلا دبوچ لے گی۔ اس گھر میں تو ہے ہی موت کا بسیرا اس لئے میں یہ بات کہہ رہی تھی۔''

''نہیں بیٹا براہ کرم اس خیال کو دل سے نکال دو۔''

غلام احمد اور فیروزہ یہ باتیں کر رہے تھے اور ادھر حویلی سردار علی میں حیدر علی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آسیہ اور رحمان ابھی وہیں موجود تھے اور حیدر علی سے باتیں کر رہے تھے۔

کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اسے دیکھنے اور پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اب تو سب کچھ سامنے آچکا ہے، اس بارے میں مزید کچھ کہنا فضول ہے۔ آپ یہ دیکھئے کہ بات صرف آپ تک ہی محدود نہیں ہے، کتنے گھرانے مشکل کا شکار ہوئے ہیں۔ ہم بے قصور ہیں، لیکن دیکھ لیجئے کہ ہم بھی مشکل میں پڑے ہوئے ہیں۔ انسان کہاں تک انسانیت کا مظاہرہ کرے اور اپنے آپ کو ان معاملات سے دور رکھے جو کبھی کبھی زبردستی مسلط ہو جاتے ہیں۔ بہرحال خدا ہم سب پر سے یہ مشکل ٹالے۔ آسیہ میری زندگی کی طرح سے ہے، لیکن نور جہاں کی موت کے بعد آپ یقین نہیں کر سکتے کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔‘‘

حیدر علی رونے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

وہ لوگ سارے معاملات میں شریک رہے تھے، رحمان علی نے کہا۔

’’آسیہ گھر واپس چلنا ہے۔‘‘

’’آؤ میں کیا کروں، میرے پاس اب کون رہ گیا ملازموں کے سوا۔ میں بھی کہیں چلا جاتا ہوں۔ میرا بھائی زندگی سے محروم ہوگیا۔ اختر علی بچ گیا تو کیا، مجھے کیا ملا اس کے بچ جانے سے، لیکن بہرحال میں بھی باپ کی طرح سے غلط انداز میں نہیں سوچنا چاہتا۔‘‘

رحمان علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آسیہ بھی جانے کے لئے تیار تھی۔ موت کا خوف کبھی کبھی اس کے چہرے سے بھی جھلکنے لگتا تھا، جبکہ وہ ایک بہت بہادر لڑکی تھی اور شاید حویلی سردار علی میں سب سے زیادہ دلیر وہی تھی، جس نے ان باتوں کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لیا تھا۔ وہ واپس چل پڑے اور وقت کا انتظار کرنے لگے۔

☆......☆......☆

ان لوگوں کے ساتھ جو واقعات پیش آرہے تھے وہ اپنی جگہ تھے، لیکن بدرالدین کی زندگی میں جو انقلاب آگیا تھا وہ اس کے لئے بڑا دل خوش کن تھا۔ ماں کی موت کے بعد زندگی سے جس طرح بیزار ہوگیا تھا اب صورت حال بالکل بدل گئی تھی۔ اسے زندگی سے پیار ہوگیا تھا۔ یہ اس کی سچی محبت کا ثبوت تھا کیونکہ محبوب کی طلب بھی محبت ہی کا ایک حصہ ہوتی ہے لیکن اگر محبت بے طلب ہو جائے تو پھر اسے روحانیت ہی کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک روح سے محبت کا مطلب تھا کہ محبت بے غرض ہے، اس میں کسی قسم کا کھوٹ اور لالچ نہیں ہے۔

جمعرات اس کے لئے عید کے دن کی طرح ہوتی تھی اور پورے ہفتے وہ جمعرات کا شدت سے انتظار کرتا تھا۔ جمیلہ اسے ہدایات دیتی رہتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ جمعرات کے علاوہ اور کسی دن وہ نہ آیا کرے۔ چاہے دل میں کتنی ہی طلب کیوں نہ ہو۔ بہرحال بدرالدین نے اپنا بہت کچھ بدل لیا تھا، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ قلیوں کا کوٹ پہن لیتا تھا اور دوسرے قلی اسے دیکھ کر کہتے تھے کہ بدرو بھائی اب تم ہمارے لیڈر رہو۔ ہم تمہیں کبھی سامان نہیں اٹھانے دیں گے تو بدرالدین ہنس کر کہتا کہ یارو! غلط عادتیں مت ڈالو تم لوگ یونین لیڈر کی حیثیت سے میرے اخراجات اٹھا لیتے ہو، لیکن میں بالکل نکما اور ناکارہ ہوتا جا رہا ہوں کبھی کبھی مجھے کام کر لینے دیا کرو۔ دوسرے قلیوں کے گھر وغیرہ بھی تھے اور چند ہی ایسے تھے جو اسٹیشن پر رہتے تھے۔ بدرالدین کے لئے یونین آفس موجود تھا۔ وہ اگر چاہتا تو رات کو بھی وہاں آرام سے سو سکتا تھا، لیکن اسے جمیلہ ہمیشہ یاد رہتی تھی اور وہ عام طور سے ریلوے اسٹیشن کی اس بنچ پر سویا کرتا تھا جس پر پہلی بار اسے جمیلہ ملی تھی۔

اس دن سرِ شام بادل آئے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے اس حصے میں جہاں بدرالدین بنچ پر سویا کرتا تھا ٹین کا شیڈ پڑا ہوا تھا۔ بارش کی جلترنگ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس وقت شام کے جھٹپٹے فضاؤں میں اتر آئے تھے۔

ٹرین آنے والی تھی اور اس کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا۔ قلی ٹرین کے انتظار میں تھے۔ آخرکار ٹرین آگئی۔ کافی لوگ یہاں اترے تھے۔ کچھ مقامی تھے کچھ غیر مقامی۔ شاد پور میں کئی ایسے کاروبار ہوتے تھے جن کا تعلق دوسرے شہروں سے ہوا کرتا تھا۔ خاص طور سے سبزی کی بہت بڑی منڈی تھی۔ یہاں سے سبزی باہر کے شہروں میں بھی جاتی تھی۔ کافی کاروبار ہوتا تھا، لیکن مال گاڑیوں کے ذریعے۔

بہرحال قلی اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور پھر بدرالدین نے ایک ایسے بھاری بھرکم شخص کو دیکھا جو ٹرین کے کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا ہوا تھا اور نیچے اترنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس سے اترا نہیں جا رہا تھا۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا بدرالدین یہ محسوس کر کے کہ یہ شخص نیچے اترنا چاہتا ہے اس کی مدد کے لئے تیزی سے اس کی جانب بڑھ گیا۔ قریب سے اس نے دیکھا کہ اس شخص کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا ہے اور اس پر کرب کے آثار ہیں۔ آنکھیں ابلی پڑ رہی ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بڑی تکلیف میں مبتلا ہو۔

اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ بدرالدین نے فوراً ہی اسے سنبھال لیا۔ اس نے اسے نیچے اتارا، حالانکہ کافی وزنی شخص تھا لیکن بدرالدین بھی ایک تندرست و توانا نوجوان آدمی تھا۔

وہ نیچے اتر آیا تو بدرالدین نے اس سے جلدی سے پوچھا۔ ’’کوئی سامان ہے آپ کا؟‘‘

جواب میں اس شخص نے بولنے کی کوشش کی، پھر گردن ہلائی اور بمشکل تمام بولا۔ ’’براؤن...... براؤن اٹیچی کیس اور ایک بیگ جو اس کے اوپر رکھا ہے۔‘‘

’’اگر آپ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تو آپ بیٹھ جائیے۔‘‘

اس شخص نے ادھر ادھر دیکھا جیسے کسی چیز کا سہارا لینا چاہتا ہو، بدرالدین پھرتی سے ٹرین پر چڑھ گیا، کیونکہ ٹرین چند ہی لمحوں کے بعد روانہ ہونے والی تھی۔ براؤن سوٹ کیس اور بیگ اس نے تلاش کر کے جلدی سے نیچے اتارا۔ ایک سواری جو آگے کہیں جا رہی تھی، نے ان دونوں چیزوں کی طرف رہنمائی کی اور کہا۔ ’’وہ بابا صاحب جن کے گردے میں درد ہو رہا ہے یہ انہی کا سامان ہے۔‘‘

’’اور تو کوئی چیز نہیں ہے۔‘‘

’’نہیں بس یہی دونوں چیزیں تھیں، پانی کی خالی بوتل انہوں نے باہر پھینک دی ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا اور بدرالدین پھرتی سے نیچے اتر گیا۔

اس کے اترتے ہی ٹرین دوسری سیٹی دے کر آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ شخص زمین پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ بدرالدین نے فوراً ہی دور کھڑے ہوئے دو قلیوں کو اشارہ کیا اور ان سے کہا کہ ہاتھ والی ٹرالی لے آئیں۔ اس کی بات سمجھ لی گئی۔ بدرالدین نے اسے پھر سہارا دے دیا تھا۔ ’’آپ بالکل فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

ٹرالی آگئی تو بدرالدین نے اس شخص کو زبردستی ٹرالی پر بٹھایا۔ اس کا سامان اس کے ساتھ رکھا اور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ یونین کا جنرل سیکرٹری ہونے کی وجہ سے اور ویسے بھی اپنی فطرت کی بنیاد پر سبھی بدرالدین کو پسند کرتے تھے۔ بدرالدین اس شخص کو لئے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں آیا۔ اسٹیشن ماسٹر موجود نہیں تھا۔ بدرالدین نے اس شخص کو ایک کوچ پر لٹایا اور پھر قلی سے بولا۔ ’’ان کے گردے میں درد ہے، کیا کریں بتاؤ؟‘‘

’’میرا خیال ہے اسپتال لے چلیں۔‘‘

’’ذرا بھاگ کر دیکھو، رحمت چچا کا تانگہ کہیں گیا تو نہیں ہے۔‘‘

قلی فوراً دوڑ گیا۔ رحمت چچا خود ہی قلی کے ساتھ آگیا تھا۔ اس شخص کو بڑی مشکل کے ساتھ باہر لا کر تانگے پر بٹھایا گیا اور بدرالدین ایک قلی کے ساتھ تانگے میں سوار ہوگیا وہ اس شخص کو سہارا دیئے ہوئے تھے۔

’’بہت درد ہو رہا ہے۔‘‘ بدرالدین نے ہمدردی سے سوال کیا۔

’’ہاں، ہاں...... میرے گردے میں، میرے گردے میں پتھری ہے، درد...... درد......‘‘ وہ شخص بمشکل بولا۔

’’حوصلہ رکھیں، ہم اسپتال جا رہے ہیں، آپ کو فوراً مدد مل جائے گی۔‘‘

اس شخص نے ممنون نگاہوں سے بدرالدین کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ کراہنے لگا، اس پر نیم غشی سی طاری تھی، پھر راستے میں ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔ بدرالدین کے دل میں ہمدردی کا سمندر موجزن تھا۔ شاد پور میں ایک اچھا خاصا اسپتال تھا۔ بدرالدین اسے لے کر اسپتال پہنچا۔

رحمت چچا اور صادق علی نے مدد کی اور قلی بھاگ کر اسٹریچر لے آیا اور پھر بھاری بھرکم شخص کو اسپتال کے اندرونی حصے میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے فوراً ہی کام شروع کیا۔ سب سے پہلے اس شخص کو یکے بعد دیگرے تین پین کلر انجکشن دیئے گئے اور پھر ڈاکٹروں نے بدرالدین سے معلومات حاصل کر کے اور کارروائیاں کرنا شروع کر دیں۔

بدرالدین نے رحمت چچا اور صادق علی سے کہا کہ وہ لوگ جائیں، وہ موجود ہے، اس شخص کا سامان ساتھ منگوا لیا گیا تھا اور بدرالدین خود اس کی نگرانی کر رہا تھا۔

رات کو کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اس شخص کو ہوش آیا۔ اس دوران اسے جنرل وارڈ کے ایک بیڈ پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ بدرالدین اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ سامان اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا تھا۔ اس شخص نے ہوش میں آکر ادھر ادھر دیکھا اور پھر بے اختیار اس شخص نے چونک کر بدرالدین کو دیکھا۔ ایک لمحے تک اسے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا، پھر بولا۔ ’’ہاں وہ دراصل......‘‘

’’آپ کا سامان، میری نگاہوں کے سامنے ہے، بالکل بے فکر ہو جائیے، اس میں سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔‘‘

اس شخص کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار نظر آئے پھر اس نے کہا۔

’’تم وہی ہو نا جس نے اسٹیشن پر......‘‘

’’میرا نام بدرالدین ہے، اب آپ اپنے بارے میں بتائیے، پہلے یہ بتائیے کہ درد کیسا ہے؟‘‘

’’اب نہیں ہو رہا، تیسری بار یہ درد اٹھا ہے۔‘‘

’’پتھری ہے آپ کے گردے میں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’کوئی علاج نہیں کرایا آپ نے؟‘‘

’’دوا کھاتا ہوں، کوئی مؤثر علاج ابھی تک نہیں ہوا، میرا نام غیاث اللہ ہے۔‘‘

’’آپ شاد پور ہی آئے تھے یا کہیں اور جا رہے تھے؟‘‘

’’نہیں۔ شاد پور ہی آیا تھا اکثر آتا رہتا ہوں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی دیکھا ہے، میں پہچان گیا تھا تمہیں۔‘‘

’’ہاں میں یہاں قلی کا کام کرتا ہوں، آپ یہاں......‘‘

’’کیا نام ہے بیٹے آپ کا؟‘‘

’’بدرالدین۔‘‘

’’بدرالدین، اچھے انسان ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، میں بہت بری حالت میں تھا اس وقت۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس چھوٹی سی جگہ کوئی میرے لئے کیا کر سکتا ہے، لیکن میں نے لمحہ لمحہ تمہاری مدد کو محسوس کیا ہے، جو عمل تم نے کیا ہے وہ کوئی جاہل آدمی نہیں کر سکتا، بدرالدین تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔‘‘

’’تھوڑا بہت جناب......‘‘

’’میرے لئے تم فرشتہ ہی ثابت ہوئے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے بروقت میری مدد کر کے میرا دل جیت لیا ہے۔ کاش میں بھی تمہارے لئے کچھ کر سکتا۔‘‘

’’یہ تصور انسان کا برسوں سے وتیرہ رہا ہے، لیکن یہ ہے افسوس ناک۔ میں نے یہ کام کسی بدلے کے لئے نہیں کیا۔‘‘

’’برا مان گئے بیٹے میری بات کا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے کام آتا ہے اور ایسے وقت میں آتا ہے جب اسے کسی ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے تو دل کا کوئی نہ کوئی گوشہ اس طرح پگھلتا ہے کہ بے اختیار دل چاہنے لگتا ہے کہ جس شخص نے ہمارے لئے کچھ کیا ہے کاش ہم بھی اس کے لئے کچھ کر سکیں۔ اگر تم نے میری بات کا برا محسوس کیا ہے تو میرا فرض ہے کہ تم سے معافی مانگوں، لیکن اس میں خلوص ہی خلوص تھا۔‘‘

’’میں جانتا ہوں جناب، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔‘‘

’’بدرالدین کتنی تعلیم ہے تمہاری؟‘‘

’’آپ بار بار یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟‘‘

’’بس بیٹے، اگر نہ بتانا پسند کرو تو کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

’’آپ اپنے بارے میں مجھے کچھ اور بتائیے۔ شاد پور میں آپ کا کوئی عزیز ہے۔‘‘

’’عزیز تو کوئی بھی نہیں ہے، ہاں کچھ کارندے ہیں، اصل میں، میں سبزی کا بیوپاری ہوں۔ خود میری یہاں کافی زمینیں ہیں جن پر سبزی کاشت ہوتی ہے۔‘‘

’’اچھا اچھا تب ٹھیک ہے۔‘‘

’’میں اصل میں، بس اچانک ہی یہاں آجاتا ہوں، پہلے سے کسی کو اطلاع بھی نہیں دیتا۔‘‘

’’مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتائیے، میں انہیں آپ کی آمد اور بیماری کے بارے میں خبر دیتا ہوں۔ انہیں آپ کے پاس بلائے دیتا ہوں۔‘‘

’’بلا دینا، اب میری حالت کافی بہتر ہے اور یقین کرو، اب کم از کم چھ سات مہینے تک یہ درد نہیں ہوگا۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔‘‘

’’تب کوئی بات نہیں ہے، آپ مجھے بتائیے میں آپ کو کہاں پہنچا دوں۔‘‘

’’بدرالدین، یہ بتاؤ اسٹیشن پر تمہاری کوئی ڈیوٹی ہے؟‘‘

’’نہیں اصل میں، میں یہاں کی یونین کا جنرل سیکرٹری ہوں، صرف آفس میں بیٹھتا ہوں۔ کوئی خاص کام نہیں کرتا، پہلے باقاعدہ سامان اٹھاتا تھا، لیکن اب ان لوگوں نے مجھے اپنے معاملات کے لئے مصروف کر دیا ہے۔‘‘

’’مجھے اندازہ تھا کہ تم پڑھے لکھے آدمی ہو، بدرالدین یہاں کہاں رہتے ہو؟‘‘

’’یونین آفس میں۔‘‘

’’نہیں میرا مطلب ہے تمہارا گھر کہاں ہے؟‘‘

’’میرا گھر اسٹیشن ہی ہے جناب۔ والدین مر چکے ہیں، کوئی عزیز و اقارب نہیں ہے، بس اسی لئے یہاں زندگی گزار رہا ہوں، بہت اچھے لوگ ہیں میرے ساتھی۔ ہر طرح سے میرا ساتھ دیتے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے بدرالدین اب یہ بتاؤ فی الحال کوئی مصروفیت ہے تمہاری۔‘‘

’’نہیں آپ مجھے حکم دیجئے۔ آپ جہاں چاہیں میں آپ کو پہنچا سکتا ہوں۔‘‘

’’یہاں سے میری چھٹی کراؤ۔‘‘

’’چھٹی ہی سمجھئے، میں ڈاکٹر صاحب سے بات کئے لیتا ہوں۔‘‘ بدرالدین نے کہا۔

پھر وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچا، ڈاکٹر نے غیاث اللہ کو جانے کی اجازت دے دی تھی، دواؤں کا ایک نسخہ لکھ دیا گیا تھا۔ غیاث اللہ نے اخراجات کے بارے میں پوچھا۔ تھوڑا سا خرچ ہوا تھا جو بدرالدین نے اپنی جیب سے ادا کر دیا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ’’آپ اگر میرے اس تعاون کو میرا احسان سمجھتے ہیں تو تھوڑا سا احسان اور کر لیجئے اور اخراجات وغیرہ کے بارے میں نہ پوچھئے، نہ ہونے کے برابر ہوئے ہیں، آپ سے وصول کر کے مجھے شرمندگی ہوگی۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’آپ براہ کرم کچھ نہ پوچھئے۔ بس یہ بتائیے میں آپ کو کہاں لے چلوں۔‘‘

غیاث اللہ خاموش ہوگیا، چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔ ’’کوئی تانگہ وغیرہ۔‘‘

’’لے کر آتا ہوں۔‘‘ رحمت چچا تو اسٹیشن واپس چلے گئے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد ایک اور تانگہ مل گیا اور بدرالدین غیاث اللہ کا سامان اٹھا کر تانگے میں آبیٹھا۔ ’’اب بتائیے کہاں چلنا ہے؟‘‘

’’سبزی منڈی، وہاں پر میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لیا ہوا ہے، جب بھی یہاں آتا ہوں وہیں پر اترتا ہوں۔‘‘

وہ چھوٹا سا کمرہ چھوٹا سا کمرہ نہیں تھا بلکہ ایک اچھا خاصا مکان تھا جس میں ایک ملازم بھی ہمیشہ رہا کرتا تھا۔ غیاث اللہ کو دیکھ کر ملازم دوڑا دوڑا آیا۔ اس کا سامان اٹھایا اور غیاث اللہ نے کہا۔ ’’آؤ بدرالدین......‘‘

’’اگر مناسب سمجھیں تو مجھے اجازت دیں۔‘‘

’’مناسب نہیں سمجھتا۔‘‘ غیاث اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور بدرالدین کو اپنے ساتھ لے کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر سے بھی گھر بہت شاندار تھا۔

’’کہا تو آپ نے ایسے تھا جیسے کسی مسافر خانے کا کمرہ ہو۔‘‘

’’دنیا مسافر خانہ ہے بدرالدین، اسے بھی مسافر خانہ ہی سمجھو۔‘‘

’’آپ مجھے بتائیے میں آپ کی اور کیا خدمت کر سکتا ہوں؟‘‘

’’اب تو خدمت مجھے کرنی ہے، میں تمہیں ایک چیز دکھاؤں؟‘‘

’’دکھائیے۔‘‘

’’وہ چھوٹا بیگ ذرا اٹھانا۔‘‘ غیاث اللہ نے چھوٹے بیگ کی طرف اشارہ کیا اور بدرالدین نے بیگ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

غیاث اللہ نے بیگ کی زپ کھولی اور پھر اس میں سے پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سامنے رکھنا شروع کر دیں۔ سات آٹھ گڈیاں تھیں۔ بدرالدین خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا، غیاث اللہ نے کہا۔ ’’بدرالدین اور بھی میرے پاس کافی سامان ہے۔‘‘

’’اجازت عطا فرمائیں گے آپ۔‘‘ بدرالدین سرد لہجے میں بولا۔

غیاث اللہ ہنسنے لگا۔ ’’تم جیسے نیک اور شریف آدمی کو اس بات کا برا ماننا ہی چاہئے تھا، مجھے معاف کرنا میں بس جائزہ لے رہا تھا۔ دیکھو بدرالدین، احسان کا کوئی صلہ نہیں دیا جا سکتا، مگر میں تم سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اتنی بڑی رقم دیکھ کر بھی تم چونکے اور نہ تمہارے چہرے پر کوئی ایسا تاثر ابھرا جس سے میں یہ سمجھتا کہ تم اس رقم کو دیکھ کر متاثر ہوئے ہو، بدرالدین مجھے تمہارے جیسے ایک ساتھی کی شاد پور میں ضرورت ہے۔‘‘

’’دیکھئے غیاث اللہ صاحب......‘‘

’’میری بات سن لو پہلے پوری۔ میں تمہیں اس میں سے کچھ دینا چاہتا

☆......☆......☆

چوہدری سردار علی کی صحت کافی خراب ہوگئی تھی۔ حاجی حمید خاں اور اس کی بیوی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ اس خاندان کے احسان مند بھی تھے اور ہر طرح سے چوہدری سردار علی کی تیمارداری اور دیکھ بھال کر رہے تھے۔ چوہدری کے اندر ایک جنونانہ سی کیفیت بیدار ہوگئی تھی۔ کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا رہتا تھا اور اس کی بڑبڑاہٹ میں یہ الفاظ شامل ہوتے تھے۔

’’ذرا سی بات تھی، ارے زمینیں کیا اپنے ساتھ آسمان پر لے جائی ہوتی ہیں۔ سب کچھ یہیں رہ جاتا ہے، پتہ نہیں انسان کیا چیز ہے۔ انسان یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے۔ مجھے کوئی بتاؤ کس لئے کرتا ہے۔ ارے بابا یہ لوگ محنت کر رہے تھے۔ اچھی فصل اگا رہے تھے۔ کسی کا کیا جاتا تھا میرا کیا جاتا تھا۔ ہائے میری بیٹی، ہائے میرا بیٹا۔ ارے کیا کروں میں اور کیا نہ کروں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ سر پیٹنے لگتا تھا۔

پھر اس دن وہ بیٹھا ہوا تھا کہ حاجی حمید خاں ایک اخبار ہاتھ میں لئے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ دوڑا دوڑا چلا آیا۔ چوہدری سردار علی کے سامنے اس نے پھولے پھولے سانس کے ساتھ کہا۔ ’’مبارک ہو چوہدری صاحب مبارک ہو۔‘‘

چوہدری نے یاس بھری نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پر درد لہجے میں بولا۔ ’’کیا ہوا، میرے خاندان کا کوئی اور فرد مر گیا؟‘‘

حاجی حمید ایک دم سنبھل گیا اور بولا۔ ’’نہیں چوہدری صاحب! آپ کا بیٹا صفدر علی زندہ ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘ چوہدری سردار اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

’’ہاں یہ دیکھئے اخبار کی خبر دیکھئے۔‘‘

چوہدری سردار نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے خبر پڑھی اور زار و قطار رونے لگا۔ حاجی حمید اور اس کی بیوی چوہدری کو دلاسے دینے لگے۔

چوہدری نے کہا۔ ’’لوگ مجھ سے کتنی نفرت کرنے لگے ہیں۔ حیدر علی نے بھی مجھے یہ خبر نہیں سنائی۔ میرے داماد رحمان علی نے بھی مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کتنا بدنصیب ہوں میں۔ سب مجھ سے دور ہوگئے ہیں۔ مگر وہ غلط نہیں ہیں، حمید خاں وہ غلط نہیں ہیں۔ میری ہی وجہ سے تو ان سب پر مصیبتیں نازل ہوئی ہیں، سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے، ارے کیا نہیں تھا میرے پاس، حاجی، میں اپنے بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’چوہدری صاحب! اصل میں آپ کو پتہ ہے کہ حیدر علی نے آپ کو یہاں کس لئے بھیجا ہے۔ حیدر علی آپ کو دنیا کے سامنے نہیں لانا چاہتے، آپ خود اندازہ لگائیے اگر ایسا ہوتا تو وہ خود آپ کو خبر کرتے۔ مجھے بھی اخبار آپ کے سامنے نہیں لانا چاہئے تھا، لیکن آپ سے بڑی محبت اور بڑی ہمدردی رکھتا ہوں، برداشت نہیں کر سکا اس خوشی کو اور آپ تک اخبار لئے چلا آیا بلکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر میں نے حیدر علی کو یہ بتا دیا کہ اخبار آپ کو دکھا دیا گیا ہے تو وہ مجھ سے ناراض ہوں گے۔ آپ کو اس بات کا علم ہے، چوہدری صاحب کہ آپ کے بیٹے نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے اور انہی کی بدولت آج میں آرام کی زندگی گزار رہا ہوں۔ وہ اگر ناراض ہوگئے تو میرے لئے تو بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔‘‘

’’ارے، میری بھی تو سن لو کوئی، جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی کر رہا ہوں۔ اپنے آپ کو بالکل قید کر کے رکھ لیا ہے، پاگل سمجھ رہے ہیں سسرے مجھے۔ پاگل نہیں ہوں۔ میں بالکل پاگل نہیں ہوں۔ اب یہ خوشی میں کیسے برداشت کروں؟‘‘

’’دیکھئے چوہدری صاحب، یہی کہوں گا میں آپ سے کہ اگر وہ لوگ یہ بات آپ کو بتانا چاہتے تو خود بتاتے، مجھے معاف کر دیجئے، غلام ہوں آپ کا میں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی غلطی ہو جائے مجھ سے جو میرے لئے جان کا روگ بن جائے۔‘‘

چوہدری سردار علی ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ’’ٹھیک کہتے ہو تم، وقت جب بگڑتا ہے تو انسان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ چلو ایک کام تو کر سکتے ہو تم اب جب یہ اطلاع مجھے دے دی ہے تو روز اخبار مجھے لا کر دیا کرو۔‘‘

’’آپ خدا کے لئے اس کے علاوہ اور کچھ نہ کریں۔‘‘

’’مذاق اڑا رہے ہو میرا۔ کر سکتا ہوں کچھ یہ بتاؤ۔ ہے میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ جو میں کچھ کر لوں۔ کچھ بھی نہیں کروں گا میرے بھائی۔ بس مجھے خبریں سناتے رہو۔‘‘

حاجی حمید بھی غمزدہ تھا۔ جانتا تھا کہ چوہدری وہ شخص ہے جس کے آگے کسی کو دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی تھی۔ اب اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے۔ بہرحال اخبار ملنا شروع ہوگیا اسے، جب بھی کوئی خبر ملتی اس کے دل میں ہوک اٹھتی۔ حیدر علی نے خاص طور سے حاجی حمید کو ہدایت کر دی تھی کہ اسے موبائل فون دیا جائے نہ گھر سے باہر نکلنے دیا جائے، بڑے خطرناک حالات تھے۔ موت تو ان کے سر پر منڈلا ہی رہی تھی، لیکن وہ اور کوئی ایسا عمل نہیں چاہتے تھے جو اس موت کو ان کے لئے اور شدید کر دے چنانچہ حیدر علی نے تھوڑی سی سختی برتنا شروع کر دی تھی۔ بہرحال بات اس حد تک پہنچ گئی جب اختر علی بری ہوگیا۔ صفدر علی کے عدالت میں پیش ہونے کی پوری تفصیل موجود تھی۔ چوہدری سردار علی نے بڑے خوش ہو کر کہا۔ ’’چلو اللہ نے میرے بیٹوں کی جوڑی سلامت رکھی۔‘‘

ویسے چوہدری سردار علی بڑی بے کسی کے عالم میں وقت گزار رہا تھا۔ اکثر وہ یہی کہتا تھا کہ حمید خاں کم از کم میرا یہ پیغام تو میرے بیٹے کو دے دو کہ مجھ سے آکر مل لیں، مجھے تو ایک طرح سے یہاں قید کر دیا گیا ہے۔

’’میں آپ کا یہ پیغام کسی نہ کسی طرح حیدر علی صاحب تک پہنچا دوں گا۔‘‘

’’یہ بھی کہہ دینا اس سے کہ مجھ سے ملنے آئے تو صفدر علی کو بھی ساتھ لے کر آئے، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، ہائے کیسا بے بس اور بدنصیب باپ ہوں، میں اپنے بچوں سے نہیں مل سکتا۔ وہ حویلی جسے میں نے پتہ نہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا دیکھ بھی نہیں سکتا، بڑا غم ہے مجھے۔‘‘

دن گزرتے رہے، وقت گزرتا رہا۔ حاجی حمید خاں نے حیدر علی کو چوہدری سردار کا پیغام پہنچایا تو حیدر علی نے کہا۔ ’’حاجی صاحب! ان کو نہیں گھر سے نکلنا چاہئے نہ میں ابھی ان کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ حالات جیسے ہی بہتر ہوئے میں اور صفدر علی ضرور ان کے پاس آئیں گے۔‘‘ حیدر علی نے صفدر علی کا اصل واقعہ تک حمید خاں کو نہیں بتایا تھا نجانے حالات کیا رخ اختیار کر جائیں۔

بہرحال یہ پیغام حمید خاں نے چوہدری سردار علی کو دے دیا تھا اور سردار علی دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ سردار علی نے اس وقت جب حمید خاں کی بیوی اس کے لئے چائے لائی تو ملتجی لہجے میں کہا۔ ’’بھائی، دیکھو تم دونوں میرے ملازم نہیں ہو، میں ماضی میں کچھ بھی تھا۔ وقت نے میری اوقات درست کر دی ہے۔ میں یہاں بڑی تنہائی محسوس کر رہا ہوں، تم دونوں میرا ہر طرح سے خیال رکھتے ہو۔ میرا احترام کرتے ہو اس بات کو میں اچھی طرح مانتا ہوں۔ تھوڑا سا وقت بھی مجھے دیا کرو۔ مجھ سے باتیں کیا کرو۔ میں اپنی اصلاح چاہتا ہوں، جاؤ بہن۔ حاجی حمید کو میرا یہ پیغام دے دو، ان سے کہو کہ روزانہ باقاعدگی کے ساتھ مجھے وقت دیا کریں۔‘‘

حاجی حمید کی بیوی خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد حاجی حمید اپنی بیوی کے ساتھ چوہدری سردار علی کے پاس پہنچ گیا۔

’’آؤ بیٹھو، اخبارات تو ایک دم خاموش ہوگئے ہیں، کوئی نئی خبر شائع نہیں کر رہے۔‘‘

’’آپ کچھ نئی خبریں سننا چاہتے ہیں چوہدری صاحب؟‘‘ حاجی حمید نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

’’ارے بھائی میں کیا اور میری اوقات کیا، بس گزر گئی جو گزرنی تھی۔‘‘

’’خبریں سننے کو ملیں گی چوہدری صاحب، مگر وقفہ ضروری ہے۔ سارے کام ایک ساتھ ہو جاتے ہیں تو کچھ مزہ نہیں آتا۔ اب دیکھیں نا آپ کی بیٹی مر گئی۔ بہو مر گئی، بیٹا مر گیا، تین افراد کم ہوئے ہیں آپ کے خاندان سے۔ اگر کوئی چوتھا واقعہ پہلے سے ہوگیا تو آپ مجھے بتائیے کہ کیا کیفیت ہوگی آپ کی۔ آپ کو ایسا تو نہیں کرنا چاہئے۔‘‘

’’پتہ نہیں کیسی باتیں کر رہے ہو حمید خاں تم، کتنی بے دردی سے میرے خاندان کی بربادی کا ذکر کر رہے ہو؟‘‘

’’اب درد محسوس کر رہے ہو چوہدری، اس وقت کوئی درد نہیں اٹھا تھا تمہارے سینے میں، جب میرا بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور تم قہقہے لگا رہے تھے۔ مزے لو سردار علی، مزے لو۔ آہستہ آہستہ تمہیں غم ملنا چاہئے تاکہ تم اپنے خاندان کی موت کے غم سے سوکھ کر پنجر بن جاؤ۔‘‘

اچانک ہی حمید خاں کی آواز بدل گئی اور چوہدری سردار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

’’مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میرا تو یہاں کوئی کام ہی نہیں ہے۔‘‘ حاجی حمید کی بیوی بولی اور پھر آہستہ آہستہ ان کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ ان کے نقوش تبدیل ہونے لگے اور جب ان کا مکمل چہرہ تبدیل ہوا تو چوہدری سردار کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

’’نظام دین۔‘‘

’’اور میرا نام شریفاں ہے۔‘‘ حاجی حمید کی بیوی جس کے چہرے کے نقوش تبدیل ہوگئے تھے شرما کر بولی اور اس نے گردن جھکا لی لیکن چوہدری سردار بری طرح چیختا ہوا دروازے کی طرف بھاگا تھا۔

(جاری ہے)

خوف

ایم اے راحت

قسط : 8

دروازہ بند تھا۔ وہ بری طرح دروازے سے ٹکرایا اور اس کے سر میں چوٹ لگی لیکن اس کی ٹکر سے دروازہ کھل گیا اور وہ بمشکل تمام خود کو گرنے سے بچاتا ہوا کسی سے ٹکرایا۔ سامنے اسے جو شخص نظر آیا، وہ حمید خان تھا۔ ایک بار پھر اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

حمید خان نے اسے اپنے ہاتھوں پر روکا اور بولا۔ ''کیا ہوا چوہدری صاحب! کیا ہوا؟''

''وہ اندر...... وہ اندر......!''

''اندر کیا ہے؟''

''دونوں ہیں، دونوں۔''

''کون دونوں......؟'' حمید خان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی۔

''ہم...... میں اب اندر نہیں جاؤں گا، وہ دونوں ہیں...... خدا کی قسم، وہ دونوں اندر موجود ہیں، نظام دین اور اس کی بیوی شریفاں!''

حمید خان نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ چوہدری سردار علی کی ذہنی کیفیت کافی ابتر ہو گئی ہے۔ بہر حال وہ چوہدری کو سنبھالے ہوئے دوسرے کمرے میں لائے۔

''انہیں تو دیکھ لو، میری بات پر یقین آجائے گا، دونوں اندر موجود ہیں، تم دونوں کی شکلوں میں آئے تھے اور پھر اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی۔''

''کس نے چوہدری صاحب؟''

''نظام دین نے، یار! تو میری بات سن ہی نہیں رہا، اپنی بک بک لگائے جا رہا ہے، کوئی میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

حمید خان نے ٹھنڈی سانس لی اور بیوی سے بولا۔ ''چوہدری صاحب کو پانی پلا، ارے چوہدری صاحب! آپ کے سر سے تو خون بہہ رہا ہے۔''

''لعنت ہے اس گندے خون پر، بہہ رہا ہے تو بہنے دو، خدایا میری زندگی کیا سے کیا ہو گئی، اب میری زندگی میں صرف مذاق ہی مذاق رہ گیا ہے، حمید خان قسم لے لو جس کی چاہے، وہ دونوں تمہارے روپ میں آئے تھے، نظام دین نے مجھ سے طنزیہ باتیں کیں، کہنے لگا کہ وہ دن دور نہیں ہے جب اپنی اولادوں کے غم میں سوکھ کر پنجر ہو جاؤ گے، پہلے بھی اس نے یہی بات کہی تھی، اس نے کہا تھا کہ چوہدری سب سے آخر میں تیرا نمبر آئے گا، غم کے مزے لے، ارے اور کیا غم ملے گا اب مجھے، دو کوڑی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔''

حمید خان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ دل تو چاہا تھا کہ چوہدری سے کہے کہ چوہدری صاحب! اللہ کی لاٹھی کبھی کبھی آواز بھی دینے لگتی ہے، ہمیشہ ہی بے آواز نہیں ہوتی، جو کیا ہے، وہ بھر رہے ہو لیکن ایسی بات وہ چوہدری سردار علی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہر حال کچھ احسان بھی تھا، چوہدری سردار کا نمک بھی اس کے بیٹوں کا۔ وہ دلاسے دینے لگا۔

''اللہ پر بھروسہ کریں چوہدری صاحب! کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

''ایک بات سنو حمید خان! میرا ایک کام کر دو گے؟''

''جی بتایئے۔''

''میں حویلی جانا چاہتا ہوں۔''

''حویلی......؟'' حمید خان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں، کیوں میرا گھر ہے بھائی، میرے بچے ہیں، جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا، ایک بات میں تمہیں بتا دوں، ابھی تک تو میں سب کچھ سہہ رہا ہوں مگر میرا نام بھی چوہدری سردار علی ہے، اگر میرا سر گھوم گیا تو اس قبرستان کو زمین کے برابر کرا دوں گا، ساری قبریں کھدوا کر پھنکوا دوں گا، نظام دین اور اس کے خاندان والوں کی، ارے کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آ رہی، خودکشی تو انہوں نے خود کی ہے، میں نے سب کو تو نہیں مارا، ایک رجب شاہ، رجب شاہ......!'' چوہدری سردار علی کو ایک دم خیال آگیا کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے۔ حمید خان کتنا ہی وفادار سہی لیکن چوہدری کو کسی کے سامنے یہ اعتراف نہیں کرنا تھا کہ رجب شاہ کو قتل کرانے والا وہ خود ہے۔ حمید خان سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ایک رجب شاہ کی موت کیا ہوئی۔ میرے سر پر تو مصیبت ہی آ گئی۔''

حمید خان خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چوہدری سردار علی نے کہا۔ ''حمید خان! حیدر علی کو اطلاع دے دو، تمہاری مہربانی ہو گی بھائی! حیدر علی کو اطلاع دے دو کہ میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں اور دیکھو تم مجھے قید تو نہیں کر سکتے نا...... میری بات مان لو، ایسا کرو حیدر علی کو یہاں بلا لو، میں خود اس سے بات کر لوں گا۔''

''چوہدری صاحب! آپ کے سر پر کوئی دوا لگا دوں؟''

''بھاڑ میں جھونکو تم دوا کو، کوئی دوا نہیں لگاؤں گا میں، میرے تو پورے بدن پر ایسے زخم ہونے چاہئیں، یہ تو معمولی سا زخم ہے، اچھا یار! ایک کام تو کرو، ذرا کمرے میں جھانک کر تو دیکھو کوئی ہے کیا؟''

''تم دیکھو جا کر۔'' حمید خان نے اپنی بیوی سے کہا۔ لیکن عورت ذات تھی، کسمسا کر رہ گئی اور اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔

''میں دیکھتا ہوں، آؤ۔'' حمید خان نے کہا اور پھر دونوں میاں، بیوی باہر نکل گئے۔ چوہدری سردار علی خوف زدہ انداز میں دروازے کو دیکھتا رہا تھا۔

حمید خان، بیوی کے ساتھ چوہدری سردار علی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کسی طرح کے کوئی نشانات نہیں تھے۔ حمید خان کی بیوی نے کہا۔

''ان کے دل و دماغ پر نظام دین سوار ہیں اور بات بھی سچی ہے، دیکھو اسے کہتے ہیں جیسی کرنی، ویسی بھرنی۔''

''اب ایسی باتیں مت کرو، ہم پر ان کا بڑا احسان ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اب کریں کیا؟ چوہدری صاحب پر جو وحشت سوار ہے، وہ انہیں طرح طرح کے خواب دکھاتی ہے، جو کہانی انہوں نے سنائی ہے بڑی خوفناک ہے۔''

''سچ کہہ رہی ہوں، میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں، مجھے ڈر لگنے لگا ہے، بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس طرح وہ ہمارا بھیس بدل کر آ جائیں۔''

حمید خان سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''بات اگر صرف ہمارے ذہن کی ہوتی تو الگ تھی، جو واقعات بیت رہے ہیں، وہ بڑے عجیب ہیں، چوہدری صاحب کا بیٹا مر کر زندہ ہو گیا، کتنی عجیب بات ہے، صفدر علی کے بارے میں تو تم نے سن لیا مگر ایک بات پر تعجب ہے مجھے ان لوگوں نے یہاں آ کر چوہدری سردار علی کو تفصیل نہیں بتائی، ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ چوہدری سردار علی کو ان معاملات سے ہر قیمت پر دور رکھنا چاہتے ہوں۔''

حمید خان کی بیوی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔ ''بڑا ہی کیا ہے چوہدری سردار علی نے بھی، مان ہی لیتا نظام دین کی بات تو کیا بگڑ جاتا اس کا، اللہ نے اتنا کچھ دیا ہے، کسی غریب سے اس کی زمین کا ٹکڑا چھیننا کوئی اچھی بات ہے؟''

باہر سے چوہدری سردار علی کی آواز سنائی دی۔ ''ارے کیا ہوا، باہر نہیں آ گئے تم لوگ......؟''

حمید خان اپنی بیوی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ چوہدری سردار علی ان دونوں کو دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور پھر ان کے عقب میں دیکھنے لگا۔

''نہیں چوہدری صاحب! کوئی نہیں ہے، وہم ہو گیا ہے آپ کو۔''

''یار! ایسی باتیں مت کرو، میں ابھی ہوش میں ہوں اور یہی میری بدنصیبی ہے کہ اللہ نے مجھ سے میرے ہوش نہیں چھین لئے، پاگل ہو جاتا، دماغ خراب ہو جاتا تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہوتی، وہ کہاں ہوں گے اب اندر...... مگر قسم لے لو میں نے ایک لفظ غلط نہیں کہا، وہ تمہارے روپ میں آئے تھے اور نظام دین بڑی طنزیہ باتیں کر رہا تھا اور ٹھیک ہی ہے اس کا طنز، اکلوتا بیٹا تھا اس کا، اللہ نے مجھے میرا اصغر علی واپس دے دیا، میرے لئے دعا کرو حمید خان کہ میری پھلواری کا اور کوئی پھول کبھی نہ ٹوٹے۔''

حمید خان اور اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ چوہدری سردار علی نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بولا۔ ''میری حویلی روانگی کا بندوبست کر دو، ایسا کرو حیدر علی کو یہاں بلا دو تم جا ہو تو میری بات کرا دو اس سے اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں، اگر تم نے میری یہ بات نہیں مانی تو میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا پھر جو کچھ بھی ہو گا، دیکھا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں حیدر علی سے بات کرتا ہوں، وہ جو بھی کہیں۔''

حمید خان نے حیدر علی سے رابطہ کیا اور اسے ساری تفصیل بتا دی۔

حیدر علی نے کہا کہ وہ بہت جلد جواب دے گا لیکن جواب دینے کے بجائے وہ خود ہی آ گیا۔ وہ حمید خان سے ملا اور اس نے چوہدری صاحب کے بارے میں پوچھا۔

''دھمکی دی ہے انہوں نے کہ اگر حیدر علی بھیا میں نے آپ کو اطلاع نہ دی تو وہ خاموشی سے یہاں سے نکل جائیں گے۔''

حیدر علی کی آواز سن کر چوہدری سردار باہر آ گیا اور بھاگ کر حیدر علی سے لپٹ گیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے اس طرح میری حویلی سے بے دخل مت کرو، میرا اصغر علی نہیں آیا، کہاں ہے وہ؟ مجھے اس سے ملاؤ، میرا دل تڑپ رہا ہے اسے دیکھنے کے لئے۔''

''آپ یہاں آرام سے تھے، حویلی کے جھگڑوں سے دور......!''

''ارے کچھ آرام سے نہیں ہوں، وہ دونوں یہاں بھی پہنچ گئے، نظام دین اور اس کی بیوی شریفاں آ گئے، مجھ سے کہنے لگے کہ ابھی تو مجھے مزید غم کے مزے چکھنے ہیں، وہ آسانی سے مجھے نہیں ماریں گے، آہ کاش تم سب کو نقصان پہنچانے سے پہلے وہ مجھے ختم کر دیتے، میرے بیٹے! مجھے لے چلو، اگر تم مجھے نہیں لے گئے تو میں خود حویلی آ جاؤں گا، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا، مجھے حویلی لے چلو۔''

''ٹھیک ہے، آپ تیاری کریں۔'' حیدر علی نے کہا اور گردن جھکا لی۔ وہ جانتا تھا کہ مزید کتنی پریشانیاں اس کا انتظار کر رہی ہیں لیکن باپ کی بات کو ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا، اس کے علاوہ حمید خان کی پریشانی کا بھی اسے پورا پورا احساس تھا۔ کسی کو بس اتنا ہی تنگ کیا جا سکتا ہے۔ سردار علی کی جو کیفیت نظر آ رہی تھی، اس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حمید خان کو کتنا پریشان کرتا ہو گا۔

بہر حال حیدر علی، چوہدری سردار علی کو لے کر شاد پور چل پڑا اور راستے میں اس نے سردار علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ابا جی! سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ لوگوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرنا چھوڑ دیں، میں نے آپ کو وہاں سے اس لئے ہٹایا تھا کہ آپ گھبراہٹ میں وہ تمام اعترافات کرنے لگے تھے جو آخر کار ہمیں مصیبت میں پھنسا سکتے ہیں۔''

''بیٹا! خیال رکھوں گا، مصیبت میں تو ہم پھنسے ہوئے ہیں، ارے اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ہمیں اس مشکل سے نکلوا دے، حیرت ہے آج تک تم لوگوں کو ایسا کوئی عامل نہیں مل سکا جو ہماری اس مشکل کو ٹالنے میں ہماری مدد کرے۔''

''بہت سے لوگوں سے کہا ہے ابا جی! پر ایسے معاملات میں کون ہاتھ ڈالتا ہے اور پھر ہماری کہانی اتنی مشہور ہو گئی ہے کہ ہر شخص کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔''

چوہدری سردار علی نے حیدر علی کی بات سن کر گردن جھکائی۔

☆......☆......☆

اس خاندان سے متعلق جتنے افراد تھے، وہ سب محتاط ہو گئے تھے۔ لوگ اس بارے میں بہت سی باتیں کرتے تھے۔ جن لوگوں کی کوئی دور کی رشتے داری تھی، انہوں نے بھی اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ خاندان والے کہا کرتے تھے کہ نا بھیا...... چوہدری سردار علی سے دوستی رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ نظام دین کے خاندان والوں کو اپنی طرف بھی متوجہ کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں سردار علی کا داماد رحمان علی سب سے آگے آگے تھا۔ اس وقت بھی جب وہ چوہدری سردار علی کے گھر سے واپس لوٹا تھا اور اسے یہ علم ہوا تھا کہ صفدر علی کے روپ میں نظام دین کے بیٹے کی روح تھی تو وہ بھی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ گھر آنے کے بعد وہ پریشان پریشان سا رہا۔ آسیہ البتہ کافی بہادر اور نڈر لڑکی تھی۔ رحمان علی کو دیکھ کر بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے رحمان! کیا میرے دل پر چھریاں نہیں چل رہیں، میں تو یہ سوچ کر خوش ہو گئی تھی کہ میرا بھائی زندہ ہے مگر کیا پتہ کہ ہماری تقدیر میں یہ بے بسی لکھی ہوئی ہے۔''

''آسیہ بدقسمتی سے میرا تعلق بھی آپ کے خاندان سے جڑ چکا ہے، جس طرح فردوس جہاں، چوہدری سردار علی کی بہو تھی، اسی طرح میں بھی اس کا داماد ہوں۔''

''تم اپنی زندگی سے خوف زدہ ہو؟''

''ہر شخص ہوتا ہے، میں ہوں تو ایسی کیا بات ہے؟''

''تم سے زیادہ تو میری زندگی کو خطرہ ہے کیونکہ میں چوہدری سردار علی کی بیٹی ہوں۔''

''یہی میں بھی سوچتا ہوں، جس طرح نور جہاں مر گئی، اللہ نہ کرے تمہارے اوپر بھی کوئی ایسی مصیبت نازل ہو جائے، اپنے آپ کو بہلانے والی بات الگ ہے، ہم اس خاندان سے الگ کہاں ہیں؟''

''تم ڈرتے ہو۔''

''ارے بابا انسان ہوں، ڈروں گا نہیں تو کیا ہو گا، مصیبت آپ کے والد صاحب کی خریدی ہوئی ہے، شکار باہر کے لوگ ہو رہے ہیں۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو رحمان علی، کیا یہ الفاظ بالکل اجنبیوں جیسے نہیں؟''

''دیکھیں تو سہی ذرا صفدر علی کے روپ میں احمد دین کتنا بھیانک لگا تھا، اس وقت جب اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دی تھی، روحوں کو اتنے پاس سے کس نے دیکھا ہے، لوگوں کو اپنے دلوں پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''ایک بات کہوں تم سے رحمان علی......؟''

''ہاں بولو۔''

''ہم میں سے کوئی نہیں مرے گا۔''

''بڑا اعتماد ہے، ابا جان جو کچھ کر بیٹھے ہیں......؟''

''دیکھو بار بار مجھے اس کا طعنہ مت دو، تمہیں پتہ ہے کہ ہم لوگ کتنے بڑے حالات سے گزرے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان حالات میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے، میں بھی تو مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں، یار کمال کی بات ہے محترمہ میاں تمہارے خاندان کا حصہ ہیں، چوہدری سردار علی نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیک کام نہیں کیا، ادھر سے مارا، اُدھر سے مارا، اس کا چھینا، اُس کا چھینا، تم بتاؤ نتیجہ کیا نکلے گا، وہی نا جو نکل رہا ہے؟''

''یار! تم مسلسل مجھے ذلیل کئے جا رہے ہو، چوہدریوں کا کام اور کیا ہوتا ہے۔''

''چوہدریوں کا کام تو جو کچھ ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ لیکن اس کے ساتھ میرا مطلب ہے، گیہوں کے ساتھ گھن جو پستا ہے، اس کا کیا کرو گی؟''

''تم کچھ کر سکتے ہو تو کر لو، میں نے کون سا منع کر دیا؟''

''دیکھو آسیہ! اپنے آپ کو اس قدر لاتعلق مت رکھو، بے شک میں مانتا ہوں کہ تم نڈر لڑکی ہو لیکن پھر بھی خوف کی بات تو ہے، میں تمہیں ایک بات صاف بتائے دیتا ہوں کہ میں اب حویلی نہیں جاؤں گا۔''

''تمہاری مرضی بابا، مگر میں اپنے باپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی، اللہ نے مجھ سے میرا بھائی اور بہن چھین لی لیکن میرا باپ تو زندہ ہے، میرا ایک بھائی تو زندہ ہے۔''

''ہاں بھائی اور بہن چھین لئے ہیں اور وہ جو بے چاری فردوس جہاں مفت میں ماری گئی، اس کا کوئی ذکر نہیں؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں اب!'' آسیہ نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا اور رحمان علی گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

غیاث اللہ کو شاید بدرالدین زیادہ ہی پسند آ گیا تھا۔ صاحب حیثیت آدمی تھا، بے پناہ دولت مند لیکن طبیعت میں سادگی تھی۔ اسے بدرالدین اس لحاظ سے زیادہ پسند آیا تھا کہ وہ اس کی دولت کی جانب منہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس دن وہ اس کے گھر سے چلا گیا تھا۔ غیاث اللہ نے کئی دن یہاں گزارے، وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔ گردے کا درد چھ سات مہینے کے بعد اٹھتا تو اسے بے حال کر دیتا لیکن اس کے بعد ٹھیک ہو جاتا تھا اور پھر وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔

جب وہ تندرست ہوا تو اپنے ایک خاص آدمی کے ساتھ اسٹیشن چل پڑا۔ اسٹیشن پہنچ کر وہ قلیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اسٹیشن سے باہر ہی اسے رحمت علی نظر آ گیا اور غیاث اللہ نے رحمت علی کو پہچان لیا۔ وہ تانگے کے پاس پہنچ گیا۔

رحمت علی نے غیاث اللہ کو دیکھ کر کہا۔ ''آیئے چوہدری صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے، کیسی طبیعت ہے؟''

''آپ نے مجھے پہچان لیا؟''

''لو جی دن، رات یہاں رہتے ہیں، لوگوں کو دیکھتے ہیں اور آپ تو اکثر یہاں آتے رہتے ہیں، ہم نے اس سے پہلے بھی آپ کو یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے اور پھر بدرو نے بتایا تھا کہ آپ یہاں کھیتی باڑی کرتے ہیں۔''

''ہاں بس تھوڑا بہت کام کرتا ہوں بھیا، یہ بدرالدین کہاں ہے؟''

''یونین آفس میں بیٹھے ہوں گے، میں لے چلوں آپ کو وہاں؟''

''نہیں، میں نے یونین آفس دیکھا ہے، اس دن جب میرے گردے میں درد اٹھا تھا تو بدرالدین مجھے وہیں لے گئے تھے۔'' غیاث اللہ یہ کہہ کر بدرالدین کے دفتر کی جانب بڑھ گیا۔

بدرالدین اپنے کام میں مصروف تھا۔ غیاث اللہ کو دیکھ کر وہ خوش اخلاقی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ارے آپ یہاں، آپ مجھے بلوا لیتے اپنے پاس......!''

''ناراض بچے کبھی کبھی سرکشی بھی کرتے ہیں، تم جس طرح وہاں سے چلے آئے تھے، اس کے بعد میری ہمت نہیں پڑی۔''

''آیئے بیٹھئے، ارے شبیر خان ٹھنڈی بوتل لاؤ، میرے مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

غیاث اللہ نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ انہوں نے بدرالدین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا تمہارے بارے میں کہ تم پڑھے لکھے نوجوان ہو، میز، کرسی پر بیٹھے ہوئے کتنے اچھے لگ رہے ہو۔''

بدرالدین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''بس جناب! میز، کرسی بڑی ذمے داری کی چیز ہوتی ہے، یہاں ان بیچارے قلیوں نے میرے ساتھیوں نے زبردستی مجھے الیکشن لڑوا کر یونین کا سیکرٹری بنوا دیا لیکن غیاث اللہ صاحب! انسانوں کا بوجھ اٹھانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''بڑی اچھی بات کہی، انسانوں کا بوجھ اگر کوئی اٹھا لے تو میں سمجھتا ہوں اس سے بڑی عبادت کوئی ہو ہی نہیں سکتی لیکن بیٹے بوجھ بھی الگ الگ ہوتے ہیں، میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں، کئی بیٹیوں کا باپ ہوں، بیٹا کوئی نہیں، ایک بیٹے کی آرزو میں نجانے کتنی زندگی گزر چکی ہے، کوشش کرتا ہوں کہ کوئی بیٹوں جیسا ہی مل جائے، مجھے معاف کرنا تمہاری شکل میں یہی دیکھا تھا میں نے اور میرے دل میں یہ آرزو بیدار ہوئی تھی کہ کاش تم میرے بیٹے ہوتے۔''

''میں آپ کے بیٹوں ہی کی طرح ہوں غیاث اللہ صاحب! آپ درحقیقت بہت بڑے آدمی ہیں کہ مجھ جیسے معمولی انسان کو بیٹے کا درجہ دے رہے ہیں۔''

اتنی دیر میں شبیر ٹھنڈی بوتلیں لے آیا اور بدرالدین نے ایک بوتل غیاث اللہ صاحب کو پیش کی اور انہوں نے شکریہ کر کے اسے قبول کر لیا، دوسری بوتل بدرالدین نے اپنے سامنے رکھ لی تھی۔

غیاث اللہ صاحب بولے۔ ''بیٹے! ایک بات بتاؤ گے مجھے تم اس لئے میرا احسان نہیں لینا چاہتے کہ تم نے میرے اوپر احسان کیا تھا؟''

''پہلی بات تو مجھے اسی بات پر اعتراض ہے کہ آپ میری چھوٹی سی کاوش کو اپنے اوپر احسان سمجھتے ہیں۔''

''بیٹے! خدا کرے تمہیں گردے کا درد کبھی نہ ہو، جس چیز کو تم چھوٹی سی کاوش کہہ رہے ہو، وہ میرے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا، اس قدر تکلیف تھی مجھے کہ اگر بروقت تم مدد نہ کرتے تو پتہ نہیں مجھ پر کیا بیتتی، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

''چلئے اچھی بات ہے کہ آپ کو میری چھوٹی سی کاوش پسند آئی۔''

''بیٹے...... کاوش بھی پسند آئی اور تمہارا یہ ہمدردی کا انداز بھی، اب میں تم سے ایک بات کہوں، میری پیشکش قبول کر لو، تم شاد پور کے رہنے والے ہو، میں یہاں سے بہت دور رہتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ کام تو یہاں بہت سے لوگ کرتے ہیں میرے لئے، لیکن تم جیسا ہمدرد انسان جو اتنے پیار سے بے لوث خدمت کر سکتا ہے، شاید مجھے کبھی نہ ملے۔''

''آپ براہ کرم مجھے اس کے لئے مجبور نہ کریں، آپ کو دو باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں تنہا زندگی گزار رہا ہوں، کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔ بس میرے ساتھی قلیوں نے زبردستی مجھے اس سیٹ پر بٹھا دیا تو بیٹھا ہوا ہوں لیکن اس کے بعد میری زندگی میں اور کچھ نہیں ہے۔''

''دیکھو! یہاں میری زمینوں کی دیکھ بھال کرو، ہاریوں کو کنٹرول کرو، میں تمہیں ایک سہولت دے رہا ہوں، تم آدھا دن میرے لئے صرف کرو اور باقی آدھا دن اپنا یونین آفس سنبھالو، مجھے اعتراض نہیں ہو گا، میرا کام سمجھ کر اسے سرانجام دو، میں تمہیں انتہائی معقول معاوضہ دوں گا اس کا۔''

''کیا کروں گا میں اس معاوضے کا جناب......؟'' بدرالدین افسردگی سے بولا۔

''تمہارے ساتھی قلی غریب نہیں ہیں، بتاؤ کیا ان میں سے ایسے نہیں ہوں گے جو تمہاری امداد کے مستحق ہوں، جو اضافی رقم کماؤ، ان پر خرچ کرو، بہت سارے گھرانے ایسے ہوں گے جو مہنگی سبزیاں اور ترکاری نہیں خرید سکتے، میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہو گی کہ تم وہ ترکاری انہیں دو، انسان اپنے لئے ہی نہیں جیتا، کبھی کبھی دوسروں کے لئے بھی کام کرنا پڑتا ہے۔''

''میں غور کروں گا اس بات پر جناب!''

''کیوں غور کر رہے ہو، بتاؤ مجھے بڑی سادہ اور معمولی سی بات ہے۔''

''پھر بھی آپ مجھے تھوڑا سا وقت تو دیں۔''

رحمت علی اس کے پاس پہنچ گیا۔

''رحمت علی...... میں آپ سے بدرالدین کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہیرا ہے اپنا بدرالدین...... ماں تھی ایک بیچارے کی، مرگئی، بی اے پاس کیا ہے اس نے، ماں زندہ رہتی تو شاید شہر میں کہیں نوکری کرتا، ماں کی موت کے بعد بددل ہوگیا، تب سے یہیں پڑا ہوا ہے۔''

''آپ اسے سمجھایئے کہ میری زمینوں کی دیکھ بھال کرلے، بڑا اچھا رہے گا، حیثیت والا بن جائے گا، شادی وادی نہیں کی اس نے؟''

''نہیں، شادی کون کرتا بیچارے کی۔''

''آپ میری مدد کیجئے، اسے سمجھایئے، وہ مان نہیں رہا میری بات کو۔''

''ٹھیک ہے، سمجھادیں گے صاحب جی! بات کریں گے اس سے۔''

☆......☆......☆

بدرالدین جمعرات کو اپنے معمول کے مطابق گڑھی حیدر بیگ پہنچ گیا۔ اسے رات کے سناٹے سے کوئی خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے کوئی خاندان کا فرد خاندان کے درمیان آیا ہو۔ اس نے نظام دین کے خاندان کی تمام قبروں پر اگربتیاں سلگائیں، پھول بکھیرے، پانی ڈالا۔ اب تو بہت سے لوگ اسے دیکھنے لگے تھے لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ بدرالدین کون ہے، کسی سے کوئی تذکرہ نہیں ہوا تھا۔ بدرالدین کو یہاں آکر بہت سکون ملتا تھا۔ تمام کاموں سے فارغ ہوکر وہ جمیلہ کی قبر پر آبیٹھا۔

سارا کھیل احساسات کا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے جمیلہ اس کے سامنے مسکرا رہی ہو پھر اس کے کانوں میں جمیلہ کی آواز ابھری۔

''بدرالدین......!''

''ہاں...... جمیلہ کیسی ہو؟''

''بدرالدین! میرا تم سے رشتہ گہرا ہوتا جارہا ہے۔''

''ہاں جمیلہ...... میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ اب ہم سب اجنبی نہیں رہے، کاش میں بابا کا چہرہ بھی دیکھ سکتا، کاش مجھے احمد دین بھائی کی صورت بھی نظر آتی، کاش میں اماں شریفاں سے بھی مل سکتا اور کاش بھابی حسینہ سے بھی...... مجھے لگتا ہے جیسے یہ سب میرے اپنے ہوں۔''

''ہم سب تمہارے اپنے ہی ہیں بدرالدین!''

''میں مطمئن ہوں، میں زندگی کی آخری سانس تک تمہارے قدموں میں رہنا چاہتا ہوں، میں کوشش کروں گا کہ یہاں مجھے ایک قبر کے لئے جگہ بھی مل جائے، اس سلسلے میں، میں نے کارروائی کا آغاز کردیا ہے۔''

''خدا تمہیں زندہ رکھے، خدا تمہیں لمبی عمر دے۔''

''جمیلہ! برا مت ماننا تمہارے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔''

''ایسی باتیں نہیں کرتے بدرالدین، میں نے تم سے کہا ہے کہ زندگی کو خوشگوار رنگ دو۔''

''اب تم دیکھ لو، میز، کرسی پر بیٹھ کر حرام خوری کرتا ہوں، موٹا بھی ہورہا ہوں، قلی گیری کرتا تھا تو محنت بھی کرنی پڑتی تھی۔''

''جب تم میز، کرسی پر بیٹھ کر کام کرتے ہو تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔'' جمیلہ کی آواز ابھری اور بدرالدین چونک کر دیکھنے لگا۔

''تمہارا مطلب کہ تم وہاں آتی ہو؟''

''ہر سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا بدرالدین! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔''

''جمیلہ میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں، ایک دن ٹرین سے ایک مسافر آیا جس کا نام غیاث اللہ تھا۔'' پھر بدرالدین نے غیاث اللہ کی پوری کہانی جمیلہ کو سنادی۔ اسے یوں لگا جیسے جمیلہ خاموشی سے یہ داستان سن رہی ہو۔

بدرالدین نے کہا۔ ''اور وہ مسلسل میرا پیچھا کئے ہوئے ہے، کہتا ہے کہ میں شاد پور میں اس کی زمینیں سنبھال لوں، جمیلہ! میں کیا کروں گا یہ سب کچھ کرکے، کس کے لئے کرنا ہے مجھے یہ سب کچھ...... میں تو بس اپنی زندگی کے دن گھسیٹ رہا ہوں، میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہاں گڑھی حیدر بیگ آجاؤں، تمہاری قبر کے سامنے ایک کٹیا بنالوں اور باقی زندگی یہیں گزاردوں۔''

''مجھے بدنام کروگے بدرالدین...... حقیقتوں کو کون جانے گا اور کون ان حقیقتوں پر غور کرے گا، پسند کروگے تم اس بات کو کہ لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں، میرا تذکرہ فضول انداز میں کریں۔''

''نہیں جمیلہ! خدا کی قسم نہیں، ایسا کون چاہ سکتا ہے۔''

''تو پھر یہ نہ کرو، مجھے بتایا ہے تو میرا مشورہ بھی مان لوگے؟''

''کہو جمیلہ......!''

''غیاث اللہ کی بات مان لو، وہ اپنی زمینیں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہے، تمہیں نگراں بنانا چاہتا ہے، بن جاؤ، بدرالدین! تمہیں یہ ضرور کرنا چاہئے۔ شاید تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہے کہ یہاں بھی چوہدری سردار علی کی زمینیں ہیں جن پر سبزیاں اور ترکاریاں اگتی ہیں اور چوہدری سردار علی اپنی فطرت کے مطابق یہاں بھی کسی کی زمینوں کو ابھرنے نہیں دیتا، اس نے یہاں بھی اپنی اجارہ داری قائم کررکھی ہے، ان زمینوں پر محنت مزدوری کرکے چوہدری سردار علی کی گردن نیچی کردو، ہم دونوں بہن بھائی تمہاری مدد کریں گے، میں اور بھائی احمد دین زمینوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، ہم تمہیں بتائیں گے کہ ان زمینوں پر سونا کیسے اگایا جاسکتا ہے، دوہرا فائدہ ہوگا اس سے، چوہدری سردار علی کو منہ کی کھانی پڑے گی اور غیاث اللہ کی زمینیں بہت عمدہ ہوجائیں گی، بولو مانوگے میری بات......؟''

بدرالدین سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اس نے بے بس لہجے میں کہا۔ ''تمہاری ہر بات ماننا میری زندگی کا مقصد ہے جمیلہ! بس صرف ایک بات ہے، دل نہیں چاہتا یہ سب کچھ کرنے کو، تمہارا تصور، تمہاری وہ حسین آنکھیں، تمہارا دلکش چہرہ میرے سامنے رہتا ہے جمیلہ! ایک مقصد کے لئے تم شاد پور آئی تھیں، کاش میں دوبارہ تمہیں اسی طرح مجسم دیکھ سکتا۔''

بدرالدین کو یہ محسوس ہوا جیسے جمیلہ سسکیاں لے رہی ہو۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ ''جمیلہ! کیا تم رو رہی ہو؟''

کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ بدرالدین پھر بولا۔ ''خدا کے لئے مجھے معاف کردو، میں نے تمہاری دل آزاری کی ہے جمیلہ! مجھے معاف کردو، میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔''

''زمینوں پر اپنا کام شروع کردو چونکہ ان زمینوں کی آبیاری سے چوہدری سردار علی کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اس کا دل دکھے گا اور ہم اس ظالم کا دل دکھانا چاہتے ہیں، میں اور احمد دین، غیاث اللہ کی زمینوں پر تمہاری وجہ سے آسکیں گے اور اس طرح ممکن ہے کہ کبھی تم سے سامنا بھی ہوجائے۔''

بدرالدین خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ ''اگر یہ بات ہے جمیلہ تو میں فوراً ہی غیاث اللہ سے اقرار کرلیتا ہوں، کاش وہ سب کچھ ہوسکے جو میرے ذہن میں ہے۔''

جمیلہ کی آواز پھر آنی بند ہوگئی تھی۔ بہت دیر تک بدرالدین وہاں بیٹھا رہا اور پھر معمول کے مطابق اٹھ کر وہاں سے شاد پور واپسی کے لئے چل پڑا۔

☆......☆......☆

چوہدری سردار علی حویلی پہنچ گیا۔ اب یہ حویلی، حویلی کہاں رہ گئی تھی، ہر طرف یاس کے بادل چھائے رہتے تھے، بہت سے ملازم حویلی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، چند ایسے تھے جو پشتوں سے یہاں نوکری کرتے چلے آرہے تھے، بس وہی وفاداری نبھا رہے تھے، پر ہر چہرے پر خوف چھایا رہتا تھا۔

چوہدری سردار علی نے حویلی میں قدم رکھا اور غمزدہ لہجے میں بولا۔ ''دنیا کا ہر فرد یہ خیال رکھے کہ بڑے کام کے نتیجے کے لئے کبھی کبھی لمبا انتظار نہیں کرنا پڑتا، یہ نتیجہ جلد ظاہر ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کہیں کا نہیں رہتا، دیکھو کبھی یہ نہ سوچنا کہ کسی پر ظلم کرکے تم ہمیشہ سرخرو رہوگے، نتیجہ نکلتا ہے اور کبھی کبھی ایسا نکلتا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھالا جاتا، ارے صفدر علی کہاں ہے میرا، ذرا اسے بلاؤ۔''

مگر صفدر علی کہاں تھا، حویلی بھائیں بھائیں کررہی تھی۔

''اباجی! آپ اندر چلیں۔'' حیدر علی نے کہا۔

''چلتا ہوں بیٹا! چلتا ہوں، اب کسی سے سر اٹھا کر بات کرنے کی ہمت نہیں رہ گئی ہے میرے اندر، ارے کوئی اللہ کا بندہ مجھے ایسا مل جائے جو مجھے ان روحوں سے نجات دلادے، میں خود جینا نہیں چاہتا پر میری ہری بھری پھلواری کو ایسے تو نہیں ختم ہونا چاہئے، حیدر علی جلدی سے ذرا صفدر علی کو بھیج دو۔''

اور زاروقطار رونے لگا۔

ملازم قریب آگئے تھے۔ ایک عمر رسیدہ ملازم نے جذبات سے بے قابو ہوکر حیدر علی کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔ ''نہ رو حیدر علی انہ رو۔''

''فضلو بابا! کیا کروں، انہیں یہ نہیں معلوم کہ صفدر علی اس دنیا میں نہیں ہے، انہوں نے مقدمے کی تفصیل پڑھ لی تھی، انہیں یہ پتہ ہے کہ صفدر علی زندہ ہے۔''

''حیدر علی! ان سے کہہ دو کہ صفدر علی کسی ضروری کام میں مصروف ہے، کاروبار کی بات کرلو۔''

''ٹھیک ہے، میں فی الحال یہی کرتا ہوں۔'' تب حیدر علی نے باپ سے کہا۔ ''میں آپ کو لینے گیا تھا اباجی تو صفدر علی کاروباری کام سے کہیں نکل گیا، بتا کر بھی نہیں گیا کہ کہاں گیا ہے۔''

''ارے میں تو اس سے ملنا چاہتا تھا۔''

''پہلے تو نہیں تھا نا اباجی کہ آپ اس طرح اچانک یہاں آجاؤ گے۔''

''ہوں......! کب تک آجائے گا وہ؟''

''کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

''فیروزہ کہاں ہے؟''

''اپنے گھر میں ہے۔''

''کہاں...... میکے؟''

''ہاں۔''

''بلوا لواسے، گھر میں تو کوئی رہا ہی نہیں، اب فردوس جہاں بھی چلی گئی، ارے آسیہ اور رحمان علی سے کہو کہ وہی تھوڑے عرصے کے لئے یہاں آجائیں، کیا کریں، کیا نہ کریں۔'' چوہدری سردار علی غمزدہ لہجے میں بولا۔

حیدر علی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بہرحال فوری طور پر یہ صورتحال قابو میں آگئی لیکن دوسرے ہی دن غلام احمد، فیروزہ کے ساتھ حویلی پہنچ گئے۔ وہ تو شکر تھا کہ باہر ہی حیدر علی کی ملاقات ان سے ہوگئی تھی۔ حیدر علی جلدی سے ان کے پاس پہنچ گیا۔ غلام احمد گاڑی سے نیچے اترے تھے۔

''حیدر علی! میں اسے نہیں روک سکا، وہاں میرے گھر اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا، ضد کرنے لگی اور کہنے لگی کہ اگر میں نے اسے یہاں نہ پہنچایا تو وہ خود چلی جائے گی۔''

''فیروزہ بہن! ہم سب تمہارے مجرم ہیں مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک کے جرم کی سزا سب کو ملے فیروزہ! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، غلام احمد صاحب آپ سے بھی جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اباجی کو حاجی حمید خان کے ہاں بھیج دیا تھا تاکہ یہاں کے معاملات میں زیادہ دخل اندازی نہ کرسکیں، برا حال ہوگیا ہے ان کا، صفدر علی کے بارے میں انہیں ساری تفصیل معلوم نہیں ہے، یہاں آتے ہی انہوں نے صفدر علی، صفدر علی کا شور مچانا شروع کردیا، بڑی مشکل سے میں نے یہ کہہ کر ٹالا ہے کہ صفدر علی کسی کاروباری کام سے کہیں گیا ہوا ہے، فیروزہ بہن! آپ یہاں آگئی ہیں، بڑی ڈھارس ہوگئی ہے مجھے، خداوند عالم ہم پر سے یہ مشکل ٹالے، کوئی ایسا سہارا مل جائے ہمیں کہ ہماری توبہ قبول ہوجائے اور ہم بچ جائیں، فیروزہ بہن میں آپ کو کوئی لالچ نہیں دے رہا لیکن یوں سمجھ لیجئے کہ اس خاندان پر اتنا بڑا احسان ہوگا آپ کا جسے ہم میں سے کوئی نہیں اتار سکتا، بس اباجی کا دل ہاتھ میں لے لیں، انہیں یہی بتایا گیا ہے کہ صفدر علی زندہ ہے، آپ اسی کا مظاہرہ کریں۔''

فیروزہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں تو بیوہ ہوچکی ہوں بھائی! کیا رنگین کپڑے اور چوڑیاں پہن کر اباجی کے سامنے آؤں؟''

''فیروزہ بہن! اس وقت حالات کو سنبھالنے کے لئے ہمت بہت ضروری ہے، ہمیں سہارا دے دیجئے، ہم زندگی بھر احسان مانیں گے۔''

فیروزہ نے آنسو پونچھ لئے تھے۔ وہ تیار ہوگئی تو غلام احمد وہیں سے واپس لوٹ گئے۔ بیٹی کو ایک طرح سے موت کے حوالے کرکے گئے تھے۔

فیروزہ، چوہدری سردار علی کے پاس پہنچ گئی۔ چوہدری سردار علی کو دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ یہ شاندار کروفر کا آدمی جس کی گردن میں کبھی خم نہیں دیکھا گیا تھا، اب کس قدر پسماندہ ہوگیا تھا، کیا کیفیت ہوگئی تھی اس کی، دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

فیروزہ کو دیکھ کر وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر جھپٹا اور اس کا سر سینے سے لگا لیا۔ ''میری بچی! خدا تیرا سہاگ ہمیشہ قائم رکھے، خدا ہم سے یہ بُرا وقت ٹال دے، تو آگئی، بڑا اچھا ہوا، دیکھ پوری حویلی خالی پڑی ہوئی ہے، کوئی بھی تو نہیں رہا اس شاندار حویلی میں، جہاں ہر وقت زندگی قہقہے لگاتی تھی، فیروزہ! تجھے معلوم ہے صفدر علی کہاں گیا ہے؟''

فیروزہ نے بمشکل تمام اپنا حلق صاف کیا اور بولی۔ ''اباجی! وہ کسی کاروباری کام سے گئے ہوئے ہیں۔''

''ارے نہیں جانا چاہئے تھا اسے، بھاڑ میں جائیں سارے کاروبار، اتنی دولت ہے میرے پاس فیروزہ! میں تجھے اس کے بارے میں بتادیتا ہوں، فردوس جہاں تو اب اس دنیا میں نہیں رہی، میں تجھے سب بتادوں گا، میں نے اپنی دولت کہاں چھپا کر رکھی ہے، میں تجھے دکھاؤں گا کہ یہاں تہہ خانے میں کتنا کچھ جمع ہے، سب تیرے حوالے، تو اس حویلی کی اصل مالک ہے، کاش آسیہ اور رحمان بھی میری بات مان کر یہاں آجائیں، ہم ان سے بات کرتے ہیں فیروزہ! ایک بار پھر، اس حویلی میں رونقیں زندہ کرو، بیٹا! تم لوگ ہی یہ کام کرسکتے ہو۔''

فیروزہ کے دل پر جو بیت رہی تھی، وہی جانتی تھی لیکن حیدر علی نے اس سے جو درخواست کی تھی، وہ اسے نبھانی تھی۔ صفدر علی تو اب اس دنیا سے جاچکا تھا لیکن فیروزہ کو اس جگہ کے چپے چپے سے محبت تھی جہاں صفدر علی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

بہرحال عارضی طور پر چوہدری سردار علی یہاں آکر سنبھل گیا تھا۔ فیروزہ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا اور فیروزہ بھی اس کے ساتھ کچھ بہتر محسوس کررہی تھی۔ حیدر علی ان دنوں گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک غلام احمد تھے جو اس وقت دل کا سہارا رہ گئے تھے۔ حیدر علی کوشش کررہا تھا کہ کسی بھی طرح کوئی ایسا عمل ہوجائے جس سے روحوں کا انتقام رک جائے۔ بہرحال غلام احمد بھی کیا کرسکتے تھے سوائے اس کے کہ معلومات حاصل کرتے پھر رہے تھے۔ بیٹی ضد کرکے واپس حویلی آگئی تھی، اس لئے وہ اکثر آتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی حیدر علی اور وہ خاموش ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''کیا حال ہے چوہدری صاحب کا؟''

''کیا کہا جاسکتا ہے، اکثر ضد کرنے لگتے ہیں کہ صفدر علی جہاں بھی ہے، اسے تھوڑی دیر کے لئے بلالیا جائے تاکہ وہ اس سے مل لیں، فیروزہ بہن نے بہت کچھ سنبھال رکھا ہے، بڑی صابر خاتون ہیں، پتہ نہیں وقت کیوں لگ رہا ہے، وہ ہم سب کو مار کیوں نہیں دیتے، ہم ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں موت کی سزا سنادی گئی ہے لیکن وقت کا تعین نہیں کیا گیا ہے کہ کونسا وقت ہماری موت کے لئے مناسب ہے، کیا کیا جائے، ایسی کیا تدبیر ہو جس سے ہماری یہ مشکل حل ہوجائے۔''

غلام علی بیچارے افسردگی سے سر ہلانے کے علاوہ اور کیا کرسکتے تھے۔ ایک دن انہوں نے کہا۔ ''ایک بات بتاؤ حیدر علی!''

''جی......؟''

''ہم نے صفدر علی کی قبر کھول کر دیکھی تھی وہ قبر خالی تھی۔''

''جی۔''

''وہ خالی کیوں تھی جبکہ صفدر علی کی باقاعدہ تدفین کی گئی تھی۔''

''اس سلسلے میں، کیا کہہ سکتے ہیں ہم۔''

''مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ آپ یہ بات تو جانتے ہی ہیں کہ یہ روحوں کا کھیل ہے، وہ جہاں بھی چاہیں نظر پھیر سکتی ہیں اور پھر احمد دین نے کھل کر بتادیا تھا کہ وہ صرف نظر کا دھوکا تھا۔''

''ہاں یہ تو ہے، میرے دل میں ایک بات آتی ہے۔''

''کیا......؟''

''قبر کو دوبارہ کیوں نہ کھول کر دیکھا جائے۔''

''فائدہ......؟''

''نہیں بس ایسے ہی دل کی تسلی کے لئے۔''

''نہیں، غلام احمد صاحب! ہم یہ عمل بار بار نہیں کرسکتے۔''

''ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے، چلو اب جو کچھ بھی ہے، دیکھیں گے۔''

اس دن فیروزہ، غلام احمد کے کہنے سے ان کے ساتھ اپنے گھر گئی تھی۔ وہاں اور بھی لوگ تھے جو فیروزہ کے لئے انتہائی غمزدہ تھے اور قائم کیا تھا اور وہاں گیا تھا تو اختر علی نے نہایت بے رخی سے حیدر علی سے کہا۔ ''حیدر بھائی! آپ لوگ نحوستوں کا مسکن ہیں، اب ہمارا آپ سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے، آپ براہ کرم ادھر کا رخ نہ کیا کریں، ہم کسی اور مشکل میں نہیں پڑنا چاہتے۔''

''میں اصل میں فردوس جہاں کے کچھ اثاثے واپس کرنے آیا تھا۔''

''کچھ نہیں چاہئے ہمیں آپ کے منحوس اثاثوں میں سے، آپ براہ کرم چلے جایئے۔'' چنانچہ حیدر علی گردن جھکا کر چلا آیا تھا۔

وہ بھی ایک طرح سے بے قصور ہی تھا۔ بسا بسایا گھر اجڑ گیا تھا، محبت کرنے والی بیوی ساتھ چھوڑ گئی تھی، کاروبار الگ ختم ہوگیا تھا۔ بہت کچھ ڈوب گیا تھا اور باقی ڈوب رہا تھا، اب کچھ کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ فیروزہ ہمت کرکے آگئی تھی تھوڑی سی رونق ہوگئی تھی۔

وہ میکے گئی تھی اور چوہدری سردار علی اپنی حویلی کے بیرونی حصے میں بیٹھا اداس نگاہوں سے ان درختوں کو دیکھ رہا تھا جو خود بخود سوکھتے جارہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے چوہدری سے متعلق ہر جاندار اور بے جان چیز ان روحوں کے عتاب کا شکار ہورہی ہو۔

چوہدری کی دھندلائی ہوئی نظریں اپنی لٹی ہوئی جاگیر کا جائزہ لے رہی تھیں کہ اچانک عقب سے ایک آہٹ سی ابھری اور چوہدری سردار علی کی گردن گھوم گئی۔ پھر وہ خوشی سے چیخ پڑا۔ ''صفدر علی......! میرے لعل، میرے بچے!''

وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلادیئے لیکن صفدر علی کچھ فاصلے پر آکر رک گیا۔

''میرے پاس آمیرے بچے...... کس طرح تڑپ رہا تھا تیرے لئے۔''

''میں صفدر علی نہیں ہوں چوہدری صاحب!''

''ایں......! صفدر علی نہیں ہے، کیا کہہ رہا ہے تو؟'' چوہدری نے کہا اور صفدر علی نے اپنے چہرے سے ایک نقاب سا اتار دیا۔

''میں احمد دین ہوں چوہدری صاحب! آپ صفدر علی کے لئے تڑپ رہے تھے، میرا اباپ بھی اسی طرح میرے لئے تڑپ رہا تھا، ہم نے آپ سے اپیل کی تھی کہ ہمیں قتل کے اس جھوٹے الزام سے بچالیں لیکن آپ نے ہم پر رحم نہیں کھایا۔''

''تو...... صفدر علی نہیں ہے؟'' چوہدری کی ڈوبتی آواز ابھری۔ ''میرا صفدر علی کہاں ہے؟''

''مرچکا ہے وہ اختر علی کے ہاتھوں، میں نے اسی طرح صفدر علی بن کر اختر علی کو سزا سے بچایا تھا کیونکہ وہ آپ کے گھر کا فرد نہیں تھا۔''

''میرا صفدر علی مرچکا ہے؟'' چوہدری کی ڈوبتی آواز ابھری۔ وہ چکرا کر گرنے لگا تھا۔

''ہاں، یہ بات دوسرے لوگوں کو بھی معلوم ہوچکی ہے، یہ سب آپ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔'' احمد دین کی آواز ابھری اور چوہدری کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔

''ہائے میرا صفدر علی!'' وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہوگیا تھا۔ ملازموں نے اسے دور سے دیکھا اور اسی کی طرف دوڑ پڑے۔

☆......☆......☆

اس انوکھی داستان میں کچھ اور کردار بھی تھے جنہوں نے اس خاندان کو برباد کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ دھونی اور راجہ بھی گڑھی حیدر بیگ کے رہنے والے تھے۔ یہ دونوں اوباش قسم کے نوجوان تھے، ہر طرح کا نشہ کرتے تھے، چوری چکاری پیشہ تھا، دونوں کے گھربار تھے لیکن ان سے ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

حیدر علی نے رجب شاہ کو قتل کرنے کے لئے چوہدری سردار علی کے اشارے پر انہیں آمادہ کیا تھا اور ایک بڑی رقم دے کر یہ کام انہی سے کرایا تھا۔ دونوں بے ضمیر تھے، انہیں کبھی اس بات سے واسطہ نہ رہا تھا کہ نظام دین کا خاندان ان کی وجہ سے ختم ہوگیا یا چوہدری سردار علی پر کیا بیت رہی ہے، وہ اس وقت تک مزے سے وقت گزارتے رہے جب تک رقم ان کے پاس رہی۔

آخرکار رقم خرچ ہوگئی اور دونوں مارے مارے پھرنے لگے۔ گڑھی حیدر بخش کا بچہ بچہ انہیں جانتا تھا اور ان سے ہوشیار رہتا تھا، اس لئے وہاں کم ہی ان کی دال گلتی تھی۔ جب کافی دن رقم کے بغیر گزر گئے تو دونوں نے شہر کا رخ کیا تھا۔ وہ ہر طرح کے کام کرلیا کرتے تھے، چنانچہ اس رات وہ ایک گھر کو تاک کر چوری کی نیت سے ان گھر میں گھسے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ گھر ایک نوجوان پولیس انسپکٹر کا ہے۔ پولیس آفیسر جاگ گیا تھا، اس نے پورے اطمینان سے انہیں ان کا کام کرنے دیا اور جب یہ دونوں روانگی کی تیاریاں کرنے لگے تو اس نے انہیں پکڑلیا۔ انسپکٹر نے ان کی خوب چھترول کی اور ان سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

''ہم گڑھی حیدر بیگ کے رہنے والے ہیں سرجی!''

''اوہو...... وہ تو بڑی مشہور جگہ ہے۔''

''ہاں جی، ہماری وجہ سے وہ زیادہ مشہور ہوگئی۔'' دھونی تھوڑا سا بے وقوف تھا۔

''تمہاری وجہ سے کیوں......؟'' انسپکٹر نے سوال کیا مگر اسی وقت راجہ نے اس کی گدی پر ہاتھ رسید کردیا۔

''فضول بکواس کئے جارہا ہے، یہ تو پاگل ہے سرجی!''

انسپکٹر، دھونی کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور پوچھا۔ ''تمہاری وجہ سے گڑھی حیدر بیگ کیوں مشہور ہوئی؟''

''وہ صاحب جی غلطی ہوگئی۔'' دھونی نے کہا۔ تب انسپکٹر کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔

''اصل بات بتاؤ ورنہ جبڑا توڑدوں گا۔'' انسپکٹر نے سختی سے کہا۔

''صاحب جی! غلطی سے منہ سے نکل گیا اور پھر میں نے اکیلے تو یہ کام نہیں کیا تھا۔''

''راجہ بھی تمہارے ساتھ تھا، مجھے معلوم ہے۔''

''راجہ بہت تگڑا ہے، رجب شاہ کو اسی نے قبضے میں کرکے گرایا تھا، میں نے تو بس اسے چھریاں ماری تھیں۔'' دھونی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

انسپکٹر دھک سے رہ گیا تھا۔ یہ تو کسی قتل کا اعتراف ہورہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بے فکر رہو، سزا راجہ ہی کو ملے گی، تم تو پولیس کی مدد کررہے ہو، ہاں تو پھر کیا ہوا، رجب شاہ تو مرگیا ہوگا؟''

''آپ کو پتہ نہیں سرجی! آپ تو پولیس والے ہو، چوہدری صاحب نے دس دس ہزار دیئے تھے ہم دونوں کو اسی کی موت کے بدلے میں، بے چارے احمد دین کو پھانسی کی سزا ملی تھی۔''

انسپکٹر کرید کرید کر دھونی سے تفصیلات پوچھتا رہا اور اس کے اعصاب کشیدہ ہوتے رہے۔ بہت ہی سنسنی خیز انکشاف ہوا تھا۔ اس کیس کو تو زبردست شہرت حاصل ہوئی تھی لیکن اتنا تفصیلی انکشاف پہلی بار ہوا تھا۔

''تم بے فکر رہو دھونی! تم نے جو پولیس کی مدد کی ہے، اس کا تمہیں زبردست انعام ملے گا، یہ بیان تمہیں کئی افسروں کے سامنے دینا پڑے گا۔''

''آپ حکم کروگے صاحب جی تو ضرور دوں گا۔''

''راجہ تمہیں بہکائے بھی تو اس کے بہکائے میں مت آنا اور اس بیان کو مت بدلنا۔''

''وہ مجھ سے تگڑا ہے سرجی! ہاتھ چھٹ بھی بہت ہے، آپ مجھے اس سے الگ رکھنا۔''

''ٹھیک ہے، بے فکر رہو، وہ خود بھی یہی بیان دے گا۔'' انسپکٹر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر بھی دھونی کو راجہ سے الگ لاک اپ میں بند کیا گیا تھا۔ اس کے بعد انسپکٹر نے راجہ کو باقاعدہ ''ڈرائنگ روم'' میں بلالیا۔ ''کڑے جو بندھے ہوئے ہیں تمہیں الٹا لٹکانے کے لئے ہیں اور یہ ہنٹر دیکھ رہے ہو خالص چمڑے کا ہے۔''

''جی سرجی......؟'' راجہ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور بھی سامان ہے یہاں مثلاً اس سے ناخن اکھاڑے جاتے ہیں، اس سے بدن جلایا جاتا ہے، سوچ لو یہ محنت کرانی ہے ہم سے یا شرافت سے زبان کھولوگے؟''

''مجھے پتہ ہے سرجی! اس نے آپ سے بہت سی فضول باتیں کی ہوں گی۔'' راجہ نے کہا۔

''فضول نہیں، اس نے ایک ایک بات سچ کہی ہے، اب تم بھی زبان کھول دو۔'' راجہ نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ اس نے یہی بتایا کہ حیدر علی اور چوہدری سردار علی نے انہیں دس دس ہزار روپے دے کر رجب شاہ کو قتل کرایا تھا اور الزام احمد دین پر ڈال دیا تھا۔

انسپکٹر اپنے افسر اعلیٰ سے ملا اور اس نے پوری تفصیل اس کے گوش گزار کی۔ ایس پی کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ''ہرچند کہ ایک بے گناہ موت کے گھاٹ اتر چکا ہے اور ایک خاندان زندہ درگور ہوگیا، ان کی روحیں خبروں کے مطابق چوہدری خاندان سے بدترین انتقام لے رہی ہیں لیکن بات پولیس کے علم میں آئی ہے، اصل قاتل بھی منظر عام پر آئے ہیں اس لئے پولیس اپنا فرض پورا کرے گی، نفری تیار کرو، ہم شاد پور چل رہے ہیں۔''

(جاری ہے)

صفحہ نمبر:......1

خوف

ایم اے راحت — قسط : 9

پولیس کی بھاری نفری ایس پی شیر علی اور انسپکٹر عبدالعزیز کی سرکردگی میں شاد پور پہنچ گئی۔ چوہدری سردار علی کی حویلی پر شاید پولیس کا یہ پہلا ریڈ تھا قرب وجوار کے لوگ جمع ہو گئے اور تبصرہ آرائی کرنے لگے۔ ایس پی حویلی کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہو گیا، اندر اطلاع پہنچ چکی تھی، حیدر علی باہر نکل آیا اور پریشان نگاہوں سے پولیس کے اعلیٰ افسران کو دیکھنے لگا۔ ایس پی شیر علی نے حیدر علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''حیدر علی صاحب! میں چوہدری سردار علی اور آپ کو رجب شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آیا ہوں، ہمارے پاس آپ دونوں کے وارنٹ موجود ہیں، آپ براہ کرم چوہدری صاحب کو باہر لے آئیے۔''

''یقیناً آپ کے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہوگا جس کی بنیاد پر ہم قاتل قرار دیئے گئے ہیں؟''

''یقیناً اور یہ ثبوت عدالت میں پیش کئے جائیں گے، آپ براہ کرم ہماری ہدایت پر عمل کیجئے، پولیس اپنا فرض پورا کرنا چاہتی ہے۔''

''ہماری حیثیت جانتے ہیں آپ؟'' حیدر علی نے کہا۔

''حیدر علی صاحب آپ دھمکی آمیز بات نہ کیجئے، آپ اپنی ساری حیثیتوں کا تعین بعد میں کر لیجئے گا، آپ فی الحال کسی ایسے ملازم کو آواز دیں جو اندر سے چوہدری سردار علی صاحب کو لے کر آجائے۔''

''آپ مجھے ایک فون کرنے کی اجازت تو دیں گے؟''

''ابھی نہیں، یہ سب کچھ آپ پولیس اسٹیشن جا کر ہی کر سکتے ہیں، ہم آپ کو اندر جانے کی اجازت بھی نہیں دیں گے۔'' ایس پی شیر علی نے کھردرے لہجے میں کہا اور حیدر علی نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلادی۔ سامنے کھڑے ہوئے ملازم کو اس نے اشارے سے پاس بلایا اور بولا۔

''اباجی سے کہو کہ باہر آجائیں۔''

ملازم اندر چلا گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد چوہدری سردار علی باہر آیا اور پولیس کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔

''آئیے اباجی، ایس پی صاحب آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

چوہدری سردار علی آگے بڑھ آیا۔ اب اس قدر دیوانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ پولیس کی آمد کی وجہ کو نہ سمجھ سکتا، فوراً ہی محتاط ہو گیا۔

''جی ایس پی صاحب! فرمایئے؟''

''چوہدری سردار علی صاحب! آپ کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہے۔''

''چلو بھائی، ہتھکڑیاں ڈال کرلے جاؤ گے یا ایسے ہی؟''

''نہیں، ہم آپ کو ہتھکڑیاں نہیں لگائیں گے۔''

حیدر علی اور چوہدری سردار علی کو پولیس کی گاڑی میں بٹھایا گیا، دونوں کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا اور ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ حیدر علی نے کہا۔ ''کیا اب بھی آپ مجھے فون کرنے کی اجازت نہیں دیں گے؟''

''ہاں ضرور، یہ آپ کا حق ہے حیدر علی صاحب!'' انسپکٹر عبدالعزیز نے کہا اور وہ موبائل فون حیدر علی کو واپس کر دیا گیا جو حویلی میں اس سے لے لیا گیا تھا۔ حیدر علی نے سب سے پہلے رحمان علی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا ہے اور وہ اس وقت شہر کے پولیس لاک اپ میں ہیں۔

''بڑے چوہدری صاحب بھی......؟'' رحمان علی حیرت سے بولا۔ حیرت کی وجہ یہ تھی کہ چوہدری سردار علی بڑے تعلقات والا آدمی تھا اور پولیس کا اس پر ہاتھ ڈال دینا ایک حیران کن عمل تھا۔ حیدر علی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ہاں میرا خیال ہے انہیں اپنے عہدے بڑے لگ رہے ہیں، گرفتار تو کر لیا ہے انہوں نے ہمیں لیکن اس کے بعد انہیں اس کا جو خمیازہ بھگتنا پڑے گا، وہ دیکھنے کے قابل ہوگا۔''

ایس پی شیر علی اس وقت سامنے ہی موجود تھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر حیدر علی سے موبائل چھین لیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ''اب بھی کس بل نہیں نکلے تم لوگوں کے، تمہی جیسے لوگ ہوتے ہیں جن کا گناہ سر چڑھ کر بولتا ہے، کیا سمجھتے ہو تم لوگ اپنے آپ کو؟''

''ایس پی! موبائل مجھے واپس کر دو۔'' حیدر علی کو بھی غصہ آگیا۔

''شامت آئی ہے تمہاری تو دوسری بات ہے حیدر علی! میرا نام شیر علی ہے سمجھے!''

''بہت سے شیر دیکھے ہیں ہم نے۔'' حیدر علی نے جواب دیا۔

ایس پی نے غصے میں آکر حیدر علی کے تھپڑ مار دیا۔

''پولیس لاک اپ میں تم نے یہ عمل کیا ہے، میرے گھر یا میرے ڈیرے پر چل کر یہ کر کے دیکھو ایس پی! میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا لیکن میرے آدمی......! خیر چھوڑو یہ تو بعد کی باتیں ہیں، میرا موبائل مجھے واپس کردو۔''

ایس پی نے موبائل کو دیوار میں دے مارا اور اس کے بعد اس نے انسپکٹر عبدالعزیز سے کہا تھا۔ ''کوئی رعایت نہیں ہونی چاہئے ان کے ساتھ!''

''یس سر......!'' انسپکٹر نے سیلوٹ مار کر کہا۔

☆......☆......☆

رحمان علی اور غلام احمد، نبیل احمد ایڈووکیٹ کے ساتھ تھانے پہنچے تھے۔ ایس پی شیر علی سے ملاقات ہوئی تو شیر علی نے کہا۔ ''بہت ہی گھناؤنا کردار ہے ان باپ، بیٹوں کا، انہیں رجب شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے، یہ قتل انہوں نے دو کرائے کے قاتلوں سے کرایا تھا۔''

نبیل احمد نے ساری تفصیل معلوم کی اور ان کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔

''ہم ملنا چاہتے ہیں چوہدری سردار علی صاحب سے۔''

''آپ ضرور ملئے ان سے لیکن انہیں سمجھا دیجئے گا کہ ان کی بدزبانی کا انجام ان کے حق میں اچھا نہیں نکلے گا۔''

''کیا انہوں نے ایسا کوئی عمل کیا ہے؟''

''ہاں، اپنی اسی شان وشوکت کا تذکرہ کر رہے ہیں جو اب ملیامیٹ ہو چکی ہے۔'' ایس پی شیر علی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

لاک اپ میں چوہدری سردار علی اور حیدر علی موجود تھے۔ چوہدری سردار نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم اتنے بے بس اور بے کس بھی نہیں ہیں، آج تک جو ہوا ہے، اس پر خوف زدہ رہے ہیں لیکن اب جو کچھ ہوگا، وہ دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے، حیدر علی سے موبائل چھین لیا گیا ہے، میں کچھ لوگوں کو فون کرنا چاہتا ہوں، مجھے موبائل مہیا کیا جائے۔'' چوہدری سردار علی نے کہا۔

''میں ایس پی سے بات کرتا ہوں چوہدری صاحب! آپ بالکل بے فکر رہیں، جو کارروائی کی گئی ہے، ہم اس کا بھرپور طریقے سے جائزہ لیں گے۔''

''اور میں لاک اپ میں سڑتا رہوں گا، ارے اب یہ عزت رہ گئی ہے میری......!''

سب کی آنکھوں میں طنزیہ تاثرات پیدا ہو گئے تھے لیکن کسی نے احتراماً کوئی ایسا لفظ نہ کہا جو چوہدری سردار علی کے لئے ناگوار ہوتا۔ لاک اپ سے ہٹنے کے بعد نبیل احمد نے کہا۔ ''بات بڑی الجھی ہوئی ہے غلام احمد صاحب......! چوہدری صاحب جو زندگی گزار چکے ہیں، وہ نہیں بھول سکتے لیکن وقت ان کے خلاف ہے، پولیس سے الجھنا مناسب نہیں ہے، کسی طور انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کریں۔''

''کون کیا کوشش کرے، سمجھ میں نہیں آتا۔''

''میں ان لوگوں سے ملاقات کرنا چاہتا تھا جنہوں نے رجب شاہ کے قتل کا اعتراف کیا ہے اور اس کا محرک حیدر علی اور سردار علی کو قرار دیا ہے لیکن چوہدری صاحب نے ایس پی سے جھگڑا مول لے لیا ہے اس لئے ممکن ہے وہ مجھے ان سے نہ ملنے دے تاہم میں موبائل کے لئے کوشش کرتا ہوں۔''

ایس پی شیر علی نے اندازے کے مطابق بڑی رکھائی سے منع کر دیا اور کہا۔ ''ویسے تو ملزمان اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں لیکن قانون کے علم میں جو کچھ آیا ہے، اس کی تفتیش ضروری ہے، چوہدری صاحب بااثر آدمی ہیں، ہم اپنی تفتیش مکمل ہونے تک اپنے کام میں مداخلت نہیں چاہتے۔''

''ٹھیک ہے ایس پی صاحب......لیکن براہ کرم ان کے ساتھ کوئی سختی نہ کریں، میں بہت جلد وکالت نامہ پیش کر دوں گا، یہ سب کچھ بھی میں ایک وکیل کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں اور رحمان علی میرے گواہ ہیں اس کے علاوہ بھی ہمارے اور آپ کے درمیان قانون کا رشتہ ہے جو ان حالات کے علاوہ بھی بہت دور تک چلے گا۔''

''آپ اطمینان رکھئے، آپ کو ہم سے اور کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

یہ دونوں پولیس اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ غلام احمد نے کہا۔

''صورتحال کافی سنگین ہے رحمان علی، یہ لوگ اس قتل کے سلسلے میں تفتیش کرتے ہوئے تشدد بھی کر سکتے ہیں، حیدر علی اور چوہدری صاحب کا رویہ پولیس کے ساتھ برا نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ اس کا آغاز کر چکے ہیں۔''

''ایک نام میرے علم میں ہے، حکومت کی بہت بڑی شخصیت ہے، ایک دفعہ میں اپنی بیوی کے ساتھ ان کے ہاں ڈنر میں گیا تھا، چوہدری صاحب بھی وہاں آئے تھے، اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے تعلقات بہت اچھے ہیں اور وہ شخصیت معمولی نہیں ہے، میں آپ کو لے کر ان کے پاس جاؤں گا اور صورتحال بتاؤں گا، ہو سکتا ہے اس سلسلے میں کوئی مدد ہو سکے۔''

''یہ کام آپ فوراً کیجئے تاکہ چوہدری صاحب یا حیدر علی پر کوئی جسمانی تشدد نہ ہو سکے، بعد میں ہم دیکھ ہی لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔''

''میں فوراً اس کا انتظام کرتا ہوں۔'' رحمان علی نے کہا۔

☆......☆......☆

بدرالدین کی دنیا اب صرف گڑھی حیدر بیگ کا قبرستان ہو گئی تھی۔ ہر جمعرات کو بڑی چاہت کے ساتھ وہ گڑھی حیدر بیگ جاتا تھا اور وہاں قبرستان میں جا کر جو کچھ کرتا تھا، دیکھنے والے اسے دیکھ کر کافی متاثر ہوتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے بدرالدین سے پوچھا بھی تھا اس بارے میں تو بدرالدین نے بڑے پیار سے جواب دیا تھا۔ ''ہاں، یہاں میرا خاندان ہے، میرے سارے اپنے یہیں سو رہے ہیں بس میری ماں شاد پور میں ہے، میں وہاں بھی جاتا رہتا ہوں۔''

''چوہدری نظام دین سے تمہارا کیا رشتہ تھا بھائی......؟''

''اس دنیا میں محبت کا جو سب سے مضبوط رشتہ ہوتا ہے نا وہ میرا چوہدری نظام الدین اور ان کے خاندان سے ہے۔''

''خدا تمہیں اس خدمت کا اجر دے گا۔''

جمیلہ کی ہدایت پر اب بدرالدین کو غیاث اللہ کا انتظار تھا۔ غیاث اللہ اپنے گھر گیا ہوا تھا، اس کی یہاں آمد کا کوئی دن مقرر نہیں تھا، کبھی بھی یہاں کی زمینوں کو دیکھنے آجاتا تھا۔

غیاث اللہ ایک دن اچانک ہی ٹرین سے اترا اور یہ بھی اتفاق تھا کہ بدرالدین سامنے ہی موجود تھا۔ غیاث اللہ نے بھی بدرالدین کو دیکھ لیا اور مسکراتا ہوا اس کے پاس آگیا۔

''کہو بدرالدین! کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں جناب! آیئے چائے وغیرہ پی لیجئے میرے ساتھ۔''

غیاث اللہ بغیر کسی عذر کے بدرالدین کے ساتھ یونین آفس میں آ بیٹھا تھا۔

''دل تو چاہتا ہے بدرالدین کہ تمہارے ساتھ ایک مضبوط رشتہ قائم کروں لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ میری یہ پیشکش تم نے قبول نہیں کی جبکہ یہ محض ایک عقیدت مندانہ پیشکش تھی، عقیدت مندانہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اصل میں میرا کوئی بیٹا نہیں ہے، جیسا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بھروسہ اپنی اولاد پر کیا جا سکتا ہے یا پھر کسی ایسی شخصیت پر جو تمہاری طرح دل میں جا بیٹھے، یہی سوچ کر میں نے تم سے کہا تھا کہ اب اس عمر میں جو جدوجہد میں کر رہا ہوں، یہ جدوجہد میری اپنی بیٹیوں کے لئے ہے، اگر اس میں مجھے کسی کا سہارا حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہو، ملنے کو تو بہت سے لوگ مل جاتے ہیں لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں جو دل کو چھو لیں۔''

''عجیب سی بات کہی ہے آپ نے غیاث اللہ صاحب، کیا کروں اور کیا نہ کروں۔'' بدرالدین نے کہا۔

''اگر کرنا ہی چاہتے ہو تو وہ کرلو جو میں نے کہا ہے۔''

''مگر میرا کوئی تجربہ نہیں ہے اس سلسلے میں۔''

''ایک ایک بات بتاؤں گا میں تمہیں۔'' غیاث اللہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔

بدرالدین نے گردن جھکا لی۔ چائے آگئی تھی۔ غیاث اللہ پرامید نگاہوں سے بدرالدین کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''اور بدرالدین! اگر پسند کرو تو میرے ساتھ چلو، میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج میری آرزو پوری ہو جائے گی، دیکھو میں یہ بالکل نہیں کہتا کہ تم یہ یونین آفس چھوڑ دو، بس کچھ گھنٹے میرے لئے مخصوص کر دو باقی اپنی یہاں کی زندگی بھرپور طریقے سے گزارو۔''

''ٹھیک ہے چلئے۔'' بدرالدین نے کہا اور غیاث اللہ نے جلدی سے چائے کا بڑا سا گھونٹ لے کر اپنی پیالی خالی کر دی اور بولا۔ ''چلو اٹھو۔''

بدرالدین پہلے بھی اس علاقے میں آچکا تھا لیکن آج اس نے گہری نگاہوں اور نئے انداز کے ساتھ ان سرسبز وشاداب زمینوں کو دیکھا اور غیاث اللہ سے پوچھا۔ ''یہاں چوہدری سردار علی کے سبزیوں کے کھیت بھی تو ہیں۔''

''وہ سامنے جو نظر آرہے ہیں، وہی ہیں کافی محنت ہوتی ہے یہاں ان کھیتوں پر، ان کی سبزی ہماری سبزی سے کہیں اچھی ہوتی ہے لیکن بدرالدین! جانتے ہو ایسا کیوں ہوتا ہے، چوہدری صاحب ذرا دوسرے مزاج کے آدمی ہیں، تم نے گڑھی حیدر بیگ کے واقعات کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا، وہاں جو کچھ ہوا ہے، اس کا تمہیں بخوبی اندازہ ہوگا، ایک خاندان ہی ختم ہو گیا ہے، چوہدری سردار علی کی زمینوں سے اچھی سبزی پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی زمینیں برباد کروالی جائیں، میں نے ہاریوں کو خصوصی ہدایت کی ہے، بے شک محنت کریں لیکن چوہدری صاحب کے مقابلے کی کوشش نہ کریں۔''

بدرالدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ''اور اب یہ زمینیں میری نگرانی میں ہوں گی۔''

''ہاں لیکن اسی ہدایت کے ساتھ!''

بدرالدین مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ بہرحال یہ جمیلہ ہی کی خواہش تھی چنانچہ بدرالدین نے ان زمینوں کی نگرانی قبول کر لی اور غیاث اللہ بے حد خوش ہوا۔

اگلی جمعرات کو بدرالدین گڑھی حیدر بیگ کے قبرستان میں پہنچا تو اسے یوں لگا جیسے کچھ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہوں۔

''تم نے بہت صحیح فیصلہ کیا ہے، اپنے آپ کو مستحکم کرو اور بے فکر رہو، اب ان زمینوں کے نگراں ہم ہیں، کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کسی کو۔'' جمیلہ کی آواز سنائی دی۔

''بدرالدین! میں تمہیں بتاؤں گا کہ کس طرح ان زمینوں سے سبزی کی جگہ سونا اگایا جا سکتا ہے، ایسی فصلیں ہوں گی کہ دیکھنے والے دور دور سے آیا کریں گے۔'' یہ احمد دین کی آواز تھی۔

نظام دین نے کہا۔ ''بیٹے! کاش ہم زندگی میں ملے ہوتے تو ہم تمہیں وہ درجہ دیتے کہ دنیا دیکھتی۔''

''میں آپ سب کی محبت سے سرشار ہوں، مجھے اور کچھ نہیں چاہئے بس یہی میری زندگی کی معراج ہے۔''

یہ سب کچھ ذہنی طور پر ہو رہا تھا۔ یہ الفاظ کسی کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے نہ خود بدرالدین نے اپنے منہ سے وہ سب کچھ کہا تھا جو اس کے دل اور دماغ نے سوچا تھا۔ یہ اس دنیا کی سب سے انوکھی کمیونیکیشن تھی۔

بدرالدین خوش خوش واپس آیا تھا اور اس کے بعد غیاث اللہ کے ساتھ ہاریوں سے ملاقات کی تھی اور نئے سرے سے ان کھیتوں کی تزئین شروع کر دی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ غیر مرئی قوتیں اس کے شانہ بشانہ ہوں۔ خاص طور سے جمیلہ کی بھینی بھینی خوشبو اسے اپنے ساتھ ساتھ چلتی محسوس ہوتی تھی جسے اس نے پہلی بار ریلوے اسٹیشن پر اس وقت محسوس کیا تھا، جب جمیلہ ایک برقعے میں لپٹی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔

☆......☆......☆

چوہدری کو موبائل فون نہیں ملا تھا اور اس سلسلے میں اسے کوئی تفصیل بھی نہیں بتائی گئی تھی۔ ادھر حیدر علی کو ایک دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا، اس پر بھی حیدر علی نے بڑا احتجاج کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا بوڑھا باپ بیمار ہے، وہ تنہا نہیں رہ سکے گا لیکن اس سلسلے میں ان کی کچھ نہیں سنی گئی تھی۔

ادھر رحمان علی نے کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا تھا، خاص طور سے چوہدری چونکہ پرہیزی کھانا کھاتا تھا۔ اس سلسلے میں رحمان علی نے کچھ لوگوں کو مخصوص کیا تھا اور انسپکٹر عبدالعزیز سے بات کر کے یہ درخواست کی تھی کہ انہیں کم از کم پرہیزی کھانا دینے کی اجازت دی جائے۔ عبدالعزیز ایک شریف آدمی تھا، اس نے درگزر سے کام لیا۔

چوہدری کے لئے بہت ہی عمدہ اور نفیس برتن میں دلیہ بھجوایا گیا لیکن چوہدری نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ پہلے اسے موبائل فون مہیا کیا جائے، اگر ایسا نہیں کیا گیا تو وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ حیدر علی نے البتہ دوسرے لاک اپ میں کھانا لے لیا تھا اور شاید اسے کھا بھی لیا تھا۔

رات کا وقت تھا اور چوہدری سردار علی لاک اپ میں ایک کمبل پر بیٹھا ہوا دیوار سے ٹیک لگائے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ زندگی بڑی شان سے گزاری تھی لیکن اب یہ لمحے اسے بڑے شاق گزر رہے تھے، اسے اپنے وہ تمام دوست یاد تھے جنہیں اگر یہ علم ہو جائے کہ چوہدری لاک اپ میں رات گزار رہا ہے تو وہ زمین آسمان ایک کر دیں لیکن وہ اس سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ان دونوں سنتریوں کو دیکھا جو لاک اپ کے سامنے گشت کر رہے تھے۔ پہلے بھی وہ دو تین بار ادھر سے گزر چکے تھے لیکن چوہدری نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت ماحول بالکل سنسان اور خاموش ہو گیا تھا، کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں اور چوہدری گزرے ہوئے وقت پر غور کر رہا تھا۔ دونوں سنتری لاک اپ کے سامنے رک گئے۔ چوہدری نے رکنے والے سنتریوں کو دیکھا اور پھر اچانک ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے یہ دونوں چہرے جانے پہچانے محسوس ہوئے تھے مزید تصدیق کرنے کے لئے وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور لاک اپ کی سلاخوں کے پاس پہنچ گیا۔ جیل کے سنتریوں کے لباس میں وہ نظام دین اور اس کا بیٹا احمد دین ہی تھے، دونوں اسے دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔

تب نظام دین کی آواز ابھری۔ ''کیسے ہو چوہدری! مزے کر رہے ہو نا، آرہا ہے نا مزہ......؟''

چوہدری پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے پیروں کی جان نکل گئی تھی، وہ بولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''وقفہ کر دیا ہے چوہدری تھوڑا سا، اس طرح کے کام ذرا مزے لے لے کر کرنے چاہئیں اور ستاؤ کیا ہو رہا ہے، پہلے تو کبھی پولیس کے چنگل میں نہیں آئے، اب دیکھو نا تمہاری عزت کتنی بڑھ گئی ہے، کہاں چوہدری سردار علی، ہزاروں ایکڑ زمین کے مالک، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے والے اور اب دو کوڑی کے آدمیوں کی طرح لاک اپ میں پڑے ہوئے ہو، ارے واہ چوہدری واہ، کیسی عجیب بات ہے۔''

اچانک ہی چوہدری کے پورے بدن میں گرم گرم لہریں اٹھنے لگیں۔ اس نے نظام دین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس مرنے کے بعد تمہارا یہی کام رہ گیا ہے نظام دین! ہم نے تو نہیں مارا تمہیں، تم نے خود ہی اپنی ہتھیا کی تھی اور بگاڑ لو ہمارا جو بگاڑنا چاہتے ہو، حد ہو چکی ہے ڈر اور دہشت کی، موت تو آنی ہے نا ایک دن تمہارے ہاتھوں آجائے گی تو کیا ہوگا۔''

''وہ تو آنی ہی ہے۔'' نظام دین نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر اس نے احمد دین کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ چوہدری سلاخیں پکڑے کھڑا رہا اور پھر اس نے اچانک ہی رونا شروع کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

نبیل احمد، رحمان علی اور غلام احمد نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا تھا۔ ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت جس کا چوہدری سردار علی سے گہرا تعلق رہا تھا، اس سلسلے میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔ رحمان علی ان سے ملا اور ملنے کے بعد اس نے تمام تر صورتحال بتائی۔ چنانچہ فوراً ہی کارروائی شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے ایس پی شیر علی کو اس بڑی سیاسی شخصیت کا فون موصول ہوا اور اسے ہدایت کی گئی کہ چوہدری سردار علی اور حیدر علی کو لاک اپ میں ذرہ برابر کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ ان کے وکیل نبیل احمد کو ہر طرح کی سہولت مہیا کی جائے۔

نبیل احمد اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس نے سب سے پہلے دھونی اور راجہ سے ملاقات کی۔ وہ دونوں بھی پولیس کی تحویل میں تھے۔ نبیل احمد نے ان سے معلومات حاصل کی۔ دھونی اور راجہ نے سادگی سے وہی الفاظ دہرا دیئے جو انہوں نے پولیس کے سامنے ادا کئے تھے، یعنی یہ کہ انہوں نے رجب شاہ کو قتل کیا لیکن چوہدری سردار علی اور رحمت علی صاحب کے حکم پر اور اس کا انہیں معاوضہ بھی ملا۔

نبیل احمد نے ان کا کیس تیار کر لیا۔ جب عدالت میں پہلی بار چوہدری سردار علی کی پیشی ہوئی تو ہر طرح کے انتظامات کر لئے گئے تھے۔ نبیل احمد نے یہ موقف اختیار کیا کہ دھونی اور راجہ آوارہ قسم کے نوجوان ہیں، وہ نشہ بھی کرتے ہیں اور نشے میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔

چوہدری سردار علی نے بتایا تھا کہ بستی حیدر بیگ میں ان کا ڈیرہ ہے اور یہ دونوں نشئی ان کے ڈیرے کے آگے پڑے رہا کرتے تھے، کبھی کبھی چوہدری صاحب انہیں کچھ دے دیا کرتے تھے لیکن پچھلے دنوں چونکہ چوہدری صاحب خود مصیبت اور عذاب میں گرفتار تھے، یہ دونوں نشئی ان کے پاس آئے تو انہوں نے انہیں دھتکار دیا اور یہ انہیں دھمکیاں دیتے ہوئے چلے گئے، یہ بیان ایک انتقامی جذبے کے تحت دیا گیا ہے، کوئی بھی گواہ ایسا نہیں ہے جس نے یہ دیکھا ہو کہ چوہدری صاحب نے ان لوگوں سے کچھ کہا ہے چنانچہ صرف دو ایسے لوگوں کی گواہی کا الزام بالکل بے مقصد ہے جو نشے باز ہوں۔

دوسری پیشی پر چوہدری سردار علی اور حیدر علی کی ضمانت ہو گئی۔ رحمان علی اور غلام احمد انہیں لے کر واپس بستی شاد پور پہنچ گئے۔ چوہدری سردار علی کی کیفیت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ گھر میں فیروزہ تھی، حیدر علی بھی تھک ہار گیا تھا، اس کی زندگی میں کچھ نہیں رہا تھا۔

تین مہینے گزر گئے۔ اس دوران یہ لوگ کسی نئے حادثے کے منتظر رہے لیکن کچھ نہ ہوا۔ حیدر علی نے اس دن چوہدری سردار علی سے کہا۔ ''ابا جی! میرا دل اب یہاں بستی شاد پور میں نہیں لگتا، شہر میں بھی سارا کام برباد ہو کر رہ گیا ہے، کیا خیال ہے آپ کا، کہیں ملک سے باہر نہ نکل چلیں؟''

''ایک بات میرے دل میں بار بار آتی ہے حیدر علی!''

''جی کہیے۔''

''برا مت ماننا بیٹا! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم تھکے ہوئے لوگ ہیں، ہمارے پاس اب کرنے کے لئے کچھ رہ نہیں گیا، فردوس جہاں تو اس دنیا سے چلی ہی گئی ہے، ادھر صفدر علی بھی ہمیں داغ مفارقت دے چکا ہے، اگر میں تمہاری شادی فیروزہ سے کردوں تو کیسا رہے، اچھی لڑکی ہے، ہمارا ساتھ بھی دے رہی ہے، غلام احمد بھی شریف آدمی ہیں، تم فیروزہ سے شادی کرلو پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں، موقع ہوا تو ملک سے باہر چلیں گے۔''

''اباجی! بہت سی باتیں کی ہیں آپ نے لیکن یہ سب سے بڑی بات ہے، وہ میرے چھوٹے بھائی کی بیوی رہی ہے، میں نے اسے اپنے گھر میں ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اب...... انہیں اباجی! ہوتا ہے اس دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے لیکن میں یہ سب کچھ نہیں کرسکتا۔''

چوہدری سردار علی ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا تھا۔ بہرحال فیروزہ بڑی استقامت سے ان لوگوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ چوہدری کے مزاج میں کوئی بڑا فرق نہیں آیا تھا، کبھی کبھی اس کی اصل شخصیت پھر سے ابھر آتی تھی اور اس دن بھی وہ حیدر علی کو ساتھ لے کر یونہی دل گھبرانے کی بات کہہ کر گھر سے باہر نکل آیا تھا۔

اس کی جیپ شاد پور کے نواحی علاقوں کا سفر کررہی تھی کہ اچانک اس نے سبزیوں کا ایک کھیت دیکھا جس میں شاندار سبزی لہلہا رہی تھی۔ چوہدری نے ایک دم گاڑی رکوادی۔

''یہ کس کے کھیت ہیں؟''

''باہر کا بندہ ہے کوئی، غیاث اللہ نام ہے۔''

''اور وہ ہمارے کھیت ہیں، یار حیدر علی، یہ میرے منہ پر ہمیشہ جوتے کیوں پڑتے رہتے ہیں، کبھی ہمارے کھیتوں میں ایسی سبزی پیدا ہوئی، یہ غیاث اللہ کون ہے اور اس کی کیا مجال ہوئی کہ اس نے اپنی زمینوں پر اتنی محنت کی؟''

''اباجی! اس سے آپ کی ملاقات تو ہے۔''

''ہوسکتا ہے ہوئی ہو، ہم کسی ایرے غیرے کو کب یاد رکھتے ہیں، یہ تو غلط ہے، دیکھو کیسے کھیت لہلہا رہے ہیں، ذرا چلو اپنی زمینوں کی طرف......!''

حیدر علی نے ایک گہری سانس لے کر باپ کو دیکھا اس کے دل میں فوراً ہی یہ خیال آیا تھا کہ شاید کوئی نئی کہانی شروع ہونے جارہی ہے۔ وہ اپنی زمینوں کی طرف چل پڑا۔ یہاں بھی سبزی بہت اچھی ہورہی تھی لیکن جمیلہ اور احمد دین کی مدد سے بدرالدین نے جو فصل اگوائی تھی، اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

چوہدری سردار دیر تک اپنی زمینوں کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس نے حیدر علی سے کہا۔ ''بلاؤ ان کتوں کو جو ہماری زمینوں پر کام کرتے ہیں، ان کو بتاؤ کہ ادھر دیکھیں۔''

''ایک بات کہوں اباجی......؟'' حیدر علی بولا۔

''ہاں بولو۔''

''اباجی اب بھی آپ کو صبر نہیں آیا، کون کون چلا گیا آپ کو یاد ہے، میری بہن نور جہاں، بھائی صفدر علی اور میری بیوی فردوس جہاں...... اباجی! اب بھی آپ وہ کھیل نہیں چھوڑیں گے جو آپ نے زندگی بھر کھیلا ہے؟''

چوہدری سردار علی خونی نگاہوں سے بیٹے کو دیکھنے لگا پھر رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔

''تو ٹھیک کہتا ہے، پتہ نہیں کمبخت کونسا دل دھڑکتا ہے میرے سینے میں، کبھی کوئی ڈھنگ کی بات ہی نہیں کی، حیدر علی! تو ٹھیک کہتا ہے، چل واپس چلیں، اللہ کی زمین ہے، وہ جس کو جو دینا چاہتا ہے، وہی دیتا ہے، ہم کیا بگاڑ سکتے ہیں کسی کا، چل یار! واپس چل، غلطی ہوگئی، ایک بار پھر دماغ بہکنے لگا تھا۔''

حیدر علی نے جیپ واپس مڑوادی تھی۔

☆......☆......☆

کئی مہینے گزر گئے تھے۔ اخبارات بھی اب خاموش ہوچکے تھے۔ ادھر جو لوگ چوہدری کے خاندان میں پیش آنے والے واقعات سے بھرپور دلچسپی لینے لگے تھے، وہ بھی اب اس طرف سے غافل ہوگئے تھے لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

چوہدری سردار علی راتوں کو جاگتا رہتا تھا۔ نظام دین اور اس کے بیٹے سے اس کی آخری ملاقات تھانے کے لاک اپ میں ہی ہوئی تھی اور وہ کہہ کر گئے تھے کہ اب اس کھیل میں کچھ وقفہ دے دیا گیا ہے۔

دھوبی اور راجہ پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا کیونکہ انہوں نے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ پولیس حکام کو ہدایت کردی گئی تھی کہ جو بیان دھوبی اور راجہ نے دیا ہے، اس میں چوہدری کو ملوث کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ رشتے داروں میں چہ میگوئیاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ رحمان علی نے اپنی بیوی آسیہ کو ہدایت کردی تھی کہ وہ حویلی میں کم سے کم جائے۔

پہلے تو آسیہ نے بڑا احتجاج کیا تھا لیکن جب رحمان علی نے سختی کی تو اس نے باپ سے کہہ دیا کہ اباجی، رحمان علی کے دل میں یہ خوف بیٹھا ہوا ہے کہ جس طرح حویلی میں نور جہاں، صفدر بھائی وغیرہ قتل ہوئے ہیں، اسی طرح کہیں روحوں کا انتقام رحمان علی کو نقصان نہ پہنچادے۔

''ٹھیک ہے بیٹا! جب انسان کا برا وقت آتا ہے تو اپنے ہی سب سے پہلے اپنی اصل شکل دکھاتے ہیں، وہ جب بھی تمہیں اجازت دے دے، آجایا کرو، ہمارے پاس تو اب کچھ رہ ہی نہیں گیا ہے۔''

آسیہ نے آنا جانا کافی کم کردیا تھا۔ ادھر رحمان علی کے دل میں شدید آرزو تھی کہ ان کے ہاں اولاد پیدا ہو لیکن اس سلسلے میں انہیں مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ رحمان علی کی ایک بزرگ خاتون نے اسے مشورہ دیا۔

''رحمان! ویسے تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے جب بھی وہ انسان کو اولاد سے نوازدے لیکن اگر تم یتیم خانے سے کوئی بچہ حاصل کرلو تو تمہارے گھر میں رونق آجائے گی اور ہوسکتا ہے اللہ کی رحمت بھی ہوجائے۔''

''کیا مطلب ہے آمنہ خالہ......! آپ کا مطلب ہے میں یتیم خانے سے بچہ لے کر پال لوں؟''

''بیٹا! کوئی ہرج بھی نہیں ہے، یہ دنیا کی کوئی انوکھی بات تو نہیں ہوگی۔''

رحمان علی نے آسیہ سے بات کی تو آسیہ جلدی سے بولی۔ ''میرے دل میں تو کئی بار یہ خیال آیا ہے لیکن اس ڈر سے آپ سے نہیں کہہ سکی کہ پتہ نہیں آپ اس بات کو پسند کریں کہ نہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں آسیہ کہ نہ حیدر علی بھائی کے ہاں کوئی اولاد پیدا ہوئی اور نہ صفدر علی کے ہاں...... ہماری بھی یہی کیفیت ہے، میرا خیال ہے کہ ہم آمنہ خالہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں، میں معلومات کرتا ہوں۔'' رحمان علی نے اس سلسلے میں معلومات حاصل کیں اور اسے پتہ چل گیا کہ یتیم خانے سے بچہ کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے چنانچہ وہ کوشش میں مصروف ہوگیا۔

کچھ خاص دوستوں سے سفارش کرائی اور پھر یتیم خانے کے نگراں نے ایک دن انہیں دعوت دے دی کہ وہ یتیم خانے آکر بچوں کا انتخاب کرلیں۔ دونوں میاں، بیوی یتیم خانے پہنچ گئے تھے۔

''کس عمر کا بچہ لینا پسند کریں گے آپ؟'' نگراں نے پوچھا۔

''اصل میں میری بیوی کو بہت چھوٹے بچے پالنے کا تو کوئی تجربہ نہیں ہے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ دو ڈھائی سال کا بچہ اگر حاصل ہوجائے تو بہتر ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کو تین چار بچے دکھائے دیتا ہوں۔'' نگراں نے یتیم خانے کی آیاؤں کو ہدایت کی اور آیائیں دو ڈھائی سال کے تین چار بچوں کو لے کر آگئیں۔ ان میں ایک بچہ واقعی بہت خوبصورت تھا۔

آسیہ اور رحمان علی کو یہ بچہ بہت پسند آیا۔ یتیم خانے کے نگراں نے ان سے بھرپور تعاون کیا اور ضروری کارروائی کے بعد بچہ ان کے حوالے کردیا۔

رحمان علی نے بچے سے پوچھا۔ ''بیٹے! کیا نام ہے تمہارا؟''

''نول دین۔''

''نول دین......! بھئی واہ بڑا پیارا نام ہے، اماں ابا کہاں ہیں تمہارے؟''

''مل دئے۔'' بچے نے جواب دیا۔ آسیہ کے دل پر ایک گھونسا سا لگا تھا۔ معصوم سے بچے کے منہ سے ماں، باپ کے مرجانے کی بات بڑی دکھ بھری تھی۔ بہرحال وہ بچے کو لے کر چل پڑے۔

بچہ غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔ گھر لانے کے بعد وہ اس کے چاؤ چونچلوں میں مصروف ہوگئے، بہت سے کپڑے خریدے گئے، بہت سے کھلونے...... غرض اپنی ہر کمی، ہر محرومی پوری کی انہوں نے۔ رحمان علی بار بار یہی کہتا تھا کہ اگر پہلے ہی دل میں یہ خیال آجاتا تو بہت پہلے گھر میں یہ رونق بڑھ چکی ہوتی۔ ایسے موقع پر آسیہ آزردہ ہوجاتی تھی پھر ایک دن اس نے کہا۔ ''رحمان علی! معاف کرنا یہ بہت ہی پیارا بچہ ہے لیکن جب تم یہ بات کہتے ہو تو دل میں ایک لکیر سی کھنچ جاتی ہے، اپنے دل کا ٹکڑا اپنا ہی ہوتا ہے، اس کی بات ہی مختلف ہوتی ہے، کاش یہ بچہ میری کوکھ سے پیدا ہوا ہوتا تو ہماری خوشیاں ہزار گنا زیادہ ہوتیں۔''

نجانے کیوں رحمان علی کے انداز میں ایک طنز سا پیدا ہوگیا۔ ''بار بار یہ جملے کہہ کر تم میرے ذہن کو خراب کرتی ہو، معاف کرنا میں تو اسے کسی کی بددعا ہی سمجھتا ہوں کہ تمہارے بھائیوں کے ہاں اولاد ہوئی اور نہ ہی تمہارے ہاں۔''

آسیہ ان الفاظ پر گردن جھکا کر خاموش ہوگئی۔ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ادھر چوہدری سردار علی کی حویلی میں وقت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ کسی کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا، چوہدری سردار علی نے غلام احمد سے بھی یہ بات کہی تھی کہ اگر فیروزہ کی شادی حیدر علی سے کردی جائے تو کوئی ہرج ہے۔ غلام احمد نے جواب دیا تھا کہ اگر فیروزہ اور حیدر علی دونوں تیار ہوجائیں تو انہیں کیا اعتراض ہے۔ البتہ انہوں نے دبی زبان سے یہ ضرور کہا تھا کہ چوہدری سردار علی! خود اپنی زبان سے بتا چکے ہو کہ تمہاری ہر کوشش ناکام رہی ہے اور وہ قاتل روحیں تمہیں کسی بھی طور پر معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ہم اگر یہ شادی کر بھی دیں تو کیا اس کے بعد یہ گارنٹی ہے کہ یہ سب زندہ بچ جائیں گے؟''

''ایسی باتیں کرکے میرا دل مت توڑو غلام احمد! کیا کچھ گنوا چکا ہوں میں، اب تو لوگ میری برائیاں کرنے کے بجائے مجھ سے ہمدردی کرنے لگے ہیں، تم میرے اپنے ہو غلام احمد...... مجھے ڈھارس دو، میرے لئے وہ ترکیبیں سوچو کہ میرے خاندان میں جو کچھ بچ گیا ہے، وہ بچا رہ جائے۔''

غلام احمد نے ہمدردی سے چوہدری سردار علی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''چوہدری! ہم سب کی دعائیں یہی ہیں، ہم وقت کا انتظار کرتے ہیں، دیکھتے ہیں وقت کیا فیصلے کرتا ہے۔''

چوہدری ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

فیروزہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو چوہدری سردار علی کی خدمت کے لئے وقف کردیا تھا۔ یہ سوچ کر اپنے گھر سے یہاں واپس آگئی تھی کہ آخرکار خود بھی نظام دین کے خاندان کے ہاتھوں انتقام کا شکار ہوجائے گی۔ اس نے سوچا تھا کہ جب موت ہی آنی ہے تو وہ اپنے گھر میں آئے یا چوہدری سردار علی کے گھر میں...... ایک ہی بات ہے۔ اسی خیال کے تحت وہ یہاں آگئی تھی اور پھر اس گھر سے اس کی اور صفدر علی کی یادیں وابستہ تھیں، چنانچہ یہاں اسے سکون بھی ملتا تھا۔ بہرطور وقت گزرتا رہا۔

ایک دن چوہدری سردار علی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر سیر کے لئے نکل گیا تھا۔ حیدر علی شہر میں اپنے کاروبار کی آخری رسومات کے لئے گیا ہوا تھا، سارا کاروبار ختم ہوگیا تھا فرم کو تالا لگ گیا تھا، ملازمین کو ادائیگیاں وغیرہ کردی گئی تھیں اور ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ آئندہ یہ فرم قائم نہ رہ سکے گی چنانچہ سب کے سب اپنے اپنے طور پر نوکری تلاش کرکے کہیں نہ کہیں چلے گئے تھے۔ چوہدری اپنی زمینوں پر تھا اور معمول کے مطابق انہیں دیکھ کر کلس رہا تھا۔ زمینوں کے نگراں کو اس نے طلب کرکے خوب برا بھلا کہا اور کہا کہ یہ کیا ہورہا ہے، ذرا برابر کی زمینیں دیکھو اور اپنی کھیتی کو دیکھو۔

ریاض خان نامی اس شخص نے کہا۔ ''چوہدری صاحب! شاد پور میں اور بھی بہت سے کھیت ہیں، ہماری زمینوں کی سبزی سب سے اچھی ہے اور منڈی والے بھی یہاں کی سبزی کو سب سے اچھا قرار دیتے ہیں، یہ بس تھوڑے دنوں کی بات ہے، برابر کی زمینوں کو بدرالدین نے سونا بنا دیا ہے، اس کے پاس کوئی ایسا نسخہ ہے جس سے ان زمینوں نے اچانک ہی اتنی اچھی سبزی پیدا کرنا شروع کردی ہے۔''

''یہ بدرالدین کون ہے؟ ذرا اسے بلاکر لاؤ۔''

بدرالدین، چوہدری سردار علی کے سامنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت رچی ہوئی تھی کیونکہ اسے ساری تفصیل معلوم تھی۔ اس نے یہ ساری کہانی اپنی سب سے محبوب ہستی جمیلہ کی زبانی سنی تھی۔ بہرحال چوہدری کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ بدرالدین کی آنکھوں میں نفرت رچی ہوئی ہے۔

''بدرالدین! کہاں کے رہنے والے ہو؟'' چوہدری نے پوچھا۔

''شاد پور ہی میں پیدا ہوا چوہدری صاحب اور شاد پور ہی میں زندگی گزاری ہے۔''

''غیاث اللہ کی زمینوں پر کب سے کام کرنا شروع کیا ہے تم نے؟''

''زیادہ دن نہیں ہوئے۔''

''کیا تمہارے پاس زمینوں کو بہتر بنانے کی کوئی خاص ترکیب ہے؟''

''ہے چوہدری صاحب! اور وہ یہ ہے کہ میں خود ان زمینوں پر محنت کرتا ہوں اور میرا ان سے خون کا رشتہ ہے۔''

''زمینوں سے خون کا رشتہ......؟''

''جی چوہدری صاحب! جب تک زمینوں سے خون کا رشتہ قائم نہ کیا جائے، زمینیں متاثر نہیں ہوتیں۔''

''فلسفہ بگھار رہے ہو میرے سامنے......! سنو، کیا دیتا ہے چوہدری غیاث اللہ تمہیں!''

''محبت، سچائی اور ایمانداری۔''

''دیکھو میں الٹے دماغ کا آدمی ہوں، الٹی سیدھی باتیں سننا پسند نہیں کرتا، تم ایک کام کرو، چھوڑ دو چوہدری غیاث اللہ کی نوکری، میری زمینیں سنبھالو، جو کچھ وہ تمہیں دیتا ہے، میں اس سے چار گنا زیادہ دوں گا، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میری زمینوں سے زیادہ اچھی سبزی کسی اور کی زمینیں دیں۔''

''چوہدری صاحب! آپ اسی وجہ سے دنیا کے سامنے ایک کہانی بن گئے ہیں، اب کوئی اور کہانی شروع نہ کریں، آپ کے پاس اب کچھ نہیں بچا ہے، ان زمینوں پر اپنا قبرستان بنوا سکتے ہیں تاکہ لوگ آپ کو ایک ایسے ظالم شخص کی حیثیت سے یاد رکھیں جس نے انا پرستی اور اپنی ضد کے لئے اپنا گھر، اپنے بچے، اپنی شان و شوکت قربان کردی۔'' بدرالدین کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

چوہدری سردار علی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں کبھی اس نے کسی ایرے غیرے سے اس طرح کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ اس معمولی سے آدمی کو اتنی جرأت کیسے ہوگئی۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں رک کر بدرالدین کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد واپس پلٹ گیا۔ ڈرائیور کو اس نے جیپ آگے بڑھانے کے لئے کہہ دیا۔ بدرالدین کی جرأت پر وہاں موجود دوسرے لوگ بھی حیران تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑے چوہدری کو واپس جاتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر ان میں سے ایک نے بدرالدین سے کہا۔ ''یہ تو نے کیا کیا بدرو......! چوہدری سردار علی جس طرح مڑ کر واپس گیا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی بہت ہی خوفناک ارادہ ہے، بدرالدین! اللہ تیری حفاظت کرے، چوہدری نے ایسے کسی آدمی کو کب زندہ چھوڑا ہے جس نے اس سے آنکھیں ملاکر بات کی ہو۔''

بدرالدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''یہی تو آپ کو معلوم نہیں ہے چاچا جی! یہاں کون بدبخت زندہ رہنا چاہتا ہے، موت کا ہی تو انتظار ہے مجھے کیونکہ اس کے بعد مجھے جو کچھ ملنے والا ہے، کوئی بھی نہیں جانتا۔''

لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

☆......☆......☆

لوگوں کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ چوہدری سردار علی پر جو کچھ بیت چکی تھی، اس نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کردیا تھا لیکن اس ریزہ ریزہ وجود میں بھی وہ سب کچھ اب بھی موجود تھا جس نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا۔ وہ حویلی واپس آگیا تھا لیکن اس کے دماغ میں شدید کھولن ہورہی تھی۔ اس نے ایک خاص آدمی کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''سب سے پہلے زمینوں سے ریاض خان کو بلاکر لاؤ اور اس کے بعد جگن کو...... جگن سے کہنا کہ سردار علی کو تیری ضرورت پیش آگئی ہے۔''

ملازم گردن جھکا کر تعمیل حکم میں حویلی سے باہر نکل گیا۔ جگن ایک خطرناک بدمعاش تھا اور شاد پور میں ہی رہتا تھا۔ بستی کے ایسے بہت سے لوگ تھے جو سردار علی کے اشاروں پر کام کیا کرتے تھے۔ ریاض خان، چوہدری کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''حکم چوہدری جی......؟''

''ریاض خان! تم نے بتایا تھا کہ بدرالدین، غیاث اللہ کے کھیتوں کی نگرانی کرتا ہے اور کچھ عرصے سے ان کھیتوں میں شاندار سبزی پیدا ہونا شروع ہوگئی ہے؟''

''جی مائی باپ!''

''یہ بدرالدین آخر ہے کون؟''

''سرجی! بستی ہی کا رہنے والا ہے، پڑھا لکھا لڑکا ہے، ماں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، ماں مرگئی تو گھربار چھوڑ کر ریلوے اسٹیشن جا پڑا، پھر وہاں قلی گیری کرنے لگا، پتہ نہیں کس طرح غیاث اللہ کی زمینوں پر کام شروع کردیا۔''

''ہوں......! اور کوئی خاص بات اس کے بارے میں؟''

''نہیں سرکار! میں نے خود اسے زمینوں پر کام کرتے ہوئے دیکھا ہے، محنتی بندہ ہے۔''

''ٹھیک ہے ریاض خان! تم جاؤ۔''

جگن ابھی تک نہیں آیا تھا۔ نوکر شاید اسے تلاش کررہا تھا۔ اتنے میں حیدر علی واپس آگیا۔ ''جی اباجی! خیریت سے ہیں آپ؟''

''ہاں ٹھیک ہوں، وقت نے مجھ سے جینے کے سارے سہارے چھین لئے ہیں، اتنے چوکے لگنے لگے ہیں دل پر کہ کبھی جینے کا تصور ہی ختم ہوجاتا ہے۔''

''ہاں اباجی! کوئی تدبیر کارگر نہیں ہورہی، کل ہی حیدر بیگ گیا تھا، وہاں ایک عجیب کہانی کانوں میں پڑی ہے۔''

''کیسی کہانی؟'' چوہدری نے چونک کر پوچھا۔

''اپنی بستی شاد پور کا رہنے والا ایک لڑکا ہے، بدرالدین نام ہے اس کا، بہت عرصے سے بستی والے اسے ہر جمعرات کو اس قبرستان میں دیکھتے ہیں جہاں چوہدری نظام دین اور اس کے خاندان والے دفن ہیں، وہ ہر جمعرات کو وہاں جاتا ہے، صرف چوہدری نظام دین کے خاندان والوں کی قبروں کی صفائی وغیرہ کرتا ہے، پھول ڈالتا ہے، اگربتیاں جلاتا ہے اور گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا ہے، ہمارے ہاں شاد پور میں قلی گیری کا کام کرنے لگا تھا، قلیوں میں بہت مقبول ہے، وہ ریلوے اسٹیشن پر ہی رہتا ہے، ماں کی موت کے بعد کبھی اپنے گھر نہیں گیا۔''

چوہدری کسی قدر حیرانی سے ساری باتیں سن رہا تھا۔

''اور کیا کرتا ہے وہ......؟''

''کیوں! آپ کیوں پوچھ رہے ہیں یہ؟''

''حیدر علی! یہاں غیاث اللہ کی زمینوں کے بارے میں جانتے ہو؟''

''ہاں اباجی! گزر رہا تھا ایک دن وہاں سے، وہ زمینیں تو بہت ہی اچھی ہوگئی ہیں، آڑھتی وہاں کی سبزیوں کی بڑی اچھی بولی لگارہے ہیں۔''

''جانتے ہو ان سبزیوں پر کون کام کررہا ہے؟'' چوہدری سردار علی نے کہا۔

''کیا مطلب ہے اباجی! بات سمجھ میں نہیں آئی؟''

''وہ قلی بدرالدین، قلی گیری چھوڑ چکا ہے اور اب غیاث اللہ کی زمینوں پر کام کررہا ہے اور جب سے اس نے کام شروع کیا ہے، غیاث اللہ کی زمینوں نے سونا اگلنا شروع کردیا ہے۔''

''اس نے کام شروع کیا ہے؟''

''ہاں تم جانتے ہو حیدر علی! میرے اندر یہی بہت بڑی خرابی ہے کہ میں کسی کو اپنے آپ سے آگے بڑھتے نہیں دیکھ سکتا، گیا تھا میں ان زمینوں پر اور دیکھی ہیں میں نے وہ زمینیں...... ہماری زمینوں کی سبزی تو ان کے سامنے ایک شرمناک حیثیت رکھتی ہے، خون کھول گیا میرا، میں نے اسے بلایا اور کہا کہ بدرالدین ہماری زمینوں کی نگرانی بھی کرلیا کر۔ بدتمیزی سے بولا کہ چوہدری صاحب! میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے چار گنا زیادہ معاوضہ دوں گا، میں نہیں پسند کرتا کہ میری زمینوں سے زیادہ اچھی سبزی کسی اور کی زمینیں دیں تو اس نے مجھے بہت بری بری باتیں کہیں، مجھ سے کہا کہ آپ دنیا کے سامنے ایک کہانی بن گئے ہیں، کوئی اور کہانی شروع نہ کریں، حیدر علی! وقت بگڑ گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی ادنیٰ شخص مجھ سے اس طرح کی باتیں شروع کردے، اسے زندہ نہیں رہنا چاہئے، اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے چاہئیں، اس کی زبان نکال کر میرے سامنے پیش ہونی چاہئے، میں نے جگن کو بلایا ہے، جگن یہ کام کرے گا۔''

حیدر علی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے چوہدری سردار علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب بھی اباجی! اب بھی آپ یہی سب کچھ کریں گے، قربانی تو ہماری ہورہی ہے، آپ کی انا کی بھینٹ تو ہم چڑھ رہے ہیں، نور جہاں، صفدر علی، میری بیوی فردوس جہاں اور نجانے کون کون...... اباجی! خدا کے لئے اب تو اپنے آپ کو سنبھال لیجئے، خدا کے لئے آپ اپنے ذہن کو تبدیل کرلیجئے، آپ اس کے ٹکڑے کرا رہے ہیں پھر کیا ہوگا، ہم سب کو تو خیر مرنا ہی ہے، پر اباجی! بہتری کا کوئی تصور بھی اب دل میں نہیں رہ جاتا آپ کے ان اقدامات کی وجہ سے، میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ اگر بدرالدین کا اس خاندان سے کوئی روحانی رشتہ ہے تو ہم بدرالدین سے بات کرتے ہیں، اگر ہوسکے تو ہمیں نظام دین کے خاندان سے معافی دلوادے، جتنا ربط بدرالدین کا ان لوگوں سے بتایا جارہا ہے، میرا مطلب ہے روحانی رابطہ تو ہوسکتا ہے، ہمارا کام بن جائے اور آپ ہیں کہ بدرالدین کے ٹکڑے کرانے کے درپے ہیں۔ صرف اس بنیاد پر کہ اس کی محنت سے غیاث اللہ کی زمینیں اچھی فصل دینے لگی ہیں، خدا کے لئے اباجی! خدا کے لئے اپنی سوچ بدل لیں۔''

چوہدری سردار علی کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ حیدر علی کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے تھے۔

''ارے نہیں حیدر علی...... یہ سب کچھ نہ کر بیٹا! ہاں غلطی تو ہوئی ہے، غلطی تو ہوئی ہے، پتہ نہیں کیسا کمبخت دماغ ہے۔'' سردار علی نے کہا۔

''اباجی! مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ بدرالدین، غیاث اللہ کی زمینوں پر کام کررہا ہے، اگر ایسی بات ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ اپنی یہ زمینیں بدرالدین کو دے دیں، اس سے کہیں کہ اب وہ ان زمینوں کا مالک ہوگا، ہم ان کی رجسٹری اس کے نام کرائے دیتے ہیں، وہ ان زمینوں کی آبیاری کرے، بے شک وہ غیاث اللہ کی زمینوں پر بھی کام کرتا رہے لیکن یہ زمینیں بھی اس کی ملکیت ہیں، وہ ان پر مالک کی حیثیت سے کام کرے، ہم خوشی کے ساتھ ان کی رجسٹری اس کے نام کردیتے ہیں۔''

چوہدری سردار علی بڑی غم آلود نگاہوں سے حیدر علی کو دیکھنے لگا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے حیدر علی! کردو ایسا، تم اس سے کہو کہ اگر ان روحوں سے اس کا رشتہ ہے اور اگر ان زمینوں کی آبیاری میں ان روحوں کا کوئی کردار ہے تو......!''

ابھی چوہدری سردار علی یہی کہہ پایا تھا کہ اچانک ہی حویلی کے کسی حصے سے ایک زوردار چیخ ابھری۔ بڑی ہولناک اور کربناک چیخ تھی۔ دونوں گھبرا کر کمرے کے دروازے کی طرف بھاگے تھے۔

(جاری ہے)

خوف

ایم اے راحت

قسط: 10

چیخ دوسری بار بھی سنائی دی تھی اور ان دونوں کو آواز کی سمت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے اس کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ چوہدری سردار علی نے بدحواسی کے عالم میں دروازہ کھولا۔

کمرے کے وسط میں پنکھے سے ایک انسانی جسم الٹا لٹکا ہوا تھا۔ سر کے لمبے لمبے بال زمین کو چھو رہے تھے اور جسم چکر کھا رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ یہ فیروزہ تھی جس کی گردن کٹی ہوئی تھی لیکن خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں تھا۔ پاس ہی ایک ملازمہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی، چیخیں اسی ملازمہ کے حلق سے نکلی تھیں جس نے یہ گردن کٹی لاش دیکھی تھی۔

چوہدری سردار علی فیروزہ کی لاش سے جا کر لپٹ گیا۔

''مرگئی، میری بچی مرگئی۔ میری نور جہاں پھر سے مرگئی۔ میری فردوس جہاں پھر مرگئی۔ ہائے، میرا گھر لٹ رہا ہے، ارے کوئی میرا گھر بچالے۔ میرا گھر بچالے۔'' چوہدری اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہا تھا اور اس کا حلق خشک ہوتا جا رہا تھا۔

حیدر علی پتھرایا ہوا دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ فیروزہ درحقیقت پیکر ایثار و وفا تھی۔ شوہر کی موت کے بعد بھی وہ اسی گھر میں واپس آ گئی تھی جس کے بارے میں وہ جانتی تھی کہ یہ موت کا گھر ہے۔ وہ اس گھر کی محبت میں یہاں آ گئی تھی مگر اسے بھی نہیں بخشا گیا تھا۔ قاتل روحوں نے اس خاندان کے کسی فرد کے ساتھ رعایت نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

حیدر علی نے خود کو سنبھالا۔ گھر میں چند ملازم باقی رہ گئے تھے۔ وہ آ گئے پہلے بے ہوش ملازمہ کو وہاں سے لے جایا گیا، اس کے بعد ملازموں کی مدد سے لاش کو نیچے اتارا گیا لیکن پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے حیدر علی نے غلام احمد کو فون کرنا مناسب سمجھا۔ غمزدہ باپ کو بیٹی کی موت کی اطلاع دینی ضروری تھی، فون غلام احمد نے ہی ریسیو کیا تھا۔

''میں حیدر علی بول رہا ہوں۔'' حیدر علی کی بھرائی ہوئی آواز ابھری تو غلام احمد نے کہا۔ ''خیریت حیدر علی! خیریت بتاؤ۔''

''شہید وفا کی لاش لے جائیے غلام احمد صاحب ہماری فیروزہ بھی داغ مفارقت دے گئی۔'' حیدر علی نے کہا اور دوسری طرف سے ریسیور گرنے کی آواز سنائی دی۔ حیدر علی جانتا تھا کہ باپ پر کیا گزری ہوگی۔

بہرحال پولیس کو بھی اطلاع دینا ضروری تھا، پولیس آ گئی اور کچھ دیر کے بعد غلام احمد کے اہل خاندان بھی پہنچ گئے۔ غلام احمد نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔ پولیس افسران کو تفصیل بتائی گئی۔ بھلا پولیس اس بارے میں کیا کر سکتی تھی سوائے قانونی کارروائیوں کے۔ حیدر علی نے اپنے تعلقات سے کام لیکر پوسٹ مارٹم وغیرہ نہیں ہونے دیا تھا۔

حیدر علی غلام احمد کو دلاسے دے رہا تھا۔ ''ہم سب کا یہی انجام ہونا ہے غلام احمد صاحب۔''

''مجھے معاف کرنا حیدر علی، دل تو چاہتا ہے کہ چوہدری سردار علی کے جسم پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دوں، دیکھو کس طرح ہم بے گناہ ایک گنہگار کے گندے عمل کا شکار ہوئے ہیں، ہمارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔''

''لاش کا کیا کریں گے غلام احمد صاحب، آپ لے جائیں گے یا یہیں ان کی تدفین کا بندوبست کیا جائے؟''

''ارے اب مٹی کو لے جا کر کیا کریں گے۔ وہ اپنی خوشی سے یہاں آئی تھی، اسے شاہ پوری میں آخری جگہ بھی دو۔''

لاش کی تدفین شاہ پوری میں کی گئی تھی۔ بے شک چوہدری نے غلط عمل کیا تھا جس کے نتیجے میں نظام دین کا خاندان موت کے بعد اس خاندان سے انتقام لے رہا تھا۔ ایسے اس حویلی کا مقدر بن چکے تھے۔ ملازم تک خوفزدہ رہتے تھے، بلکہ ملازموں کے درمیان ایک دن باقاعدہ مشاورت ہوئی۔ وہ سب مل کر بیٹھ گئے۔

''بھائیو! یہ بتاؤ کہ کیا کرنا ہے، ہم لوگ یہاں رہیں یا یہاں سے نکل بھاگیں۔''

''نہیں، چاچا امام علی، ہم میں سے تو آج تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ چوہدری صاحب نے اس خاندان کے ساتھ برا کیا ہے۔''

''اگر تم لوگ بھی اس کے ساتھ شریک ہوتے اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تو ہمارا تم سے بھی جھگڑا تھا۔'' بیٹھے ہوئے نوکروں میں سے کسی کی آواز ابھری لیکن یہ آواز ان میں سے کسی کی نہیں تھی۔

انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو نظام دین ان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ملازموں کے حلق سے دھاڑیں نکلیں اور وہ اپنی جگہ سے اچھل کر بھاگے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ ملازم پوری حویلی میں چیختے پھر رہے تھے اور حیدر علی اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوا حیران نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت چوہدری سردار علی بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ فیروزہ کی موت کے بعد وہ بالکل تباہ گیا تھا اور اس کی ذہنی حالت کافی خراب ہو گئی تھی اور کبھی کبھی وحشت کے عالم میں اٹھ کر دوڑنے لگتا تھا۔ کئی بار گرا تھا اور چوٹیں لگی تھیں۔ چوہدری نے باہر آ کر کہا۔ ''کیا ہوا..... حیدر علی تو زندہ ہے، کچھ ہوا تو نہیں کیا تجھے؟''

''نہیں ابا جی ٹھیک ہوں میں، پتہ نہیں ان کم بختوں پر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے، چیختے پھر رہے ہیں۔''

ایک ملازم کو پکڑا گیا تو اس نے صورتحال بتائی، چوہدری کی حالت اور بگڑ گئی وہ سینہ کوبی کرنے لگا۔

''ارے نہیں چھوڑیں گے ہمیں وہ لوگ، نہیں چھوڑیں گے بھائی نہیں چھوڑیں گے۔ مزید کچھ ہو کر رہے گا۔'' چوہدری غش کھا کر گرا اور اس کے کان کے پاس سے خون بہنے لگا، حیدر علی نے بڑی مشکل سے کچھ ملازموں کی مدد سے اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ چوہدری کی حالت کافی خراب تھی، حیدر علی نے رحمان علی کو فون کیا تو فون اسی نے اٹھایا۔

''رحمان بھائی! کچھ اور حالات تبدیل ہوئے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو آسیہ کو کچھ دن کے لئے بھیج دیں۔ وہی باتیں ہیں، یا تو میں ابا کو اسپتال میں داخل کرا دوں اور خود کہیں اور اپنا ٹھکانہ کرلوں، یا پھر آسیہ کو یہاں بھیج دیں۔''

''دراصل میں کچھ گھریلو حالات خراب ہو گئے ہیں۔ مجبوری ہے ابھی میں آسیہ کو نہیں بھیج سکتا۔ چوہدری صاحب کو میرا خیال ہے، اسپتال میں داخل کرا دینا زیادہ مناسب ہوگا۔''

رحمان علی کا لہجہ کچھ خشک سا تھا لیکن حیدر علی نے اس بات کا برا نہیں مانا اور ٹھنڈی سانس لے کر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد حیدر علی کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ چوہدری سردار علی کو کسی اچھے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرا دے جہاں اس کی بہترین نگہداشت ہو، چنانچہ اسی دن وہ چوہدری کو لے کر شہر چل پڑا تھا۔

☆......☆......☆

آسیہ نے رحمان علی کی فون پر باتیں سن لی تھیں۔ فون بند ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ ''میرے گھر سے فون تھا؟''

''ہاں یار..... ان لوگوں کی غیرت بالکل مٹ گئی ہے۔ ساری دنیا تھو تھو کر رہی ہے لیکن یہ ابھی تک پاک اور معصوم بنے ہوئے ہیں۔ حیدر علی صاحب فرما رہے تھے کہ تمہیں حویلی بھیج دوں تاکہ تمہاری موت بھی آسان ہو جائے۔''

''ایسے بیدرد نہ ہو رحمان علی، ہم پر آفت آئی ہے اللہ سب پر رحم کرے۔''

''بس خاموش ہو جاؤ آسیہ، دیکھو ہماری کب باری آتی ہے، بے چاری فیروزہ بھی گئی وہ تو غیر تھی جبکہ چوہدری سے منسوب کسی بھی شخص کے لئے ان روحوں کی طرف سے معافی نہیں ہے۔''

آسیہ رونے لگی تھی۔ اس وقت نوردین گیند سے کھیلتا ہوا اندر آ گیا۔ اس بچے کی وجہ سے گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ بڑی پیاری باتیں کرتا تھا توتلی زبان میں۔

پھر ایک رات صورتحال بدل گئی۔ اس رات معمول کے مطابق نوردین آسیہ کے بستر کے قریب سو رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر رحمان علی بھی گہری نیند میں تھا، کمرے میں مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ نہ جانے کیوں آسیہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کچھ بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اس نے پانی کی طلب محسوس کی اور اٹھ کر پانی پینے کا فیصلہ کیا، لیکن جب اٹھنے لگی تو اچانک اسے محسوس ہوا کہ نوردین جاگ رہا ہے لیکن جیسے ہی اس نے نوردین کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو نوردین نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے نوردین کے چہرے کو غور سے دیکھا تو اچانک ہی اسے نوردین کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے خدوخال پھیل گئے ہوں، چہرہ چوڑا بھی لگ رہا تھا اور ایک عجیب سی ویرانی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی، ایک لمحے کے لئے نہ جانے کیوں آسیہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ بچے سے وہ بہت پیار کرتی تھی لیکن اس وقت دل پر کچھ عجیب سا تاثر پیدا ہو گیا تھا۔

وہ چند لمحات نوردین کے چہرے پر نگاہیں جمائے رہی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھی۔ بیڈ روم کے فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔ گلاس کی تلاش کے بغیر اس نے بوتل کا ڈھکن کھول کر اسے منہ سے لگا لیا اور آدھی سے زیادہ بوتل کا پانی پی لیا۔ نجانے کیوں وہ اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو نہیں پا رہی تھی۔ بستر پر نوردین کے برابر لیٹتے ہوئے اسے کچھ عجیب سا لگا وہ نوردین کا چہرہ دیکھتی رہی مگر اس کے انداز میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اس کے جاگنے پر شک کیا جاتا چنانچہ اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں لیکن نجانے کتنی دیر سوئی تھی کہ اسے اپنی گردن پر ایک عجیب سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی گیلی شے اس کی گردن پر رینگ رہی ہو۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر اس نے آنکھیں کھول دیں اور جو کچھ اس نے دیکھا وہ اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔

نوردین جاگ رہا تھا، اس کی آنکھیں گہری سبز ہو رہی تھیں اور ان سے سبز روشنی کی مدھم مدھم شعاعیں نکل رہی تھیں لیکن جو سب سے زیادہ بھیانک چیز تھی وہ اس کی کوئی ڈیڑھ فٹ لمبی زبان تھی جو منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور اس کی گردن کو چھو رہی تھی۔ آسیہ نے محسوس کیا کہ نوردین کی یہ لمبی زبان اس کی گردن پر رینگ رہی ہے۔

دفعتاً ہی آسیہ کے حلق سے ایک وحشت ناک چیخ نکلی اس نے کروٹ بدلی اور پلنگ سے نیچے آ رہی۔

آسیہ کی بھیانک چیخ سن کر تھوڑے فاصلے پر سوتا ہوا رحمان علی بھی ہڑبڑا کر اٹھ گیا تھا۔ وہ ان دنوں پستول سرہانے رکھ کر سوتا تھا، اس نے جلدی سے پستول نکال کر ہاتھ میں لیا اور پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے گری ہوئی آسیہ پر نگاہ ڈالی جو دہشت سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پھر اس کی نگاہ دروازے کی طرف اٹھی۔ بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ان دنوں وہ لوگ کھڑکیاں وغیرہ بھی بند کر لیتے تھے۔ وہ کمرہ بند ہونے کی وجہ سے اے سی چلا کر اور کمبل وغیرہ اوڑھ کر سوتے تھے۔ رحمان علی کو جب اطمینان ہو گیا کہ قرب و جوار میں کوئی نہیں ہے تو وہ آسیہ کی طرف بڑھا۔ آسیہ کا پورا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔ رحمان علی نے بمشکل تمام اسے اٹھا کر اپنے بستر پر بٹھایا۔

''آسیہ کیا بات ہے۔ کیا ہو گیا تمہیں، کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟''

لیکن آسیہ نے دونوں آنکھیں بند کرلی تھیں اور اس کے منہ سے بھنچی بھنچی آوازیں نکل رہی تھیں، وہ بری طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''آسیہ کوئی خواب دیکھا ہے کیا، میری طرف تو دیکھو، بتاؤ گی نہیں کیا ہو گیا ہے، پلیز بتاؤ کیا ہوا ہے۔''

آسیہ نے ہاتھ اٹھایا اور انگلی سے اپنے بستر کی جانب اشارہ کرنے لگی۔ رحمان علی نے بستر کو دیکھا، نوردین گہری نیند سو رہا تھا، سب کچھ نارمل تھا، اس وقت اس کی سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ کیوں مجھے تنگ کر رہی ہو یا تو بتاؤ کہ کیا بات ہے یا پھر جاؤ لیٹو آرام سے۔''

''خ..... خدا کی قسم میرا وہم نہیں تھا، میں نے ہوش و حواس کے عالم میں دیکھا ہے، ذرا میری گردن پر دیکھو کوئی چیز لگی ہے۔''

''گردن پر؟''

''ہاں۔''

''کچھ بھی نہیں لگا؟'' رحمان علی نے آسیہ کی گردن کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس پر نمی بھی نہیں ہے؟''

''کچھ بتاؤ تو میں اندازہ لگاؤں۔''

''وہ نوردین جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے گہری سبز شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور اس کی زبان ڈیڑھ فٹ باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ اپنی زبان سے میری گردن چاٹ رہا تھا۔''

''نوردین!'' رحمان علی حیرت سے بولا۔

''ہاں قسم خدا کی۔ تھوڑی دیر پہلے میں کسی آہٹ سے جاگی تھی۔ وہ اس وقت بھی جاگ رہا تھا اور اس نے جلدی سے میرے جاگتے ہی اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور سوتا بن گیا تھا۔''

''اوہ.....'' رحمان علی کی ''اوہ'' بڑی طنزیہ تھی، تھوڑی دیر تک کچھ نہ بولا پھر اس نے کہا۔ ''دیکھو آسیہ، میں تمہیں بالکل برا نہیں کہنا چاہتا لیکن ظاہر ہے تمہارے ذہن میں جو کچھ موجود ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں سامنے تو آتا ہی ہے۔ یہ معصوم سا ڈھائی سال کا بچہ جسے تم یتیم خانے سے لے کر آئی ہو اس کی آنکھیں بھی سبز تھیں اور زبان بھی باہر نکلی ہوئی تھی۔ بی بی، میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ جب تک آپ پر یہ خوف مسلط رہے گا۔ آپ طرح طرح کے خواب دیکھتی رہیں گی۔ وہ ایک معصوم سا بچہ ہے، ذرا قریب جا کر دیکھو کتنی معصومیت ہے اس کے چہرے پر۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں؟'' آسیہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی گردن کو ہاتھ لگایا، پھر اسے سونگھا اور جلدی سے ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''ذرا میری انگلیاں سونگھ کر دیکھو۔''

''کیوں کیا بات ہے اس میں؟''

''ذرا دیکھو کتنی سڑاند آ رہی ہے۔'' آسیہ نے کہا اور اپنی انگلیاں رحمان علی کی ناک سے لگا دیں، رحمان علی ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''آسیہ تم نے کیا لگایا ہے ہاتھوں پر؟''

''کچھ نہیں، خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ میں کتنی نفاست پسند ہوں، کبھی کسی بھی شکل میں ہاتھ پاؤں گندے نہیں رکھتی، وہ اپنی زبان سے مجھے چاٹ رہا تھا۔''

''ارے بابا، میری ایک بات سنو، بعض اوقات توہمات انسان کو نجانے کیا کیا کچھ دکھا دیتے ہیں، خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو، ایسی کوئی بات نہیں ہے، کیوں اس معصوم سے بچے کو اس طرح داغدار کر رہی ہو۔''

''میں، اف توبہ لعنت ہے، بتاؤ میں کیا کروں؟''

''آرام سے جا کر اپنے بستر پر سو جاؤ۔''

''نہیں سو سکوں گی۔''

''تو پھر ایک کام کرتا ہوں میں نوردین کے پاس لیٹ جاتا ہوں تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔''

''مجھے نیند نہیں آئے گی۔''

''بابا لیٹ تو جاؤ میں بیٹھا ہوا ہوں تمہارے پاس۔''

''مجھے ایک بات بتا دو، کیا پہلے تم نے مجھے کسی ایسے وہم کا شکار دیکھا ہے، میں ایک بہادر عورت ہوں لیکن جو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے میں نے۔''

''اے بہادر عورت، اب آرام سے سو جا، کیا سمجھی؟''

آسیہ کچھ دیر تک سوچتی رہی، پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے بستر کی جانب بڑھی اور اس نے نوردین کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ وہ آرام سے سو رہا تھا۔ آسیہ ایک گہری سانس لے کر بستر پر لیٹ گئی۔ ادھر رحمان علی بھی پریشان تھا۔ اس نے آسیہ کی طرف سے کروٹ بدل لی تھی، ان سارے واقعات سے وہ بری طرح جھلا گیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اہل خاندان کا کہنا تھا کہ آسیہ کو چھوڑ کر الگ ہو جائے۔ ماں نے اس سلسلے میں خاص طور سے اس سے بات کی تھی کہ دیکھ رحمان علی وہ گھر اب آسیب زدہ ہو گیا ہے، اس کی وجہ سے سب مصیبتوں میں گرفتار ہیں تو آسیہ کو طلاق دے دے، کوئی اولاد بھی نہیں ہے تم لوگوں کے ہاں، جو تمہارے درمیان رکاوٹ بنے۔ آرام سے اس کو چھوڑ کر اپنا گھر کہیں اور بسا۔ بابا اب یہ خاندان اس قابل نہیں رہا ہے کہ اس میں شمولیت رکھی جائے۔

''لیکن اماں اس میں آسیہ کا قصور تو نہیں ہے۔''

''ارے واہ، تو کیا ہمارا قصور ہے سارے کا سارا۔''

''اماں چھوڑو دیکھتے ہیں۔'' رحمان علی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ آسیہ کو طلاق دے دے البتہ وہ ان واقعات سے خاصا بیزار تھا اور کبھی کبھی اس کے اندر بھی ایک خوف ابھر آتا تھا کہ کہیں کوئی بڑا مسئلہ نہ بن جائے۔

آسیہ نے شوہر کی طرف دیکھا۔ رحمان علی اس کی طرف سے کروٹ بدل کر لیٹ گیا تھا۔ آسیہ نے پھر نوردین پر نظر ڈالی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ نوردین جاگا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر آسیہ کو دیکھا اور فوراً کروٹ بدل لی۔

آسیہ ایک بار پھر تھر تھر کانپنے لگی لیکن اس کی ہمت نہ پڑی کہ شوہر کو جگائے بلاوجہ جھگڑا شروع ہو جاتا لیکن اب نیند کا کیا سوال تھا۔ اس نے اٹھ کر یونہی بیٹھے بیٹھے رات گزار دی۔

☆......☆......☆

غیاث اللہ بہت خوش تھا۔ وہ جب بھی آتا بدرالدین کو زمینوں پر مصروف پاتا۔ بدرالدین ہاریوں سے بھی کام لے رہا تھا اور خود بھی بھرپور طریقے سے زمینوں پر کام کرتا تھا۔ یونین آفس میں کوئی خاص کام تو ہوتا نہیں تھا۔ وہ دن بھر کھیتوں پر وقت صرف کر کے شام کو یونین آفس چلا جاتا تھا۔

اس بار غیاث اللہ خاصے دنوں کے بعد آیا تھا اور ایسے وقت آیا تھا جب بدرالدین زمینوں پر ہی تھا۔ غیاث اللہ نے اپنی زمینیں دیکھیں اور اس کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا۔ اس نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی زمینوں پر سبزی کی اتنی شاندار فصل ہوگی۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے زمینوں کو دیکھنے لگا۔ اسی وقت اسے بدرالدین نظر آیا جو ایک محنت کش کسان کی شکل میں مٹی میں لتھڑا ہوا کام کر رہا تھا۔ اس نے غالباً غیاث اللہ کو نہیں دیکھا تھا۔ تب غیاث اللہ نے اسے آواز دی۔ ''بدرالدین، بدرالدین۔''

تب بدرالدین نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور غیاث اللہ کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''کہئے جناب، کیسے مزاج ہیں، آپ اس بار بہت عرصے بعد آئے۔''

''ہاں بھئی کچھ گھریلو مصروفیات ہو گئی تھیں، عزیز و اقارب میں دو تین شادیاں ایک ساتھ ہی نکل آئی تھیں۔ اب ظاہر ہے ان میں شرکت لازمی تھی۔''

''جی۔''

''بدرالدین، تمہارا کوئی بھی عزیز نہیں ہے۔ معاف کرنا میں نے ایسے ہی سوال کر ڈالا۔''

بدرالدین کے ہونٹوں پر ایک درد انگیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''نہیں جناب! میرے عزیز نہیں ہیں لیکن وہ ہیں جو مجھے عزیز ہیں۔''

''وہ کون ہیں جناب!'' غیاث اللہ نے بدرالدین کی افسردگی کو دور کرنے کے لئے لہجے کو خوشگوار ہی رکھنا مناسب سمجھا۔

''بس ہوتا ہے کبھی کوئی نہ کوئی جسے انسان زندگی سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔'' بدرالدین کی آنکھوں میں جمیلہ کا چہرہ گھوم گیا۔

''خیر ٹھیک ہے، یار ایک بات کہوں، یہ زمینیں دیکھ کر مجھے وحشت ہو رہی ہے کیا زبردست سبزی اگی ہے، اس سے پہلے تو ان زمینوں پر ایسی شاندار کاشت کبھی نہیں ہوئی تھی۔''

''انشاء اللہ تعالیٰ غیاث اللہ صاحب آئندہ اس سے بھی شاندار فصل اگاؤں گا۔''

''تمہارے ہاتھ جوڑ کر تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔'' غیاث اللہ نے کہا۔

بدرالدین کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ ''اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں غیاث اللہ صاحب کہ ہماری فصل چوہدری سردار علی کی زمینوں کی فصل سے اچھی نہیں ہونی چاہئے۔ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح نظام دین کی زمینوں نے سونا اگلا تھا اور چوہدری سردار علی نے ان زمینوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا تو.....''

''بدرالدین، میں تو بس یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں چوہدری سے جھگڑا مول نہیں لینا چاہتا۔'' غیاث اللہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''غیاث صاحب آپ بے فکر رہئے، اگر کوئی الٹی سیدھی بات ہوئی تو میں سب سے پہلے آپ سے مشورہ کروں گا۔''

''ہاں بس یہ سب کچھ دیکھ کر دل اتنا ڈانواں ڈول ہو گیا ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا، میری بڑی حسرت تھی کہ کبھی میں اپنی ان زمینوں کو اس قدر شاداب دیکھوں۔ یہ حسرت اب پوری ہوئی ہے۔ ایک اور خیال بھی میرے دل میں ہے، کتنی ہی بار بچے کہہ چکے ہیں کہ کسی دن وہ بھی زمینوں کی سیر کریں۔ بس میں کسی دن انہیں یہاں بھیج دوں گا۔''

''آپ مجھے بتائیے، میرے لائق جو بھی خدمت ہوگی میں سر انجام دوں گا۔''

"نہیں بس ذرا احتیاط رہنا میرے بیٹے، میں دشمنوں کی بری نگاہوں سے تمہیں دور رکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں۔" بدرالدین نے غیاث اللہ کو اطمینان دلایا۔ اب وہ غیاث اللہ سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ جن لوگوں نے چوہدری سردار علی پر زندگی تنگ کر رکھی ہے وہی اس کے عزیز و اقارب ہیں اور ان زمینوں کے سلسلے میں وہ اس کی بھرپور مدد کر رہے ہیں۔

بہرحال غیاث اللہ نے خوشی کا اظہار کیا جب وہ جانے لگا تو بدرالدین نے پوچھا۔ "آپ نے کہا تھا غیاث اللہ صاحب کہ آپ کے اہل خاندان یہاں شاد پور آ رہے ہیں، مجھے اس بارے میں اطلاع دے دیجئے گا، میں ان کے استقبال کا بندوبست کرلوں گا۔"

"ارے بالکل نہیں، بس کسی بھی دن جیسے انہیں فرصت ہوئی وہ آئیں گے۔ اگر تم سے ملاقات ہو جائے تو انہیں زمینوں کی سیر کرا دینا ورنہ کوئی بات نہیں ہے، زیادہ وقت نہیں ہوتا ان کے پاس نہ وہ اتنا ٹھہرتے ہیں، بس آتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔ ایک آدھ دفعہ ہی آئے ہیں وہ، کیونکہ معاف کرنا شاد پور چوہدری سردار علی کی وجہ سے خاصا بدنام ہے۔ وہ بہت ہی حاسد قسم کا آدمی ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو شاد پور سے اسی لئے دور رکھا ہے۔"

بدرالدین وقت مقررہ پر ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا اور ٹرین آنے پر اس میں سوار ہو گیا تھا۔ ٹرین آج کچھ لیٹ تھی اور پھر راستے میں ایک دو جگہ دو رکی بھی تھی۔ جب شاد پور پہنچی تو اچھی خاصی رات ہو گئی تھی۔ ٹرین سے اترنے کے بعد وہ دو تین قلیوں سے ملنے کے لئے رک گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔

ٹرین یہاں کوئی دس منٹ رکی تھی۔ آج غیر معمولی طور پر کچھ مسافر اترے اور چڑھے تھے۔ پھر ٹرین نے وسل دی۔ تبھی بدرالدین کی نگاہ سامنے سے گزرنے والے ایک ڈبے پر پڑی، کوئی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا لیکن بدرالدین نے جو کچھ دیکھا اس نے اس کے پورے بدن میں شدید سنسنی پیدا کر دی۔

سیاہ برقع تھا اور اس سیاہ برقع میں وہی حسین آنکھیں نظر آ رہی تھیں جنہوں نے بدرالدین کی زندگی کو ایک مخصوص ڈگر سے ہٹا کر جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کے بدن میں کچھ لمحوں کے لئے ایسی اینٹھن پیدا ہوئی جیسے بدن مفلوج ہو گیا ہو، ٹرین آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی اور جب بدرالدین کے جسم کو اس سنسنی خیز کیفیت سے آزادی ملی تو اس کے حلق سے ایک بے معنی آواز نکلی۔ اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور اس ڈبے کی طرف بھاگا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے سب کچھ غیر مرئی انداز میں ہو رہا ہو۔ اتنی جلدی ٹرین کی رفتار اس قدر تیز نہیں ہوتی تھی لیکن اس وقت اچانک ہی اس کی رفتار خوب تیز ہو گئی تھی۔

بدرالدین کئی جگہ بری طرح ٹکراتے ٹکراتے بچا لیکن ٹرین کی رفتار کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ اس کے ساتھی قلی اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹریک کا آخری ڈبہ بھی پلیٹ فارم سے نکل گیا۔ بدرالدین بھی پلیٹ فارم کے آخری سرے تک پہنچ گیا تھا اور اب حسرت بھری نگاہوں سے ٹرین کی پچھلی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں جمیلہ ہی کی تھیں۔

وہ جس تیزی سے دوڑتا ہوا آیا تھا اس سے اس کا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنا سینہ پکڑ لیا۔ ادھر قلی اس کے پیچھے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے اور کچھ لمحوں کے بعد وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔

"کیا ہوا بدرو بھائی، کیوں بھاگے تھے تم ٹرین کے ساتھ ساتھ کوئی تھا اس میں، کون تھا...... ارے یار ان کی حالت تو کافی خراب ہو رہی ہے، چلو اٹھاؤ انہیں۔"

بدرالدین کے سینے میں سانس نہیں سما رہا تھا۔ وہ ایک طاقتور نوجوان تھا لیکن جو کیفیت اس وقت اس کی ہو رہی تھی اس نے اسے بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ قلیوں نے اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانا چاہا لیکن اس نے بمشکل تمام دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا، پھر اس نے ان میں سے کسی ایک کو پانی لانے کا اشارہ کیا۔

کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بدرالدین نے بڑی مشکل سے پانی پیا تھا۔ لوگ اب بھی استفسار کر رہے تھے۔ "کیا ہوا بدرالدین بھائی، کوئی سامان چلا گیا تمہارا۔ کوئی جاننے والا تھا کیا؟"

بدرالدین نے پھیکی ہنسی سے کہا۔ "کچھ نہیں...... پاگل ہو گیا ہوں۔"

☆......☆......☆

چوہدری سردار علی کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ حیدر علی نے اسے رحمان علی کا نہیں بتایا تھا۔

"ٹھیک جواب دیا رحمان علی نے۔ یہ گھر اب اس قابل کہاں رہا ہے یہ تو اب موت کا گھر ہے۔ اس کے در و دیوار میں اب موت بستی ہے۔ مجھے کہاں کہاں لے کر بھاگے گا حیدر علی۔ وہیں چھوڑ دیتا مرنے کے لئے۔ تو کہیں اور رہنا شروع کر دے۔ میری ماں، سارے نوکروں کو چھٹی دے کر حویلی میں تالا لگا دے اب وہاں رہ ہی کون گیا ہے۔ فیروزہ بھی چلی گئی۔ میری محبت میں آئی تھی جان دیدی بے چاری نے۔ میں اسپتال میں رہ کر کیا کروں گا۔"

"ایک کام کریں ابا جی۔" حیدر علی نے کہا۔

"ہمارا اب کون رہ گیا ہے۔ حویلی کو اب تالا لگا کر کیا کریں گے۔ کون کھولے گا اس تالے کو۔ صرف حکومت نا...... اور پھر یہ حویلی سرکاری ملکیت بن جائے گی۔ ہماری ساری جائداد زمینیں سرکار کی تحویل میں چلی جائیں گی۔ اس لئے ایک کام کیوں نہ کریں؟"

"بول تو سہی کیا؟"

"ساری دولت، ساری جائداد غریبوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ حویلی بیچ دیتے ہیں اور حاصل ہونے والی رقم کسی خیراتی ادارے کو دے دیتے ہیں۔ ممکن ہے اس کار ثواب سے ہماری زندگی بچ جائے۔"

"او تیرا بیڑہ غرق۔ کیسی دل جلا دینے والی باتیں کر رہا ہے۔ تجھے کیا میرا خیال نہیں ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ میرا دل کتنا کمزور ہے۔"

"یہ دل جلا دینے والی باتیں ہیں؟"

"تجھے معلوم ہے اس حویلی کی ایک ایک اینٹ میں میری جان ہے، تجھے معلوم ہے کہ زمینوں کے ایک ایک انچ کے لئے میں نے کیا کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے ابا جی۔ آپ کریں ان کی حفاظت۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟"

"کر سکتا ہے بیٹا تو ایک کام کر۔"

"بولو...... ابا جی۔"

"کہیں سے کچھ بندے لا دے مجھے۔ میں بھی تو دل کی آگ ٹھنڈی کروں۔ ایک ایک قبر کھدوا کر پھنکوا دوں۔ پھر نظام دین کے خاندان کی ہڈیاں سمیٹوں اور آگ میں تپا کر راکھ بنوا دوں ان کی۔ ارے کچھ تو میں بھی کروں ہائے اتنا ہی ہو جائے۔"

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے ابا جی۔ آپ مکمل علاج کرا لیں۔ یہ بہت اچھا اسپتال ہے۔ میں نے ڈاکٹروں کو آپ کے بارے میں خاص ہدایت کر دی ہے۔ ڈاکٹر مکرم بہت قابل ڈاکٹر ہیں، آپ کا پورا خیال رکھیں گے۔"

پرائیویٹ کمرہ تھا۔ ڈاکٹر مکرم کو پوری تفصیل معلوم تھی، اب ڈاکٹروں کو کیا پڑی تھی کہ ان باتوں پر توجہ دیں، وہ صرف چوہدری سردار علی کو سکون آور دوائیں دے رہے تھے۔ کوئی بیماری تو تھی نہیں سوائے خوف کے۔ ڈاکٹر مکرم نے سکون آور دواؤں سے چوہدری کو نیم غشی کی کیفیت کا شکار کر رکھا تھا۔ مستقل اس کیفیت میں بھی نہیں رکھ سکتے تھے، اس لئے جب وہ ٹھیک کیفیت میں ہوتے تو کوئی نہ کوئی نرس ان کے پاس موجود ہوتی اور ان سے باتیں کرتی رہتی۔

اس وقت بھی ایک نرس ان کے بستر کے قریب بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ چوہدری کو یہ معصوم سی شکل کی نرس بہت اچھی لگی تھی۔ وہ باتیں بھی بہت اچھی کر رہی تھی۔ چوہدری نے افسردگی سے پوچھا۔ "کیا نام بتایا تم نے اپنا بیٹی۔"

"میں نے تو آپ کو کوئی نام نہیں بتایا سر۔" نرس مسکرا کر بولی۔

"ایں ہاں۔ تمہیں کیا کہہ کر مخاطب کروں۔"

"سسٹر کہا جاتا ہے نرسوں کو۔"

"او میں تمہارے باپ کی عمر کا ہوں، تمہیں سسٹر کہتے اچھا لگوں گا۔"

"نرس کہہ لیجئے۔"

"نام کیوں نہیں بتا رہی؟"

"کھیل ختم ہو جائے گا۔"

"ایں۔ کیسا کھیل؟"

"نام بتاؤں گی تو اصلی چہرہ بھی دکھانا پڑے گا۔"

"تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"آپ مجھے سکندر کے بارے میں بتا رہے تھے، اس کے استاد نے اسے سبق دیا تھا کہ عورت سے بچ کر رہنا۔"

"ہاں بھئی یہ سب کہانیاں ہیں۔ جو لوگوں نے گھڑ رکھی ہیں۔ عورت تو ماں بھی ہوتی ہے، بہن بھی ہوتی ہے...... اور...... بیٹی بھی ہوتی ہے۔"

چوہدری کی آواز بھرا گئی اسے نور جہاں یاد آ گئی تھی۔

"آپ کو ان رشتوں کا احساس ہے چوہدری صاحب۔"

نرس کے عجیب سوال نے چوہدری کو چونکا دیا۔ "کیا مطلب؟"

"نظام دین کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔ اس کا بھی تو بھرا پرا خاندان تھا۔"

"حت تو پھر؟" چوہدری کے حلق میں تھوک اٹکنے لگا۔

"آپ احمد دین سے ناراض ہو گئے تھے۔ آپ چاہتے تو اسے معاف کر سکتے تھے۔ یہی سوچ لیتے کہ اس کی بیوی ہے، بچہ ہے۔ آپ نظام دین سے کہہ سکتے تھے کہ اپنے خاندان کے ساتھ خودکشی نہ کر میں اپنی بیوی، بہو اور بیٹی کے طفیل تجھے معاف کرتا ہوں۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟" چوہدری پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"کسے نہیں معلوم چوہدری صاحب۔ آپ کے ظلم کے بارے میں کون نہیں جانتا، کیا آپ نے، سزا سب کو بھگتنا پڑی۔ آپ کی دونوں بہوئیں آپ کی بیٹی، بیٹا۔"

"حت، تمہیں یہ بکواس کرنے کے لئے کس نے کہا۔ جاؤ، چلی جاؤ یہاں سے۔ میں ڈاکٹر سے تمہاری شکایت کروں گا۔ جاؤ یہاں سے۔"

نرس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولی۔ "ابھی دوسری نرس آنے والی ہے چوہدری صاحب۔ وہ آ جائے تو میں چلی جاؤں گی۔"

"میں کہتا ہوں تم......" سردار علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ غصے سے کانپنے لگا تھا۔

اسی وقت دروازے سے ایک نرس اندر داخل ہو گئی۔ اس نے حیرت سے یہ منظر دیکھا پھر کہنے لگی۔ "کیا ہوا۔ یہ چوہدری صاحب کی کیا حالت ہو رہی ہے؟"

"یہ مجھ پر طنز کر رہی ہے۔ مجھے میرے ظلم کی داستان سنا رہی ہے۔"

"مظلوم تو یہ ہے چوہدری صاحب۔ آپ نے اس کے شوہر کو موت کی سزا دلوائی ہے۔ اسے بیوہ اور اس کے معصوم بچے کو یتیم کیا ہے۔"

"کیا؟" چوہدری کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے ٹھنڈے پانی میں ڈبو دیا ہو۔

"حسینہ ہے یہ۔ چوہدری نظام دین کی بہو، احمد دین کی بیوی یہ دیکھیں۔ دوسری نرس نے آگے بڑھ کر پہلی نرس کے چہرے پر کچھ ٹٹولا پھر ایک خول سا اتار دیا۔ چوہدری نے اس بدلے ہوئے چہرے کو دیکھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"میں نے بتایا تھا چوہدری جی کو کہ یہ میرا اصلی چہرہ نہیں ہے۔"

"چوہدری صاحب تمہیں تو پہچانتے بھی نہیں ہوں گے۔ چوہدری جی یہ احمد دین کی بیوی ہے۔ اور میں...... مجھے تو آپ جانتے ہیں......"

دوسری نرس نے اپنے چہرے سے بھی ویسا ہی نقاب اتار دیا...... چوہدری واقعی اسے پہچانتا تھا۔ وہ جمیلہ تھی۔ چوہدری کی حویلی میں آ چکی تھی نور جہاں کو اس نے ہی ہلاک کیا تھا۔

"ارے میں کہاں جاؤں۔ ارے میں کیا کروں...... کوئی ہے...... کوئی کوئی...... کوئی...... ہے۔" اپنی دانست میں چوہدری حلق پھاڑ کر چیخا تھا اور بات ہے کہ اس کی آواز نہیں نکلی تھی لیکن اسی وقت دروازہ دوبارہ کھلا اور سفید کوٹ میں ملبوس ایک نوجوان ڈاکٹر اندر داخل ہو گیا۔

"مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ ڈاکٹر۔ یہ دونوں...... یہ دونوں روحیں ہیں۔ مجھے ہلاک کرنے آئی ہیں۔"

ڈاکٹر نے دونوں نرسوں کو دیکھا پھر چوہدری کو...... پھر اس نے ایک نرس کو مخاطب کیا...... "کیا بات ہے سسٹر۔"

"سر میں تو تین گھنٹے سے یہاں ڈیوٹی دے رہی تھی۔ چوہدری صاحب مجھ سے باتیں کر رہے تھے اچانک یہ مجھ سے ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں باہر نکل جاؤں۔"

"بکواس...... بکواس کر رہی ہے یہ۔ یہ مجھ سے......" چوہدری نے گھور کر اسے دیکھا اور چونک کر بولا...... "کک کہاں گئی۔ کہاں گئی وہ۔ اور تم۔" اس نے دوسری نرس کو دیکھا۔ پھر سر کے بال نوچنے لگا۔ "انہوں نے پھر چہرے بدل لیے۔ ان میں سے ایک نظام دین کی بہو ہے دوسری بیٹی۔ ڈاکٹر صاحب یہ دونوں روحیں ہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ دونوں بد روحیں ہیں۔"

"آپ دونوں جائیے، ڈاکٹر محسن کو بھیج دیں۔ ان سے کہیے چوہدری سردار علی کے کمرے میں آ جائیں۔"

"میرے خدا...... میرا پیچھا ان سے کیسے چھوٹے گا۔ آہ میں کیا کروں!"

ڈاکٹر محسن ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا وہ سینئر ڈاکٹر تھا اور اس وقت اسپتال کا انچارج تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے سردار علی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے چوہدری صاحب؟"

"دونوں آئی تھیں۔ میں پاگل نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب تمہیں اللہ کا واسطہ میرا ایک کام کر دو۔"

"جی جی کہیے چوہدری صاحب"

"مجھے ایک زہر کا ٹیکہ لگا دو۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ ان بد روحوں نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے، خدا کے لیے مجھے اس زندگی سے نجات دلا دیں۔ ڈاکٹر صاحب میرے اوپر بہت بڑا احسان ہوگا آپ کا۔ میں جینا نہیں چاہتا ڈاکٹر صاحب، میں جینا نہیں چاہتا۔ مرنا ہے مجھے ان روحوں کے ہاتھوں مرنا ہے، آپ خدا کے لیے میرا یہ کام کر دیں۔"

آپ تھکیں گے چوہدری صاحب، آپ یقیناً تھکیں گے اور ان روحوں سے آپ کو نجات مل جائے گی، ہماری ذمے داری ہے کہ ہم آپ کی حفاظت کریں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں چوہدری صاحب، میں یہاں مزید ڈیوٹی لگوا دوں گا۔"

"خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب، مجھے اس کمرے سے نکال لیں، میں اب ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہنا چاہتا، آپ مجھے جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیں، وہاں دوسرے مریض تو ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی مہربانی ہوگی، آپ مجھے جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیں۔"

"وہ بھی ہو جائے گا، آپ بے فکر رہیں۔"

"ارے کمال کر رہے ہیں آپ، وہ دونوں صاف نکل گئیں۔ پہلے ایک تھی، پھر دو ہو گئیں۔ بابا آپ اتنا سا کام نہیں کر سکتے، میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں......" چوہدری سردار علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کسی قیمت پر نہیں رہوں گا یہاں، مجھے جنرل وارڈ میں بھیج دو۔"

"اچھا اچھا آپ سکون تو لیجئے۔ ڈاکٹر افتخار، چوہدری صاحب کو ایل سی فائیو دو، تب تک ہم ان سے بات کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر افتخار وہی جونیئر ڈاکٹر تھا، وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

"بات بہت بڑی ہے، پہلے وہ مجھ سے بیٹھ کر باتیں کرتی رہیں، پھر اس نے مجھے نصیحتیں کرنا شروع کر دیں، کہنے لگی میں نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا تو مجھے بھگتنا پڑے گی۔

بات سنو! ڈاکٹر، میں کہتا ہوں مجھے ہلاک کر دو، اب کیا کروں گا جی کر اور ویسے بھی یہ بات میں جانتا ہوں کہ چھوڑے گا نہیں نظام دین مجھے، کرے گا کچھ نہ کچھ میرے ساتھ۔" چوہدری بڑبڑاتا رہا۔

جونیئر ڈاکٹر انجکشن تیار کر کے لے آیا، یہ خواب آور انجکشن تھا جو چوہدری کے بازو میں انجیکٹ کر دیا گیا۔ چوہدری بڑبڑاتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کی آواز ڈوبنے لگی، پھر وہ گہری نیند سو گیا۔

سینئر ڈاکٹر محسن نے لیڈی ڈاکٹر سے کہا۔ "چوہدری سردار علی بہت بڑا آدمی ہے، جو واقعات اس کے ساتھ پیش آئے ہیں وہ تو آپ کو معلوم ہی ہوں گے ڈاکٹر صوفیہ۔ بہرحال بڑی عبرت ناک کیفیت ہے لیکن کل صبح چوہدری کے صاحبزادے حیدر علی کو کال کر لیا جائے۔ مجھے اندیشہ ہے اس بات کا کہ چوہدری سردار علی اب اس کمرے میں نہیں رہے گا، اگر حیدر علی اسے جنرل وارڈ میں شفٹ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں تو ہم ایسا کر دیں گے، بظاہر کوئی بیماری تو ہے نہیں سردار علی کو، ساری رپورٹیں کلیئر ہیں لیکن بس اسے ضمیر کی بیماری لاحق ہو گئی ہے، وہ اپنے ضمیر کا مریض ہے، اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا ہے۔

دوسرے دن اسپتال سے حیدر علی کو فون کیا گیا اور پریشان حال حیدر علی اسپتال پہنچ گیا۔ اس کو حالات سے آگاہ کیا گیا۔

"نہیں ڈاکٹر، کیا ہوا اور کیسے ہوا، یہ میں اور آپ نہیں جان سکتے لیکن چوہدری صاحب غلط نہیں کہہ رہے، ایسا ہی سب کچھ ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔"

بڑے ڈاکٹر نے رات کی ڈیوٹی والے ڈاکٹر محسن کو دیکھا اور پھر حیدر علی سے پوچھا۔ "پھر آپ بتائیے کیا کریں، چوہدری صاحب کو جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیں۔"

"کوئی ہرج نہیں ہے، آپ ان کی بہترین نگہداشت کریں۔ ہو سکتا ہے وہاں ان کی ذہنی حالت کچھ بہتر ہو جائے۔"

"آپ کی اجازت سے ہم ایسا کر لیتے ہیں اور آپ اطمینان رکھیے ان کی بھرپور نگہداشت کی جائے گی۔"

"بے حد شکریہ۔" حیدر علی نے کہا۔

بڑے ڈاکٹر نے ڈاکٹر محسن سے کہا۔ "آپ ڈیوٹی ڈاکٹر کو ہدایت کر دیں کہ وہ چوہدری سردار علی کو جنرل وارڈ کے بیڈ نمبر سات پر شفٹ کر دیں۔"

چوہدری سردار علی کو بے ہوشی ہی کے عالم میں جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا، یہاں برابر برابر بستر لگے ہوئے تھے۔ چوہدری کا خیال تھا کہ شاید وہ خوفناک روحیں جنرل وارڈ میں نہ آئیں کیونکہ وہاں دوسرے مریض بھی ہوتے ہیں۔ دن کوئی ساڑھے گیارہ بجے چوہدری کو ہوش آیا تھا اس نے سہمے ہوئے انداز میں آنکھیں کھولیں، ڈاکٹروں نے غذائی کیفیت بہتر کرنے کے لیے طاقت کے کچھ انجکشن چوہدری کو لگائے تھے اور ایک ڈرپ بھی لگا دی گئی تھی۔

چوہدری صاحب کی نگاہیں ادھر اُدھر بھٹکنے لگیں، قرب و جوار میں مریضوں کے بستر دیکھ کر اس کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آئے تھے اور اس نے گہری گہری سانسیں لی تھیں۔ ایک وارڈ بوائے قریب سے گزرا تو اس نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بولا۔

"یہ جنرل وارڈ ہے نا؟"

"جی بابا صاحب۔"

"یہاں کسی کے آنے کا تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟"

"نہیں، بابا صاحب کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"نہیں۔ مم...... میرا مطلب ہے یہاں روحیں تو نہیں آتیں۔" وارڈ بوائے نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا تھا پھر اس نے صورت حال سمجھ کر کہا۔ "نہیں یہاں روحیں نہیں آتیں۔"

"خدا کا شکر ہے، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"میں ڈاکٹر صاحب کو جا کر بتاتا ہوں۔"

وارڈ بوائے اسے رحم آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

چوہدری کا دن بڑا پرسکون گزرا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کی خاص نگہداشت کی تھی۔ شام کو چار بجے کے قریب حیدر علی اس سے ملنے آیا۔

"ابا جی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ اب آپ یہاں پرسکون ہیں۔"

"ہاں یہ جگہ تو بڑی اچھی ہے، بڑی رونق رہتی ہے یہاں۔ ہائے میں رونقوں کو کیسا ترسا ہوا ہوں، پہلے میری حویلی میں کتنی رونق رہا کرتی تھی۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے حیدر علی، حویلی میں تالا لگا دیا کیا؟"

"کچھ نہیں کیا ہے ابھی میں نے ابا جی۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں، آپ آرام کریں، میں چلتا ہوں۔"

"ایک بات کہوں تم سے حیدر علی۔ کوئی کام ہے تمہیں کیا؟"

"نہیں ابا جی بتائیں، آپ کو کوئی کام ہو تو بتائیں؟"

"ڈاکٹروں سے بات کر لو، میرے برابر کا بستر لے لو، تم بھی یہیں آرام کرو، کیا کریں گے حویلی جا کر اب کون ہے وہاں ہمارا، رحمان علی بھی آسیہ کو وہاں نہیں آنے دے گا، تم مجھے بتا چکے ہو۔"

حیدر علی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، باپ کی بے بسی پر اس کا دل خون کے آنسو رو پڑا تھا۔ کس سے رحم کی بھیک مانگیں، نظام دین اور اس کا خاندان انہیں معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

بہرحال رات ہو گئی، اسپتال میں مکمل خاموشی چھائی تھی۔ کبھی کبھی وارڈ بوائے نرسیں یا ڈیوٹی ڈاکٹر چکر لگا کر چلا جاتا تھا۔ چوہدری کو نیند نہیں آ رہی تھی، دن میں خوب سویا تھا، رات کو ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ خواب آور دوا لے کر سونا پسند کرے گا تو اس نے کہا۔ "نہیں بھائی تنگ آ گیا ہوں یہ دوائیں کھاتے کھاتے، مجھے کوئی مرض نہیں ہے، بس تقدیر کی دوائیں کھا رہا ہوں۔"

پورا ماحول سنسان ہو گیا تھا، کبھی کبھی کسی مریض کے کھانسنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی اور اس کے بعد پھر خاموشی مسلط ہو جاتی۔

رات کا تقریباً ایک بجا ہوگا، اچانک ہی ایک عجیب سی ٹھنڈک فضا میں پیدا ہونے لگی اور چوہدری سردار علی کو یوں لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے، اس نے تھوڑی سی گردن اٹھائی اور آنکھیں ادھر اُدھر گھمانے لگا، کچھ تھا یقیناً کچھ تھا۔

(جاری ہے)

خوف

ایم اے راحت

آخری قسط

یہ ٹھنڈک، یہ کیفیت بے معنی نہیں تھی۔ بظاہر کچھ نظر نہیں آیا لیکن اچانک ہی ''شی شی'' کی ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی کسی کو مخاطب کرنے کے لئے آواز نکالتا ہے۔ سردار علی اچھل پڑا۔ اس نے ایک بار پھر ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو اسے مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ ''ادھر، اس طرف۔''

یہ آواز اس کے برابر کے بیڈ سے آرہی تھی۔ اس نے چونک کر ادھر دیکھا اور پھر اس کا سانس گھٹنے لگا۔ برابر کے بیڈ کے مریض نے اپنے چہرے سے چادر ہٹائی تھی اور وہی اسے دیکھ کر ''شی شی'' کر رہا تھا۔ دن کی روشنی میں چوہدری سردار علی نے اس مریض کو دیکھا تھا۔ ایک عمر رسیدہ مدقوق سا بوڑھا آدمی تھا۔ درمیانے درجے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس وقت یہ چہرہ اس مریض کا نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ نظام دین اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ چوہدری سردار علی کی آواز تو بند ہوگئی تھی لیکن آنکھیں اسے دیکھے جارہی تھیں۔

''یار معاف کرنا چوہدری، تم سے ملتے رہنے کو دل چاہتا ہے، بھاگتے پھر رہے ہو، ہم سے...... آؤ باتیں کرتے ہیں تھوڑی سی۔''

الفاظ صاف اور بالکل واضح تھے۔ اچانک ہی چوہدری کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور دوسرے لمحے وہ پلنگ سے اتر کر بھاگا لیکن توازن قائم نہ رکھ سکا اور بائیں جانب کے مریض پر جا گرا۔ مریض بھی حلق پھاڑ کر چیخا تھا اور اس کے بعد وہ چیخم دھاڑ مچی کہ صرف اس وارڈ کے مریض ہی نہیں بلکہ آس پاس کے تمام لوگ جاگ گئے۔

نرسیں اور ڈاکٹر وحشت زدہ انداز میں وارڈ میں داخل ہوئے تھے۔ سارے کے سارے سہمے ہوئے تھے۔ ادھر برابر کے مریض نے سر پر چادر اوڑھ لی تھی۔ وارڈ بوائے اور ڈاکٹر صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے اس چیخ پکار کو کنٹرول کیا۔ ڈاکٹر نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یار! اس شخص نے تو زندگی عذاب کر کے رکھ دی ہے، کیا ہوا تھا اس سے پوچھو؟''

''ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب، یہ بہت بڑا آدمی ہے، چوہدری سردار علی نام ہے اس کا، بڑے ڈاکٹر صاحب نے خصوصی طور پر اس کی نگہداشت کے لئے کہا ہے۔'' دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔

''وہ ٹھیک ہے لیکن باقی مریض بھی گھاس کوڑا تو نہیں ہیں، کیا ہوا؟ کیا تکلیف ہے آپ کو جناب؟''

''وہ...... وہ اس طرف نظام دین......'' چوہدری سردار علی نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

''اس طرف نظام دین، کون نظام دین؟'' ڈاکٹر داہنی سائیڈ کے بیڈ پر آگئے۔ داہنی سائیڈ کا وہ مدقوق مریض بھی گردن اٹھائے اس ہنگامہ آرائی کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ...... خدا کی قسم، خدا کی قسم اس بیڈ پر نظام دین ہی تھا، بات کی تھی اس نے مجھ سے، ارے مجھے معاف کرو ڈاکٹر صاحب، آپ لوگ جانتے ہو کہ میں کوئی بیمار آدمی نہیں ہوں۔ کہیں بھی چین نہیں ہے میرے لئے۔ اب کونسی زبان میں کہوں کہ میں مرنا چاہتا ہوں، ایسا بھی کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی موت کا خواہشمند ہو اور موت اس پر تھوکتی ہوئی آگے نکل جائے۔ کیا کروں میں کیا کروں۔'' چوہدری سردار علی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

چوہدری کو تسلی دی گئی اور کہا گیا کہ وہ فی الحال آرام کرے اور دوسرے مریضوں کو براہ کرم تنگ نہ کرے۔ کل اس کے لئے کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیا جائے گا۔

چوہدری کے پاس دو وارڈ بوائے کی ڈیوٹی لگادی گئی لیکن چوہدری نے کہا تھا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے تاکہ کسی کو دیکھ نہ سکے۔ اس کے کانوں میں روئی لگادی جائے تاکہ کسی کی آواز نہ سن سکے۔ فی الحال اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ چوہدری کو نیند کا انجکشن دے دیا جائے۔

دوسری صبح ڈاکٹروں نے آپس میں میٹنگ کی اور کہا کہ اس طرح تو اسپتال کا پورا ماحول تباہ و برباد ہو جائے گا۔ چوہدری سردار علی کچھ زیادہ ہی ہنگامہ آرائی کر رہا ہے۔ حیدر علی کو طلب کر لیا گیا۔ ویسے بھی حیدر علی کو صبح ان کے پاس آنا ہی تھا۔ وہ وقت سے کچھ پہلے آگیا اور بڑے ڈاکٹر نے حیدر علی سے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں حیدر علی صاحب۔ ظاہر ہے ہم دوسرے مریضوں کی طرح آپ کے مریض کا بھی احترام کرتے ہیں لیکن رات کو جو واقعات پیش آئے ہیں اس نے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ چوہدری صاحب کو کسی دماغی امراض کے اسپتال میں داخل کرا دیں۔ ان کے ذہن پر گزرے ہوئے واقعات کا بہت بوجھ ہے۔''

حیدر علی نے چوہدری سردار علی سے بات کی تو اس نے کہا۔ ''خدا کی قسم کھا رہا ہوں۔ دماغ بالکل ٹھیک ہے میرا۔ وہ میرے پاس آکر ڈراتے ہیں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ مجھے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ چلو ایک کام کرو، واپس حویلی چلو۔ مجھے حویلی میں اکیلا چھوڑ دو۔ میرا خیال ہے میں کسی اور جگہ چین سے نہیں رہ سکتا۔ حمید خاں کے ہاں تھا تو دونوں میاں بیوی آگئے تھے، جہاں بھی کہیں ہوتا ہوں وہ آجاتے ہیں اس وقت وہ نند بھاوج آگئی تھیں۔ نرسیں بن کر، احمد دین بھی آگیا تھا، ارے بس حویلی ہی میں ڈال دو مجھے۔ اب کہیں نہیں جاؤں گا، کسی سے نہیں کہوں گا کہ میرے پاس آکر رہو، بس مجھے حویلی میں چھوڑ دو۔''

حیدر علی نے بے چارگی کے عالم میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ چوہدری سردار علی کو حویلی واپس لے جائے وہ کم از کم حویلی کی چار دیواری میں ہی رہے گا، یہاں تو جگہ جگہ رسوائی ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

جتنے بھی لوگ چوہدری سردار علی سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ تھے اب ان کے دلوں میں اس کے لئے نفرت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خاندان والے پہلے ہی اس سے دور تھے اور اب تو انہوں نے اسے اپنا رشتے دار ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا داماد رحمان علی بھی جب تنہائی میں اپنے بارے میں سوچتا تو ایک عجیب سے خوف کا شکار ہو جاتا تھا۔ والدین سے اس کی باتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ وہ اس سے کہتے تھے کہ رحمان علی آسیہ کو طلاق دے دے اسے چھوڑ دے۔ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے، جس طرح فیروزہ اور فردوس اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، اسی طرح تیری زندگی بھی خطرے میں ہے۔ نظام دین کسی بھی اس شخص کو معاف نہیں کرے گا جس کا تعلق سردار علی سے ہو۔ رحمان علی خود بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا، چنانچہ وہ رسیاں تڑاتا رہتا تھا۔ پھر اسے ایک موقع مل گیا۔ اپنے کاروباری معاملات کے لئے اسے باہر جانا تھا۔ آسیہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت خوفزدہ ہوگئی۔

''میں تو مر جاؤں گی رحمان علی، خدا کے لئے تم مجھے ابا کی حویلی بھیج دو۔''

''تم چاہو تو جا سکتی ہو آسیہ لیکن ذمہ دار خود ہوگی۔'' آسیہ خود بھی خوفزدہ تھی لیکن اکیلے گھر میں وہ نہیں رہ سکتی تھی۔ پہلے بھی حیدر علی نے آسیہ کو اپنے پاس بلوایا تھا لیکن اس وقت رحمان علی نے انکار کر دیا تھا۔ اب رحمان علی بھی مجبور ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے آسیہ کو جانے کی اجازت دے دی اور خود اپنے کام سے چلا گیا۔

آسیہ خوشی خوشی باپ کے گھر پہنچی تھی، یہ وہ وقت تھا جب چوہدری سردار علی اسپتال سے گھر آگیا تھا۔ آسیہ اچانک ہی اپنے لے پالک بچے کے ساتھ پہنچی تو باپ اور بھائی اسے دیکھ کر خوش ہوگئے۔

''رحمان علی نے تمہیں آنے کی اجازت دے دی آسیہ یا تم خود اپنی مرضی سے چلی آئی ہو۔''

''نہیں حیدر بھائی! رحمان علی کسی کام سے شہر جا رہے تھے، میں تنہا گھر میں کیا کرتی۔ میں نے ان سے یہاں آنے کی اجازت لے لی۔''

''یہ وہ بچہ ہے جسے تم نے گود لیا ہے۔'' حیدر علی نے پوچھا۔

''ہاں نوردین ہے اس کا نام۔''

''ہوں، پیارا بچہ ہے، آسیہ بڑا اچھا کیا تم نے کہ یہاں آگئیں۔ میں تو زندگی سے عاجز آچکا ہوں، اباجی کو دیکھو، کیا حال ہو گیا ہے اب تم ہی انہیں سنبھالو۔''

چوہدری سردار علی بھی آسیہ کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ اس نے بچے کو بہت پیار کیا تھا۔ خوبصورت بچہ توتلی زبان میں چوہدری سردار علی سے بھی معصوم معصوم باتیں کرتا رہا تھا۔

''آہ کاش، مجھے زندگی مل جائے، کتنا پیارا بچہ ہے آسیہ، میرے گھر میں تو کبھی بہار آ ہی نہیں، پتہ نہیں قدرت کی کیا مرضی تھی، چلو ٹھیک ہے، مولا جس حال میں بھی رکھے۔''

آسیہ کو نوردین کے وجود سے کچھ وحشت سی ہوگئی تھی۔ بڑی چاہت سے اس بچے کو یتیم خانے سے لائی تھی لیکن اس رات جب اس نے اس کی لمبی زبان اپنی گردن پر محسوس کی تھی اس رات سے اس کا دل خوف سے بھر گیا۔ بار بار اپنے آپ کو سمجھاتی کہ سب کچھ وہم ہے، ان دنوں چونکہ وہ بڑے حالات سے گزر رہی ہے اس لئے وہم زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے۔

یہاں حویلی میں بھی جو کمرہ اسے دیا گیا تھا اس میں اس نے نوردین کے لئے ایک الگ بستر لگوا دیا تھا۔ اس دن کے بعد نوردین کی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہیں ہوئی تھی جس سے آسیہ خوفزدہ ہوتی، البتہ وہ وقت وہ دن نہیں بھولا جا سکتا تھا جب نوردین اسے دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

چوہدری سردار علی کی حویلی بھوت گھر بنی ہوئی تھی۔ یہاں صرف خوف کا بسیرا تھا، آسیہ نے محسوس کیا تھا کہ حیدر علی اب حویلی سے بھاگ جانا چاہتا ہے، کہاں تک باپ کو سنبھالے رکھتا، البتہ آسیہ کے آجانے سے چوہدری سردار کی وحشت میں کچھ کمی آگئی تھی۔ وہ آدھی رات تک آسیہ کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ نوردین اسے بہت پسند تھا۔

پھر غالباً پانچویں یا چھٹے دن کی بات ہے آسیہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے چوہدری سردار علی اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آسیہ یہاں آتو گئی ہے، کہیں اسے حویلی میں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر وہ آسیہ کے کمرے کے دروازے کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ ایک دو بار اس نے اندر جھانکنے کی بھی کوشش کی تھی اور آسیہ کو سوتے ہوئے دیکھ کر مطمئن ہو کر واپس آجاتا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ آسیہ کے پاس سے اٹھا تھا لیکن نجانے کیوں اس وقت اس کے دل پر ایک بوجھ سا طاری ہو گیا تھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ آسیہ کو جا کر دیکھے، چنانچہ وہ اپنے کمرے سے نکلا اور اچانک ہی اس کے پورے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

اس نے دیکھا کہ نوردین دروازہ کھول کر باہر نکلا ہے۔ اس عمر کے بچے سے اس بہادری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ رات کے اس لمحے دروازہ کھول کر باہر آئے۔

چوہدری سردار علی رک گیا۔ نوردین چوروں کی طرح دبے قدموں سے چلتا ہوا راہداری کے دوسرے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ نجانے کیوں چوہدری سردار علی کے دل میں ایک عجیب سا خیال بیدار ہوا۔ وہ آگے بڑھا اور نوردین کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

راہداری کے آخری سرے پر ایک زینہ بنا ہوا تھا جو اوپر کی طرف جاتا تھا۔ حویلی کی دوسری اور تیسری منزل خالی پڑی رہتی تھی۔ یہ بچہ وہاں کیا کرنے جا رہا ہے؟

دیکھتے ہی دیکھتے بچہ اوپری منزل پر پہنچ گیا۔ چوہدری پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا اوپر جانے والی سیڑھیاں عبور کرنے لگا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو بچہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

تھوڑے فاصلے پر ایک ستون تھا۔ ہمت کر کے چوہدری اس ستون کے پاس پہنچ گیا، تب اس نے بچے کو دیکھا۔ راہداری کی دیوار سے لگا ہوا کھڑا تھا۔ وہیں پر ایک عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہاں مدھم سی روشنی تھی، روشنی اتنی بھی نہیں تھی کہ چہروں کے نقوش نظر آسکیں۔

بچہ عورت سے باتیں کر رہا تھا، یہ باتیں چوہدری کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھیں۔ اس پر تو ویسے ہی غشی سی طاری ہو رہی تھی۔ پھر عورت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بچہ اس کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ آگے جا کر یہ راہداری پھر اسی سمت گھوم جاتی تھی، جدھر نیچے جانے والے زینے تھے۔ جب چوہدری اس راہداری میں گھوما تو وہاں بچہ نظر آیا نہ عورت۔ چوہدری کے ہوش و حواس گم ہوئے جا رہے تھے، اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری ہو رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ اپنی جگہ کھڑا دوسری آہٹوں کا منتظر رہا۔ اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کچھ لمحوں کے بعد وہ دونوں دوبارہ نظر آئیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، ممکن ہے دونوں نیچے اتر گئے ہوں۔

دفعتاً ہی چوہدری کو آسیہ کا خیال آیا اور دوسرے لمحے وہ اپنی بساط بھر دوڑتا ہوا نیچے پہنچا اور آسیہ کے کمرے کی جانب چلا۔ آسیہ کے کمرے میں مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ اس نے بے اختیار شیشوں سے اندر جھانکا۔ آسیہ گہری نیند سو رہی تھی اور اس کے برابر ہی بچہ بھی موجود تھا۔ وہ آرام سے سو رہا تھا۔ چوہدری نے دور دور تک کے علاقے کو چھان مارا لیکن وہاں عورت نظر نہیں آئی تھی۔

وہ آخرکار اپنے بستر پر پہنچ گیا اور اس کا ذہن نجانے کیسے کیسے احساسات کا شکار ہو گیا۔

دوسرے دن اس نے اپنے آپ کو بالکل پرسکون رکھا۔ آسیہ بھی پرسکون تھی اور اپنے معمولات میں مصروف تھی۔ کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے اس نے حیدر علی کو طلب کیا۔ حیدر علی اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ ''حیدر علی میرا ایک کام کرو گے؟''

''جی اباجی بتایئے۔'' حیدر علی کے لہجے میں بیزاری جھلکنے لگی تھی۔

''بیٹے میں گڑھی حیدر بیگ جانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے اباجی میں انتظام کر دوں گا۔''

حیدر علی نے پرانے نوکر امام دین کو ساتھ کر دیا۔

وہ امام دین کے ساتھ چل پڑا۔ گڑھی حیدر بیگ میں درحقیقت چوہدری کے لئے بڑی نفرت پائی جاتی تھی۔ چوہدری نے ڈرائیور سے کہا۔ ''ڈرائیور ذرا ان زمینوں کی طرف چلو جو نظام دین کی تھیں۔''

''جی چوہدری جی۔'' ڈرائیور نے جیپ کا رخ زمینوں کی جانب کر دیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چوہدری کی اپنی زمینیں بھی تھیں۔ اس نے اپنی زمینوں کی حالت زار دیکھی، حالانکہ ہاری بدستور کام کر رہے تھے اور ان کی محنت میں کوئی کمی نہیں تھی لیکن زمینیں تھیں کہ مرجھائی پڑی تھیں۔

چوہدری نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ زمینوں کا انسان سے ایک انوکھا رشتہ ہوتا ہے، کبھی کبھی وہ اولاد جیسی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ اپنی زمینوں کی حالت زار دیکھ کر چوہدری کا دل دکھا لیکن پھر جب اس نے نظام دین کی زمینوں کو دیکھا تو اسے بڑی عبرت کا احساس ہوا۔ ان زمینوں پر بدستور ناگ پھنی اگی ہوئی تھی اور اب یہ ناگ پھنی کافی اونچی ہو گئی تھی۔ انتہائی بھیانک ماحول تھا۔ بعد میں چوہدری نے سنا کہ اب لوگ ان زمینوں کی طرف رخ بھی نہیں کرتے۔ شام مغرب کے بعد ادھر سے کوئی گزرتا بھی نہیں ہے۔ چوہدری ٹھنڈی سانس بھر کر واپس اپنے ڈیرے کی جانب چل پڑا۔ اس کے دل میں ایک خیال تھا جس کی وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

ڈیرے پر اسے کچھ لوگ ملنے آگئے یہ وہ لوگ تھے جن کا چوہدری سے کوئی نہ کوئی کاروباری رشتہ تھا۔ عام طور سے چوہدری بڑی رعونت سے ان سے ملا کرتا تھا لیکن اب اس کا انداز بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔

پھر اس نے امام دین سے کہا۔ ''امام دین، میں ذرا نظام دین کے گھر چلنا چاہتا ہوں۔''

امام دین نے خوفزدہ نگاہوں سے چوہدری کو دیکھا اور بولا۔ ''وہاں تو تالا پڑا ہوا ہے جناب۔''

''یار مجھے کچھ کام ہے وہاں، تالے کی چابی کس کے پاس ہوگی؟''

''پتہ نہیں چوہدری صاحب، تالا تو شاید حکومت کا پڑا ہوا ہے۔''

''یار امام دین باتیں بنائے جا رہا ہے اتنی کوشش نہیں کر سکتا کہ ہم لوگ اندر داخل ہو سکیں۔''

''چوہدری صاحب جائزہ لے لیتا ہوں کسی ایسی جگہ کا جہاں سے چوری چھپے اندر داخل ہوا جا سکے۔ اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔''

چوہدری نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ''ٹھیک ہے جا کر دیکھ اور مجھے بتا کوئی ایسی جگہ ہے یا نہیں یا پھر میں خود بھی چلوں۔''

''نہیں میں دیکھ آتا ہوں پھر رات کی تاریکی میں ہم لوگ چلیں گے۔''

امام دین چلا گیا۔ پھر وہ ایک ایسی جگہ تلاش کر آیا جو جانے کے کام آسکے۔

''میں اندر جا سکوں گا وہاں سے؟'' چوہدری نے پوچھا۔

''ہاں چوہدری صاحب کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اینٹوں کے کچھ ڈھیر پڑے ہوئے ہیں گھر کے پچھواڑے، ان سے اندر گھسا جا سکتا ہے۔''

یہ جگہ واقعی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ چوہدری سردار علی، امام دین کے سہارے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دوسرے انتظامات بھی کر لئے تھے، احاطے میں آنے کے بعد گھر کے اندر داخل ہونا بھی مشکل نہیں ہوا، بہرحال نظام دین کی موت کے بعد یہ گھر اور اس کی زمینیں ایک عجیب سی کیفیت اختیار کر گئی تھیں اور لوگ ان سے دور ہی دور رہا کرتے تھے۔ اس لئے چوہدری سردار علی کو گھر میں گھومنے پھرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔

امام دین ساتھ تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نجانے کیوں اس پر ایک عجیب سی دہشت سوار تھی لیکن چوہدری کسی قدر نارمل انداز میں گھر کے مختلف حصوں میں گھوم رہا تھا۔ پھر ایک کمرے میں رک کر اس نے آس پاس کا جائزہ لیا، کمرے میں روشنی کر دی گئی تھی۔ بجلی کے کنکشن وغیرہ بدستور موجود تھے اس لئے کمرہ خوب روشن ہو گیا۔ یہاں بہت سی الماریاں رکھی تھیں لیکن چوہدری کو ان الماریوں کی تلاشی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

دیوار پر ایک تصویر آویزاں تھی جس میں نظام دین کے پورے خاندان کے لوگ موجود تھے اور چوہدری غالباً ایسی ہی کسی چیز کی تلاش میں آیا تھا اس نے وہیں کھڑے کھڑے تصویر کو دیکھا اور پھر اس کے حلق سے ایک ہلکی سی آواز نکل گئی۔ تصویر میں چوہدری نظام دین، اس کی بیوی شریفاں، بیٹا احمد دین، احمد دین کی بیوی حسینہ، حسینہ کا بیٹا نوردین اور چوہدری کی بیٹی جمیلہ سب کے سب موجود تھے۔ چوہدری کی نگاہیں نوردین پر جم گئی تھیں۔ پھر اس کے منہ سے مدھم لہجے میں نکلا۔ ''نظام دین، احمد دین، نوردین تو میرا خیال ٹھیک تھا۔'' یہ تصویر سو فیصد اسی بچے کی تھی جو اس وقت آسیہ کے پاس موجود تھا۔

☆......☆......☆

بدرالدین، جمیلہ کی قبر کے پاس خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر شکایت کے آثار تھے۔ بہت دیر تک وہ خاموشی سے قبر کو دیکھتا رہا تھا جب کافی دیر گزر گئی اور کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی جس سے اندازہ ہو کہ جمیلہ اس کے آس پاس موجود ہے تو اس نے کہا۔ ''آج مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھو گی کہ میں اتنا خاموش کیوں ہوں، بتاؤ پوچھو گی یا نہیں......؟'' کوئی جواب نہیں ملا تو بدرالدین نے پھر کہا۔ ''انسان اپنے آپ کو بلاوجہ ہی نجانے کیا سے کیا سمجھ لیتا ہے، میں بڑے مان سے یہاں آتا ہوں، یہ سوچ کر کہ تم اور تمہارے خاندان کے وہ تمام لوگ جن کا بیشک مجھ سے زندگی میں کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن اب ان کی موت کے بعد مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری بدنصیبی نے مجھے ان اپنوں سے دور رکھا، جمیلہ! میں نے تو اپنی دنیا تمہارے ہی درمیان آباد کر لی ہے، مجھے بالکل احساس نہیں ہوتا کہ تم لوگ زندہ نہیں ہو، تم اگر مجھے نظر انداز کر دو گی تو میں مر جاؤں گا، خودکشی حرام چیز ہوتی ہے ورنہ میں یہ سوچتا کہ مر کر ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں، ان اپنوں کے درمیان آجاؤں، مجھے بتاؤ تم اگر اس طرح آسکتی ہو تو مجھ سے کیوں نہیں ملتیں، جمیلہ میں نے تمہیں ریل میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا تھا، میری کیا حالت ہوئی، میں بتا نہیں سکتا، یہ شکایت ہے مجھے تم سے، سمجھیں، مجھے تم سے شکایت ہے۔''

جواب میں ایک مدھم ہنسی سنائی دی تھی۔ یہ آواز ہوا کے جھونکے کی طرح آئی تھی اور وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔ ''ممکن ہے کوئی پرندہ چیخا ہو، ممکن ہے ہوا نے کسی چیز سے ٹکرا کر یہ آواز پیدا کی ہو لیکن میں اسے تمہاری ہی ہنسی کی آواز سمجھ رہا ہوں، پاگل جو ہوتا جا رہا ہوں تمہارے لئے، جمیلہ مجھے بتاؤ، جمیلہ! مجھے جواب دو تم شاد پور آئی تھیں نا......؟''

لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ مقررہ وقت تک وہ بیٹھا رہا۔ آج اسے یہی محسوس ہوا تھا جیسے جمیلہ یا اس کے اہل خاندان اس سے مخاطب نہ ہوئے ہوں۔ آج وہ بڑی مایوسی کے عالم میں واپس لوٹا تھا۔ ٹرین نے اسے جب ریلوے اسٹیشن پر اتارا تب بھی اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا اور پھر وہ رات بھی اس نے بڑے دکھ کے عالم میں گزاری لیکن کسی طرف سے کوئی آہٹ نہ ملی، نہ کوئی اس سے مخاطب ہوا۔ ساری رات جاگتے ہوئے گزری تھی۔

دوسری صبح اسے بخار ہو گیا تھا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ ہفتے کے دن غیاث اللہ شاد پور آیا اور اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر کچھ کام شروع کرا دیا۔ یہ کام ایک خوبصورت مکان کی تعمیر تھا۔ غیاث اللہ کا یہ کام بڑی برق رفتاری سے شروع ہوا تھا، اس نے اب بار بار آنا شروع کر دیا تھا۔

کئی جمعراتیں گزر گئیں۔ ان دنوں بدرالدین نے محسوس کیا تھا کہ جمیلہ ایک بار بھی اس سے مخاطب نہیں ہوئی ہے۔ وہ زار و قطار رویا تھا لیکن اس کی آہ و زاری بھی بے مقصد رہی تھی۔ وہ رو رو کر کہتا تھا کہ جمیلہ! آخر کیا قصور ہو گیا ہے مجھ سے لیکن جواب نہیں ملتا تھا۔ ادھر غیاث اللہ کا کام تیزی سے جاری تھا اور شاد پور کے ایک خوبصورت حصے میں سبزی کے کھیتوں کے عین سامنے ایک حسین عمارت نمودار ہوگئی۔ غیاث اللہ نے یہ گھر بہت ہی خوبصورت بنوایا تھا۔

بدرالدین بڑی باقاعدگی سے گڑھی حیدر بیگ کے قبرستان جاتا تھا اور خاموشی سے وہاں بیٹھ کر چلا آتا تھا پھر اس جمعرات کو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کی قبر سے سر پھوڑ لیا اور بولا۔ ''اگر ناراضی کی وجہ نہیں بتاؤ گی جمیلہ تو کہیں جان دے دوں گا۔''

جواب میں جمیلہ کی ہنسی سنائی دی تھی۔ پھر اس کی آواز اس کے ذہن میں گونجی۔ ''تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔''

''سرپرائز، ایسا جو زندگی سے بیزار کر دے۔''

''صرف ایک بات کہوں گی، وقت تمہارے لئے جو کچھ کر رہا ہے، اس سے تمہیں سمجھوتہ کرنا ہے بدرالدین! میرے کہنے سے تم نے بہت کچھ کیا ہے، میں خوش ہوں، بہت زیادہ خوش لیکن اب جو کچھ ہوگا، وہ بھی یوں سمجھ لو کہ میری اولین خوشی ہوگی۔''

''کیا ہوگا، تم اتنے دن سے خاموش کیوں تھیں، مجھ سے کیا قصور ہوا تھا، مجھے بتاؤ؟''

''کہا نا کوئی قصور نہیں ہوا تھا، بس میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔''

''تو دو نا، کیا ہے وہ سرپرائز......؟''

''ابھی نہیں جناب! آپ آتے رہیئے اور اگر کوئی اور بھی آپ کے ساتھ آنا چاہے تو میں اس کا استقبال کروں گی اور یہی میری خوشی ہے۔''

''کوئی اور......؟''

جواب میں پھر بالکل پہلے جیسی ہنسی سنائی دی اور اس کے بعد جمیلہ کی کوئی آواز اس کے ذہن میں نہیں گونجی۔

ایک دن غیاث اللہ نے اسے اس نئے گھر کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ ''بدرالدین! یہ گھر میں نے تمہارے لئے بنوایا ہے، صرف تمہارے لئے۔''

''م...... میں، میں اس گھر کا کیا کروں گا؟''

''یہ تمہیں رحمت علی تانگے والا بتائے گا۔'' غیاث اللہ نے پراسرار لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

چوہدری وہ تصویر ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے امام دین کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور ڈیرے پر واپس آگیا پھر دوسرے دن چوہدری نے گڑھی حیدر بیگ سے واپسی کا فیصلہ کر لیا اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس شاد پور آگیا۔ حیدر علی واپس نہیں آیا تھا۔ آسیہ نے بہت سارے سوالات کر ڈالے کہ وہ کہاں گیا تھا۔

''بس تھوڑا سا زمینوں کو دیکھنا تھا، ہاریوں سے کچھ کام تھے۔''

آسیہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''اپنے دماغ پر اتنا زور نہ ڈالا کریں اباجی! اب یہ کام آپ کے کرنے کے نہیں ہیں۔'' پھر بولی۔ ''حیدر بھائی کی طرف سے بھی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔''

''بیٹا! سب کو زندگی پیاری ہوتی ہے، بھاگتے ہیں اب لوگ اس حویلی سے، میرے اپنے تو خیر ختم ہی ہوگئے، اللہ تم دونوں ہی کو سلامت رکھے، ہمارے اوپر سے یہ بلا ٹال دے، آسیہ......! نور دین کہاں ہے؟''

''باغ میں کھیل رہا ہے اباجی!''

''بیٹا! تم اسے اکیلے کھیلنے کے لئے چھوڑ دیتی ہو۔''

''تو کیا کروں اباجی! حویلی میں کوئی ایک خطرہ تو ہے نہیں پھر خطرہ تو ہمارے چاروں طرف منڈلا رہا ہے، کون کون سے خطرے کی پروا کریں۔''

چوہدری ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ جو کچھ دیکھ کر آیا تھا اور جو تصویر وہ ساتھ لے کر آیا تھا، وہ اس کے لئے بڑی دہشت کا باعث تھی۔ نجانے کیا کیا سوچیں اس کے ذہن کو گھیرے ہوئے تھیں۔ آسیہ کو ابھی اس بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا کہ نور دین بذات خود ایک بھیانک خطرہ ہے، ایک دشمن ہے جو اس کی آغوش میں پل رہا ہے۔ آسیہ کے ہاں اولاد نہیں تھی، بچے کے بارے میں تفصیلات اسے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھیں کہ بچہ ایک یتیم خانے سے لیا گیا ہے۔ یتیم خانے میں جا کر تحقیقات کرنا بے مقصد ہی تھا، وہ تصویر آگئی تھی جس میں نظام دین کے اہل خاندان کے تمام افراد موجود تھے اور بچہ بھی اسی میں تھا، نام بھی اس بچے کا نور دین ہی تھا لیکن چوہدری اب اس قدر دہشت زدہ نہیں ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی خوف کی انتہا بھی انسان کو بے خوف کر دیتی ہے۔ چنانچہ چوہدری کے دل پر اب اتنا زیادہ اثر نہیں تھا، جبکہ یہ بات اس کے ذہن میں تھی کہ یہ بچہ کوئی ذی روح نہیں ہے بلکہ ایک بدروح ہے۔

وہ سوچتا رہا تھا۔ اس نے وہ تصویر اپنے کمرے میں ایک ایسی جگہ کیل میں لٹکا دی جہاں سے وہ کسی ضرورت پر نمایاں نظر آجائے اور اس کے بعد وہ بچے کی تلاش میں نکل آیا۔ ایک راہداری میں اسے نور دین نظر آگیا تھا، وہ آسیہ کے کمرے سے نکل کر آیا تھا اور ٹہلنے والے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ چوہدری سردار علی نے اسے آواز دی۔ ''نور دین، نور دین! بات سنو۔''

بچہ رک کر چوہدری کی طرف پلٹا۔ چوہدری کو اس کی آنکھوں میں وہی کیفیت نظر آئی جو کسی شکار کو دیکھ کر شکاری کی آنکھوں میں ابھر آتی ہے۔ بچے کے انداز میں معصومیت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چوہدری کے قریب آگیا۔

''آؤ میرے کمرے میں آؤ، تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔'' چوہدری سردار علی نے کہا اور بچہ خاموشی سے اس کے ساتھ آگے بڑھ آیا۔ پھر وہ چوہدری کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ چوہدری نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ بچے کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور پھر خود بخود اس کی نظریں اس تصویر پر جا ٹکیں۔ وہ تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا پھر وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔ ''دادا جی، دادی جی، بابا جی، پھپھو جی، اماں جی......!''

اور پھر اس نے تصویر کی طرف ہاتھ بڑھائے لیکن تصویر اس کی پہنچ سے دور تھی۔ تین چار بار وہ اچھلا۔ چوہدری نے اس کے منہ سے نکلنے والی آوازیں سن لی تھیں۔ بچے نے اپنے پورے خاندان کو پہچان لیا تھا، وہ تصویر کو اتارنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تصویر اس کی پہنچ سے دور تھی۔ اچانک ہی اس کے دونوں ہاتھ لمبے ہونے لگے، اب اس کا چہرہ بالکل بدل گیا تھا، دوسرے لمحے اس نے تصویر اتار لی۔

''رہنے دے اسے، مجھے دے دے اور بگاڑ لے میرا، تجھ سے جو کچھ بگاڑا جا سکتا ہے، لا تصویر مجھے دے۔'' چوہدری کے اندر ایک دیوانگی بیدار ہوگئی تھی۔ وہ تصویر لینے کے لئے بچے کی جانب جھپٹا لیکن بچے نے اسے آرام سے جھکائی دی اور دروازے کے پاس پہنچ گیا پھر اس نے برق رفتاری سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

چوہدری حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ ''مجھے دے دے تصویر، مجھے دے دے، میں کہتا ہوں تصویر مجھے دے دے۔''

بچہ راہداری میں بھاگنے لگا۔ چوہدری اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا لیکن بچے کی رفتار چوہدری کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کافی دور نکل گیا اور پھر وہ ان سیڑھیوں کے پاس پہنچ گیا جو اوپر جاتی تھیں۔ چوہدری بری طرح ہانپ رہا تھا۔ آسیہ بھاگ دوڑ سن کر اپنے کمرے سے نکل آئی۔ چوہدری سامنے ہی موجود تھا اور بری طرح ہانپ رہا تھا۔

''ارے اباجی! کیا ہوا، خیریت، خیریت!''

''وہ مردود، وہ مردود تصویر لے گیا۔''

''کون اباجی! آپ آیئے میرے کمرے میں، آیئے آیئے نا، کیا حال ہو رہا ہے آپ کا، پسینے میں تر بتر ہو رہے ہیں، آیئے میرے ساتھ، میں پانی پلاتی ہوں آپ کو۔''

آسیہ زبردستی چوہدری کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے آئی لیکن اندر جو منظر تھا، اس نے چوہدری کی کیفیت کو اور خراب کر دیا۔ نور دین آرام سے اپنی مسہری پر سو رہا تھا۔ چوہدری کا سر بری طرح چکرانے لگا۔ دل تو یہ چاہا تھا کہ بھاگ کر نور دین کے سر پر پہنچ جائے، اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں جکڑ لے اور اتنی طاقت سے دبائے کہ اس کی آنکھیں اور زبان باہر نکل آئیں لیکن وہ یہ ہمت نہیں کر سکا اور بچے کو دیکھتا رہا۔

''کچھ بتائیں گے نہیں اباجی! بات کیا ہے آخر؟''

''بس خواب دیکھتا رہتا ہوں، ان خوابوں میں بری بری شکلیں نظر آتی ہیں مجھے، تم آرام کرو، غلطی ہوگئی مجھ سے، معافی چاہتا ہوں۔'' چوہدری نڈھال لہجے میں بولا۔

''ارے اباجی! کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ یہیں سو جایئے میرے کمرے میں، میں آپ کو دیکھتی رہوں گی پھر آپ کو خواب نہیں نظر آئیں گے، کیا خواب دیکھا تھا آپ نے؟''

''بس عجیب عجیب، انوکھے خواب!'' چوہدری سردار علی نے کہا۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ آسیہ کو اگر اس بارے میں بتاتا تو وہ خوف سے ہی مر جاتی۔ بچے کو بڑی چاہت سے اپنے ساتھ ساتھ لائی تھی۔ چوہدری کیا بتاتا اسے۔ تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔ ''چلتا ہوں آسیہ! معاف کرنا بیٹے تمہیں پریشان کیا۔''

''نہیں اباجی! ایسی کوئی بات نہیں ہے، پریشانی کیسی، آپ یہیں سو جایئے، میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔''

''نہیں بیٹے! تم آرام کرو۔'' چوہدری سردار علی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا پھر اس نے دوبارہ کمرے کے اندر جھانک کر پوچھا۔ ''دروازہ اندر سے بند کر لیتی ہو؟''

''نہیں اباجی! کھلا رہتا ہے دروازہ، کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟''

''ایسے ہی میرا مطلب ہے کہ اگر رات میں آنا چاہوں، تمہیں دیکھنے کے لئے!''

''میرا دروازہ کھلا رہے گا، آپ کا جب دل چاہے آجایئے گا، میں تو آپ سے اب بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ آپ یہیں آرام کریں تو اچھا ہوگا۔''

''نہیں بیٹا! تم لیٹو، آرام کرو۔'' چوہدری سردار علی نے کہا اور وہاں سے اپنے کمرے میں واپس آگیا لیکن وحشت عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ اب اس میں کوئی شک و شبہے کی بات نہیں رہی تھی کہ نور دین اسی خاندان کا بچہ تھا، اپنے شبہے کی تصدیق کے لئے ہی وہ گڑھی حیدر بیگ پہنچا تھا اور وہاں اسے وہ تصویر حاصل ہوگئی تھی جس میں نور دین موجود تھا اور پھر اس وقت جو واقعات پیش آئے تھے، وہ صاف اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ یہ بچہ ایک بدروح ہے جو لازمی طور پر کسی خاص ارادے سے یہاں آیا ہے، ہر چند کہ وہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا لیکن ایک روح کے لئے کوئی بھی کام کر لینا مشکل نہیں تھا۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

وہ اپنے بستر پر لیٹا سوچتا رہا اور پھر اس کے دل میں دہشت ابھر آئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

آسیہ جو کچھ بھی سوچے، وہ بعد میں دیکھا جائے گا، اس بچے سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے، میں اسے ہلاک کر دوں گا بلکہ یہ تو اچھا موقع ملا ہے مجھے، وہ نظام دین کا پوتا ہے اور نظام دین کے خاندان نے میرے بیٹے، بہو اور میری بیٹی کو ہلاک کیا ہے، میں انتقام لوں گا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک بار پھر باہر نکل آیا۔ ایک اور کمرے میں مختلف قسم کی چیزیں جو نوادرات میں سے تھیں، سجی ہوئی تھیں، ان میں تلوار، تبر اور قدیم ہتھیار دیوار پر آویزاں تھے۔ چوہدری سردار علی نے ایک تبر (کلہاڑی) اتار لیا۔

اس کی دھار دیکھی۔ مناسب چیز تھی۔ وہ تبر کو ہاتھ میں سنبھالے خطرناک ارادوں کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا اور اس کے بعد دبے پاؤں چلتا ہوا آسیہ کے کمرے پر پہنچ گیا۔ آسیہ نے یہاں بھی نور دین کا بستر الگ رکھا تھا اور خود دوسرے بستر پر سوتی تھی۔ بچہ بڑی معصومیت کے ساتھ اپنے بستر پر سو رہا تھا۔

چوہدری سردار علی نے تبر کو مضبوطی سے پکڑا اور دبے قدموں بچے کی مسہری کے پاس پہنچ گیا پھر اس نے دانت کچکچا کر تبر بلند کیا اور پوری قوت سے اسے بچے کی گردن پر مارا۔ بچے کی گردن اچھل کر مسہری سے نیچے جا پڑی تھی لیکن خون کا ایک قطرہ بھی اس سے نہ نکلا، البتہ کٹے ہوئے سر نے ایک انتہائی دہشت ناک چیخ ماری، اس کا دھڑ جلدی سے مسہری سے نیچے کود گیا پھر اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر اپنی گردن اٹھائی اور اسے اس کی جگہ جما لیا۔ ایک بار پھر اس نے دہشت ناک چیخ ماری تھی لیکن چوہدری سردار علی نے اس کے سینے پر تبر کا وار کیا۔

بچہ اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ چوہدری سردار علی اس پر پے در پے وار کرنے لگا اور بچہ اِدھر اُدھر اچھلتا رہا۔ آسیہ جاگ گئی تھی، دوسرے لمحے اس کے حلق سے دہشت ناک چیخ نکلی۔ ''اباجی......اباجی!''

وہ بے اختیار چوہدری سردار علی کی طرف دوڑی تو چوہدری سردار علی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''یہ نور دین ہے آسیہ! پیچھے ہٹ جا، ختم کر دوں گا اسے میں، یہ نظام دین کا پوتا ہے، تو پیچھے ہٹ جا۔'' تبر کے وار مسلسل ہوتے رہے اور بچہ ان سے بچتا رہا۔ آسیہ پھرتی سے آگے بڑھی، اس نے پیچھے سے چوہدری سردار علی کو پکڑ لیا اور چیخی۔ ''آپ کو خدا کا واسطہ اباجی! ایسا آپ کیا کر رہے ہیں، چھوڑ دیجئے اسے، ہٹ جایئے پیچھے۔''

اگر وہ یہ منظر دیکھ لیتی کہ بچے کی گردن کس طرح کٹ کر دور جا گری تھی اور اس نے اسے اٹھا کر دوبارہ اپنی جگہ جما لیا تھا تو پتہ نہیں اس کا کیا حال ہوتا اور اب کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ گردن اس کے بدن سے جدا ہوئی تھی۔ اگر آسیہ کی مداخلت نہ ہوتی تو شاید اور بھی کھیل سامنے آتے لیکن آسیہ نے بری طرح چوہدری کو پکڑ لیا تھا۔

''چھوڑ دے مجھے، تجھے خدا کا واسطہ آسیہ! مارنے دے اسے مجھے، یہ نظام دین کا پوتا ہے۔''

''اباجی! آپ ہٹ جایئے، پیچھے ہٹ جایئے۔'' آسیہ نے زور سے چوہدری سردار علی کو گھسیٹا تو چوہدری سردار علی چونک پڑا۔ اس نے آسیہ کو دیکھا پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مارنے دے اسے مجھے آسیہ! دیکھ مجھے مارنے دے اسے، چھوڑ دے مجھے۔'' چوہدری سردار علی نے ایک زوردار دھکا آسیہ کو دیا اور آسیہ گرتے گرتے بچی۔

چوہدری سردار علی آزاد ہوگیا تھا لیکن اسی دوران بچہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ چوہدری سردار علی باہر بھاگا اور آسیہ اس کے پیچھے دوڑی۔

چوہدری سردار علی نے دیکھا کہ بچہ سامنے راہداری میں بھاگ رہا ہے، پھر وہ چوہدری سردار علی کے کمرے میں گھس گیا اور چوہدری سردار علی اس کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں آگیا۔ اِدھر آسیہ بھی آگئی تھی لیکن بچہ کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

چوہدری سردار علی نے چاروں طرف دیکھا اور پھر اس مسہری کے نیچے جھانکنے لگا جس پر وہ سوتا تھا۔ بچہ یہاں بھی موجود نہیں تھا، کمرے میں اور کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ چھپتا۔ آسیہ نے بھی دیکھ لیا تھا اور چوہدری سردار علی نے بھی...... آسیہ کو جب یہ اطمینان ہوگیا کہ نور دین کمرے میں نہیں ہے تو کچھ سوچ کر وہ باہر نکلی اور اس نے پھرتی سے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

اسے اندازہ تھا کہ چوہدری سردار علی پر اس وقت جنون سوار ہے، غالباً کسی خواب کے زیر اثر وہ اس کیفیت کا شکار ہوگیا ہے۔

چوہدری سردار علی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ''دروازہ کھول دے آسیہ! کھول دے بیٹا، میں تجھے بتاؤں گا کہ حقیقت کیا ہے، اس کا نام نور دین ہے، وہ نظام دین کا پوتا ہے، وہ ضرور یہاں کسی برے ارادے سے داخل ہوا ہے، کھول دے دروازہ بیٹا، آج میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔''

آسیہ کمرے کے دروازے کے پاس سے ہٹ آئی تھی۔ ملازم کافی دور اپنے کوارٹر میں سو رہے تھے، اس لئے انہیں اندر کے ہنگامے کا کچھ علم نہیں تھا۔ آسیہ باہر نکل کر چاروں طرف دیکھنے لگی اور پھر تھوڑے فاصلے پر اپنے کمرے کے دروازے پر اسے نور دین نظر آیا۔ وہ بچوں کی طرح بسور رہا تھا۔ آسیہ حالانکہ خود بھی نور دین کے اندر کچھ اجنبی باتیں محسوس کر چکی تھی لیکن نجانے کیوں اس وقت اس کے دل میں ممتا ابھر آئی۔ وہ آگے بڑھی اور اس کے پاس پہنچ گئی۔ نور دین منہ بسور بسور کر رو رہا تھا۔

''مما......! نو مجھے مار رہے تھے، وہ مجھے مار رہے تھے مما!''

''آؤ میرے ساتھ اندر آجاؤ۔'' آسیہ نے کہا اور دروازہ کھول کر نور دین کو ساتھ لئے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔

نور دین نے کہا۔ ''مما! دلوازہ بند کللو، نو پھل آجائیں دے۔''

''وہ نہیں آئیں گے بیٹا! میں نے انہیں بند کر دیا ہے۔'' آسیہ نے کہا۔ لیکن اچانک ہی نور دین نے خود پلٹ کر دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ یہ چٹخنی کافی اونچی تھی۔ آسیہ نے نور دین کے دونوں ہاتھ لمبے ہوتے ہوئے دیکھے تھے اور اس کے حلق سے پھر ایک دہشت ناک چیخ نکل گئی تھی۔ نور دین واپس پلٹا تو اس کا چہرہ بھی بدلا ہوا تھا، آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی ہوگئی تھیں، دانت باہر نکل آئے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ تھی۔

''میلا نام نول دین ہی ہے، میں احمد دین کا بیٹا ہوں، دادو نے مجھے تمہالے پاس بھیجا تھا، مجھے تمہالے پاس آنا ہی تھا۔''

آسیہ کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ وہ بری طرح پیچھے کی طرف بھاگی لیکن کمرے میں اس دروازے کے سوا اور کوئی دروازہ نہیں تھا۔ وہ دروازے سے ٹک کر کھڑی ہوگئی۔

نور دین بھیانک انداز میں ہنس رہا تھا۔ ''میں تمہیں مال ڈالوں دا، مجھے دادو نے تمالے پاس بھیجا ہے۔''

وہ ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا اور آسیہ دہشت ناک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اچانک ہی نور دین فضا میں اچھلا اور اس پر جا پڑا۔ آسیہ نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن نور دین نے اپنے دونوں لمبے دانت جو باہر نکلے ہوئے تھے، آسیہ کے نرخرے میں پیوست کر دیئے۔ آسیہ چیخیں مار رہی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اسے اپنے آپ سے دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کو آجاتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ نڈھال ہوگئی۔ نور دین اب بھی اس سے جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا اور اس کا خون چوس رہا تھا۔ آسیہ کے پورے بدن میں تھرتھری دوڑ رہی تھی لیکن نور دین کو وہ ہٹا نہیں پا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا بدن ساکت ہوگیا، آنکھیں کھلی رہ گئیں، تھوڑی دیر کے بعد نور دین اس کی گردن سے جدا ہوا پھر اس نے کہا۔ ''آجاؤں دوڈو......؟''

''آجاؤ بیٹا!'' کہیں سے نظام دین کی آواز ابھری اور بچہ دروازے کی جانب بڑھ گیا پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

بڑا تجسس تھا۔ بدرالدین کو، وہ رحمت علی سے ملا تو رحمت علی اسے بہت خوش نظر آیا۔

''میں خود تمہارے پاس آنے والا تھا بیٹا! اب تمہارے دل میں چاہے کوئی بھی بات ہو لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ صرف میں ہی نہیں ریلوے اسٹیشن پر چلنے والے قلی ہیں، سب تم پر جان نچھاور کرتے ہیں اور تمہیں ملنے والی ہر خوشی سے خوش ہوتے ہیں بیٹا! غیاث اللہ نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ تمہیں اپنا داماد بنانا چاہتا ہے، ویسے تو کئی بیٹیاں ہیں، اس کی لیکن وہ اپنی بیٹی سعدیہ کے لئے تمہارا رشتہ چاہتا ہے، میں نے بھی اس بچی کو دیکھا تھا، آئے تھے یہ لوگ ایک دن، میں نے ہی انہیں اپنے تانگے میں بٹھایا تھا، جمعرات تھی، تم گئے ہوئے تھے، تو بیٹا! خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے، تم پڑھے لکھے ہو، میری تو رائے ہے کہ غیاث اللہ کی پیشکش قبول کر لو۔''

''رحمت بابا آپ، یہ کیا کہہ رہے ہیں، میری زندگی میں ایسی باتوں کا کوئی دخل نہیں ہے، میری ماں اس دنیا میں نہیں ہے، زندگی میرے لئے ایک بے مقصد چیز ہے، بس سمجھ لیجئے گزار رہا ہوں، آپ غیاث اللہ صاحب کو منع کر دیجئے۔''

رحمت علی نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''نہیں بیٹا! میں اسے منع نہیں کروں گا، یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں رحمت بابا میں، میں......!''

بدرالدین کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس سے رہا نہ گیا۔ کچھ ایسی بے چینی سوار ہوئی اس پر کہ وہ جمعرات سے پہلے ہی بستی گڑھی حیدر بیگ پہنچ گیا اور قبرستان میں جا کر بیٹھ گیا۔ پورا دن وہیں گزارا تھا، مغرب کے بعد اس نے درد بھری آواز میں جمیلہ کو پکارا۔

''جمیلہ! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، سوچو گی تو سہی کہ ایک گھٹیا انسان تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے، تم دنیا سے جا چکی ہو، میں بھی تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں، تم کہتی ہو میں جیوں، سو میں تمہارے کہنے سے جی رہا ہوں لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں نے زندگی کی خوشیاں اپنا لی ہیں، میری خوشیاں تو تمہارے وجود کے ساتھ ساتھ ہیں، جمیلہ! جس طرح تم دنیا سے روپوش ہو، میں بھی دنیا سے روپوش ہو جانا چاہتا ہوں تاکہ تم تک پہنچ جاؤں، یہ سب کچھ غلط ہے، مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

اور اس بار جو آواز اس کے کانوں میں ابھری تھی، اس نے اسے انگشت بدنداں کر دیا۔ یہ آواز اس کے ذہن میں نہیں، اس کے کانوں میں گونجی تھی۔ اس آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا، ایک پختگی تھی۔

''بدرالدین......! آج میں تمہاری محبت کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی ہوں، سنو گے میری بات؟''

بدرالدین کے پورے بدن پر تھرتھری طاری ہوگئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جمیلہ اور اس کے اہل خاندان اس کے اردگرد موجود ہوں، وہ چشم تصور سے انہیں دیکھ رہا تھا، ان لوگوں کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن آج اس کے سامنے ان سب کے نقوش تھے۔ جمیلہ کی آواز ابھری۔

''اور یہ بات صرف میں تنہا نہیں بلکہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ کہہ رہی ہوں، سنو تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میں بھی اعتراف کرتی ہوں کہ میری روح میں تمہارے لئے بہت بڑی جگہ ہے، میں نے اور ان سب نے یہ محسوس کیا ہے کہ تم جیسے محبت کرنے والے کے لئے ہی دعائیں مانگی جا سکتی ہیں، سنو میری محبت کا جواب اس شکل میں دو کہ غیاث اللہ کی بیٹی سے شادی کر لو، اسے مکمل اعتماد اور محبت دو اپنی، تم سمجھ لو کہ وہ میرا زندہ عکس ہے تمہارے لئے بدرالدین! انسان بہت سے دعوے کرتا ہے لیکن ان دعوؤں کی تکمیل ہی انسان کی شخصیت کی تکمیل کرتی ہے، میں بڑے اعتماد سے تم سے کچھ مانگ رہی ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ جو مانگ رہی ہوں، مجھے دو گے، اب آئندہ میں تم سے اسی وقت مخاطب ہوں گی جب تم میری اس خواہش کی تکمیل کر دو گے، تم یہ سوال ضرور کرو گے کہ آخر میں ایسا کیوں چاہتی ہوں تو اس کا جواب بھی میں ابھی دیئے دیتی ہوں، یہ میری محبت کی مانگ ہے، میں چاہتی ہوں کہ جو مجھے چاہتا ہے اور میں جسے چاہتی ہوں، اسے زندگی ملے، سکون ملے، خوشیاں ملیں، میں اگر زندہ ہوتی تو کیا تم میرے لئے یہ سب کچھ نہ چاہتے لیکن یہ ایک روح کی مانگ ہے، باقی تمہاری مرضی ہے کہ اسے پورا کر دیا نہ کرو، اب میں خاموش ہوئی جاتی ہوں۔'' پھر جمیلہ کی آواز بند ہوگئی۔

بدرالدین پرسکون نگاہوں سے اس کی قبر کو دیکھتا رہا، پھر اس نے مدھم سی آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے جمیلہ۔''

اور اس کا یہ اعتراف غیاث اللہ تک پہنچ گیا۔ قلیوں نے بڑی خوشیاں منائی تھیں، رحمت علی بابا خوشی سے ناچا تھا۔ غیاث اللہ نے تیاریاں شروع کر دیں۔ جو گھر اس نے بدرالدین کے لیے بنایا تھا اس کی بھرپور سجاوٹ کر دی گئی۔ ضرورت کی ہر شئے اس میں پہنچا دی گئی۔ یہیں اس شادی کا اہتمام کیا گیا۔

قلیوں نے بے پناہ خوشیاں منائی تھیں اور خوب ہنگامے کئے تھے۔ آخر کار بارات تیار ہوئی اور غیاث اللہ کے گھر پہنچ گئی۔ بستی کے لاتعداد افراد اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔ بہت ہی خوشیوں بھری شادی تھی۔

بدرالدین نے کسی خاص کیفیت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن جب اس کے قدم حجلہ عروسی کی جانب بڑھے تو اچانک ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اسے وہی جانی پہچانی خوشبو محسوس ہوئی جو جمیلہ کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔

پھر جمیلہ کی سرگوشی اس کے کانوں میں ابھری۔ ''اور میں نے تم سے کسی سرپرائز کا ذکر کیا تھا۔ جاؤ اپنی دلہن کے سامنے جاؤ تمہیں سرپرائز ملے گا۔''

اور یہ سرپرائز واقعی بدرالدین کے لیے اس کائنات میں سب سے بڑا تحفہ تھا۔ اس نے سعدیہ کو دیکھا، سعدیہ اس انداز میں جھکی ہوئی تھی کہ بدرالدین کو صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور یہ آنکھیں انہیں دیکھ کر بدرالدین نیم دیوانہ ہوگیا۔ یہ جمیلہ کی آنکھیں تھیں۔ جب کہ باقی چہرہ جمیلہ کا نہیں تھا۔ سعدیہ کی آنکھیں ہو بہو جمیلہ کی آنکھوں کا عکس تھیں۔ یہ وہ آنکھیں تھیں جو اس نے پہلی بار رات کے تین بجے ریلوے اسٹیشن پر نقاب سے جھانکتی ہوئی دیکھی تھیں اور انہی آنکھوں کا وہ دیوانہ ہوگیا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس ابھرا اور پھر اس کے کانوں میں جمیلہ کی آواز ابھری۔

''کیوں ہے نا سرپرائز؟''

☆......☆......☆

امام دین وہ واحد ملازم تھا جس نے چوہدری سردار علی کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ چوہدری سردار علی کے سینے پر آخری زخم حیدر علی کا لگا تھا۔ باپ بیٹے اس عظیم الشان حویلی میں دیوانوں کے سے انداز میں رہتے تھے۔ ہفتوں گزر جاتے اور وہ ایک دوسرے سے بات نہ کرتے لیکن چوہدری سردار علی اکثر راتوں کو حویلی کے مختلف گوشوں میں چیخ چیخ کر آوازیں لگاتا رہتا۔ ''صفدر علی، نور جہاں، آسیہ، فردوس، فیروزہ، ارے کہاں چلے گئے تم سب کے سب۔''

''حویلی کے پاس سے گزرنے والے یہ آوازیں سن کر کانپ جاتے تھے۔ پھر ایک دن حیدر علی کی لاش بھی اس کے کمرے سے برآمد ہوئی۔ گردن کٹی ہوئی تھی مگر خون کا ایک قطرہ بھی آس پاس نہیں تھا، امام دین نے ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے بتایا کہ جب اس نے صبح کی چائے حیدر علی کے کمرے میں پہنچانے کے لیے دروازہ کھولا تو سردار علی، حیدر علی کی لاش گود میں لئے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں دروازے کو گھور رہی تھیں، چائے کے برتن امام دین کے ہاتھ سے گر گئے مگر چوہدری اسی طرح بیٹھا رہا۔ بمشکل تمام محلے داروں نے چوہدری کو وہاں سے ہٹایا تھا۔

پھر کچھ عرصے کے بعد ایک دن امام دین نے ہی لوگوں کو بتایا کہ پچھلی رات حویلی میں خوب رونق ہوگئی تھی۔ بڑے ہال میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے حیران ہو کر اندر جھانکا تو وہاں اسے نظام دین کا پورا خاندان نظر آیا۔ نظام دین، اس کا بیٹا احمد دین، بیوی شریفاں، بہو حسنہ، بیٹی جمیلہ وغیرہ۔ سامنے چوہدری سردار علی سر جھکائے مجرموں کی طرح بیٹھا تھا۔

پھر نظام دین نے اچانک چوہدری سردار علی کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف لے چلا۔

امام دین وہیں گر کر بے ہوش ہوگیا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو اس نے پوری حویلی چھان ماری مگر کوئی نہ ملا۔

ہاں کچھ دن کے بعد گڑھی حیدر بیگ میں نظام دین کی بنجر زمینوں سے چوہدری سردار علی کی تعفن زدہ لاش ضرور ملی تھی جو ناگ پھنی کے کانٹوں بھری جھاڑیوں میں بڑے بھیانک انداز میں پھنسی ہوئی تھی۔

(ختم شد)